



تذکرۃ العطاء

تذکرۃ العطاء

حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ

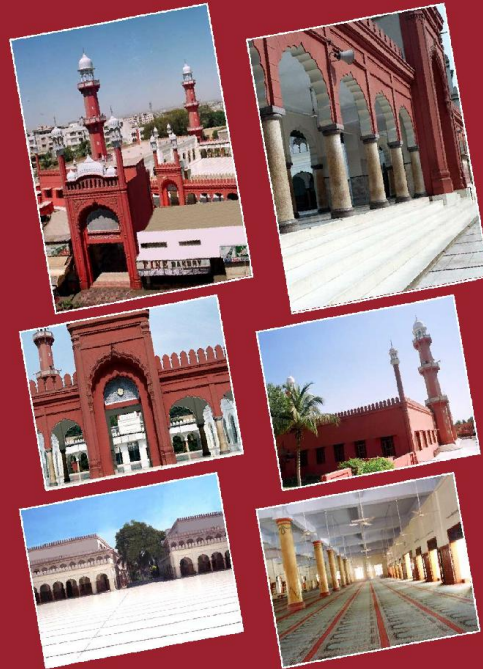


تذکرہ وسوانح
حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ
استاذ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
جامعہ العلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مترجمین
مولانا سید محمد زین العابدین
فاضل جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

زمزم پبلشرز

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد رفیع بنوری ٹاؤن کراچی



زمزم پبلشرز
Email: aboolalia78@gmail.com
www.zamzampublishers.com



جامعہ العلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے مرکزی دروازہ کا ایک منظر



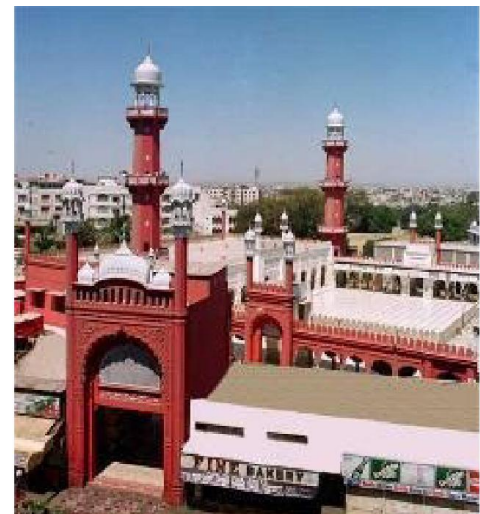
جامع مسجد بنوری ٹاؤن کا ایک منظر



جامع مسجد بنوری ٹاؤن کا ایک منظر



شہداء کی امن درس گاہ، جامعہ العلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن



حضرت بنوری ٹاؤن، جامعہ العلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن

من مات فی السفر أو حرق فی النار فهو شهید
جو سفر میں یا آگ میں جل کر فوت ہو جائے وہ بھی شہید ہے (مفہوم حدیث)

تذکرۃ العطاء

تذکرہ وسوانح

حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید نور اللہ مرقدہ

مرتب

مولانا سید محمد زین العابدین
فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

ناشر
زمزم پبلشرز
اردو بازار آرام باغ کراچی

﴿جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں﴾

نام کتاب..... تذکرۃ العطاء
مرتب..... مولانا سید محمد زین العابدین
صفحات..... ۵۰۶
سن اشاعت..... محرم ۱۴۳۴ھ مطابق دسمبر ۲۰۱۲ء
ناشر..... زمزم پبلشرز، کراچی
کتابت و تزئین..... محمد زین العابدین
باہتمام..... مولانا محمد رفیق بن عبدالمجید زمزمی
تعداد..... ۱۱۰۰/
قیمت..... ۲۰۰/
ملنے کے پتے..... زمزم پبلشرز، اردو بازار آرام باغ کراچی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱	ابتدائیہ	محمد زین العابدین	۷
۲	مشاہدات و تاثرات	حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم	۱۰
۳	مولانا عطاء الرحمنؒ ایک عظیم انسان	حضرت مولانا خالد خلیل نعمانی صاحب	۱۱
۴	آہ.... مولانا عطاء الرحمن صاحب	حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب	۱۲
۵	مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت	حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب	۱۴
۶	شیخ عطاء شہید رحمہ اللہ	حضرت مولانا فضل محمد یوسف زئی صاحب	۱۵
۷	آہ.... عزیز القدر مولانا عطاء الرحمنؒ	حضرت مولانا محمد زرولی خان صاحب	۱۸
۸	سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں!	حضرت مولانا محمد ازہر صاحب	۱۹
۹	مولانا عطاء الرحمنؒ کا سانحہ ارتحال	حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب	۲۰
۱۰	صبح وصال تا شب ہجر	حضرت مولانا امداد اللہ صاحب	۲۱
۱۱	سانحہ فاجعہ..... لمحہ بہ لمحہ صورتحال	حضرت مولانا انعام اللہ صاحب	۲۳
۱۲	شہیدؒ کے والد گرامی تسلیم و رضاء کے پیکر مجسم	حضرت مولانا انعام اللہ صاحب	۲۳
۱۳	ہمہ یاران، بہشت	حضرت مولانا مفتی مزمل حسین کا پڑیا صاحب	۲۶
۱۴	جامعہ کے ناظم تعلیمات	حضرت مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب	۲۷
۱۵	کچھ یادیں، کچھ باتیں	مولانا ولی خان المظفر	۲۹
۱۶	وہ اس دور کے آدمی نہیں تھے!	قاری محمد عثمان	۵۳
۱۷	جنت کے مسافر	مولانا عبدالحق عثمانی	۵۶
۱۸	ہمارے بزرگ دوست	مولانا زبیر احمد صدیقی	۵۷
۱۹	چند یادیں	مولانا محمد اشفاق جلال پوری	۵۸
۲۰	ایک گویا ہر نایاب انسان	مولانا راشد الحق سمیع حقانی	۵۹
۲۱	ذہنوں میں ہمیشہ رہیں گے وہ	مولانا مفتی عبدالرحمن مدنی	۶۰
۲۲	شیخ عطاء شہیدؒ کی چند وہبی و کسبی نمایاں خوبیاں	مولانا مفتی رفیق احمد بالا کوٹی	۶۱
۲۳	آہ.... مشفق استادؒ	مولانا حافظ محمد طیب لدھیانوی	۶۲
۲۴	عجب قیامت کا حادثہ ہے	مولانا محمد شفیع چترالی	۶۴
۲۵	ایک سانحہ ایک المیہ	مولانا محمد اسماعیل ربیعان	۶۶
۲۶	آہ..... استاد گرامی	مولانا سید عدنان کا کاخیل	۶۷
۲۷	تیار	مولانا طلحہ السیف	۶۸
۲۸	فضائی حادثہ میں چند اہل علم کی رحلت	مولانا عبدالقدوس محمدی	۶۹

۲۹	اے موت تجھے موت ہی آئی ہوتی	مولانا مفتی عبدالمعظم فائز	۷۰
۳۰	حادثاتی رحلت	مولانا مفتی شکیل احمد	۷۱
۳۱	روشن ستارہ	مولانا مفتی شاہ فیصل برکی	۷۲
۳۲	حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت	الحاج عبداللطیف طاہر	۷۳
۳۳	مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے	پروفیسر جناب احمد خان	۷۵
۳۴	دل بہت اداس ہے	محمد فاروق قریشی	۷۶
۳۵	رحمتوں کے اٹھتے سائے	حسین الرحمن	۷۷
۳۶	آنسو ہیں کہ آنکھ سے اب تک ٹوٹ رہے ہیں	سید حسن اللہ ہماء	۷۸
۳۷	جامعہ بنوری ٹاؤن کا وفادار فرزند	محمد خالد شریف	۷۹
۳۸	معاملات کی صفائی	حضرت مولانا امداد اللہ صاحب	۸۰
۳۹	کچھ یادیں، کچھ باتیں	مولانا محمد عمران ولی	۸۰
۴۰	استاد محترمؒ کی چند حسین یادیں	مولانا اکرام اللہ خان	۸۵
۴۱	ماپدر گم کردہ ام	مولانا مفتی طلحہ منیر	۸۷
۴۲	بہار آخر شد	مولانا مفتی محمد قاسم عباسی	۹۳
۴۳	طلباء پر مشفق و مہربان	مولانا محمد آصف	۹۵
۴۴	جامعہ بنوری ٹاؤن کا فیض	مولانا مفتی راشد ابوبکر	۹۶
۴۵	حضرت شہیدؒ، ایک شخص، ایک انجمن	مولانا مفتی محمد یاسر عبداللہ	۹۹
۴۶	شیخ عطاء کے اوصاف حمیدہ	مولانا طیب زمان	۱۰۱
۴۷	آہ.... کا روان بنوری کے حدی خواں	محمد زین العابدین	۱۰۲
۴۸	رفتی واز رفتن تو عالمے تاریک شد	مولانا عزیز احمد یوسف زئی	۱۰۴
۴۹	ای غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل	مولانا ولی اللہ چترالی	۱۰۵
۵۰	علم و عمل کا بحر بیکراں	مولوی محمد اسد اللہ غالب ملتانی	۱۰۷
۵۱	تشکر و امتنان	حضرت مولانا امداد اللہ صاحب	۱۰۸
۵۲	تشکر و امتنان	حضرت مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب	۱۰۹
	سوانح:		
۵۳	حیات مستعار کی ایک جھلک	حضرت مولانا مفتی خالد محمود صاحب	۱۱۰
۵۴	مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کا سوانحی خاکہ	مولانا مفتی رفیق احمد بالاکوٹی	۱۱۷
۵۵	حیات شہیدؒ اک نظر میں	محمد زین العابدین	۱۲۱
۵۶	استاد محترمؒ کی مختصر سوانح	مولانا مفتی محمد شعیب حقانی	۱۲۴
۵۷	عادات و خصائل	مولانا محمد کامران اجمل	۱۲۶

۵۸	حضرت عطاء شہیدؒ کا تحقیقی ذوق	مولانا مفتی محمد عمران ممتاز	۱۳۴
۵۹	مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ حیات و خدمات	حضرت مولانا انعام اللہ صاحب	۱۳۶
	حصہ عربی:		
۶۰	الشیخ عطاء الرحمنؒ	الشیخ المفتی محمد یاسر عبد اللہ	۱۴۰
۶۱	عبرات حزن	الشیخ رزین شاہ	۱۴۴
۶۲	لمسة وفات مسطرة في قصيدة رثاء	الشیخ نعیم اللہ	۱۴۵
۶۳	رسالة العزاء (سعودی توصیٰ کا تعریبی خط)	الشیخ محمد فخر الاسلام المدنی	۱۴۶
۶۴	ترجمہ	الشیخ عبد الرحمن الفاروق	۱۴۶
	ملفوظات:		
۶۵	حضرت شہیدؒ کے ملفوظات	مولانا محمد سفیان بلند	۱۴۷
۶۶	اکابرین کے ملفوظات بروایت حضرت شہید	مولانا محمد سفیان بلند	۱۵۴
۶۷	حضرت شہیدؒ کے فرمودہ اشعار	مولانا محمد سفیان بلند	۱۵۸
۶۸	توارخ وفات:	حضرت مولانا ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی صاحب	۱۶۱
	منظوم خراج عقیدت:		
۶۹	درد دل کی داستاں	مولانا محمد عیاض عابد	۱۶۲
۷۰	پھرا جڑا ہے آشیانہ	محمد یاسر سلطان	۱۶۲
۷۱	کیسے بھولیں اے عطاء!	مولانا رزین شاہ صاحب	۱۶۲
۷۲	گلشن بنوری کے ایک اور جانباز	مولوی سید الابرار سعید چترالی	۱۶۲
۷۳	ایسے رخصت ہو گئے دنیا سے مولانا عطاءؒ	مولانا محمد ہمایوں مغل حسن	۱۶۳
۷۴	قیمتی انسان	غلام اللہ چوہان	۱۶۳
۷۵	مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ	مولانا محمد اسامہ سرسری	۱۶۳
۷۶	علم کے مہتاب	مولانا رضوان احمد جاذب	۱۶۳
۷۷	مردِ اکِ شیخ مولانا عطاء الرحمنؒ گیا	مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی	۱۶۴
۷۸	قلب حزین	مولانا مفتی محمد خالد عباسی	۱۶۴
۷۹	اخبارات و مجلات کی نظر میں:	محمد زین العابدین	۱۶۵
۸۰	عالمگیر خراج عقیدت:	محمد زین العابدین	۱۷۱
۸۱	شہید راہ وفا:		
۸۲	مجسم وفا	مولانا سہیل یوسف میمن	۱۷۳
۸۳	مولانا مفتی عرفان حمید میمن شہیدؒ	محمد زین العابدین	۱۷۵

ابتدائیہ

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى!

دین اسلام ایک کامل اور مکمل دین ہے جو قیامت تک باقی رہے گا اس کی بقاء کے لیے سبب کے طور پر ہر دور میں اللہ جل شانہ اپنے بندوں کا انتخاب فرماتے ہیں جن لوگوں کو دینی خدمت کے لیے چن لیا جاتا ہے یہ بلاشبہ ان لوگوں کی خوش قسمتی ہوتی ہے۔

چنانچہ باری تعالیٰ کے برگزیدہ و چندہ پیغمبر حضور ﷺ کو اسی مقصد کے لئے اس دنیا میں بھیجا گیا اور پھر ان کا ساتھ دینے والے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ہر طرح کی قربانیاں دے کر دین اسلام کو امت تک پہنچایا، بعد ازاں تابعینؒ، تبع تابعینؒ، بزرگان دین اور ہر دور کے اکابرین نے طرح طرح کی مشقتیں، مجاہدے، اذیتیں، پریشانیاں، مصائب و مشکلات جھیل کر دین اسلام کو محفوظ کیا آخر میں علمائے دیوبند کا دور آیا ان حضرات نے بھی اپنی جان پر کھیل کر دین اسلام کی حفاظت کی دین کے ہر شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دیں اور پھر بالخصوص اس دور میں اکابرین دیوبند کے بعد اکابرین بنوری ٹاؤن نے جو جو ہمہ جہتی خدمات انجام دی ہیں وہ بے مثال ہیں چنانچہ حضرت بنوریؒ، مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ، مفتی ولی حسن خان ٹوکنیؒ، مفتی احمد الرحمنؒ، مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ، مفتی عبدالسمیعؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، مفتی ڈاکٹر نظام الدین شامزئیؒ، مفتی محمد جمیل خانؒ، مولانا سعید احمد جلاپوریؒ، مولانا محمد امین اور کزنؒ، اور مولانا عطاء الرحمنؒ وغیرہم حضرات نے دین کے ہر شعبہ میں وہ نمایاں اور ہمہ جہتی خدمات انجام دی ہیں جس کی ایک دنیا معترف ہے۔

جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کو اخلاص وللہیت کا منبع، تقویٰ و پرہیزگاری کا مرکز، علم و عمل اور عشق رسول ﷺ و صحابہؓ کی منہ بولتی اور جیتی جاگتی تصویر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، یہیں کے علماء، طلباء اور فضلا نے ہر دینی تحریک میں صفِ اوّل کے سپاہی کا کردار ادا کیا، یہ ادارہ ہمیشہ دین کے تحفظ کا مرکز رہا، ختم نبوت کی تحریک کی قیادت اس ادارے کے بانی نے کی، تحریک تحفظ ناموس صحابہؓ کی قیادت و سیادت یہاں کے فضلاء نے کی، میدان جہاد و تبلیغ میں یہاں کے فضلاء و اساتذہ نظر آئے، یہی ملت اسلامیہ کے وہ افراد ہیں جنہوں نے اپنی بے مائیگی، کسمپرسی اور مادی بد حالی کو خدمت دین کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں سمجھا یہی وہ لوگ ہیں جن کے پاس توکل علی اللہ کے علاوہ کوئی سہارا نہیں، یہی وہ سرپہرا گروہ ہے جنہوں نے بیخ بستہ ہواؤں میں اذان صبح کا بباگ دہل اعلان کیا، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے احقاقِ حق کے لئے کسی ملامت کی پرواہ اور کسی مصلحت کی چادر کو اوڑھنا گوارا نہیں کیا اور ابطالِ باطل کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا، قید و بند کی صعوبتیں ہوں یا خون جگر پیش کرنے کا نذرانہ، جان و مال کی قربانی ہو یا منصب و وقار کا ایثار، ان تمام میدانوں میں جامعہ کے فرزندان صفِ اوّل میں دکھائی دیے، جامعہ نے دنیا بھر کے مسلم اور غیر مسلم ممالک کے ہزاروں طلباء کو ایسی علمی سیرابی عطا کی کہ آج ان ظلمت کدو میں علم کی سیرابی کا نور چمک رہا ہے اور علم نبوت ابر رحمت کی طرح دنیائے عالم کو سیراب کر رہا ہے، توکل خداوندی اور للہیت کی بنیاد پر قائم ہونے والا یہ ادارہ باوجود تمام تر طوفانی تھپیڑوں، باطل کے مذموم پروپیگنڈوں اور سازشوں کے خدائی مہربانی اور اخلاص کی قوت کی بدولت ہر طوفان کو نہ صرف سہہ رہا ہے بلکہ دفاع اسلام کا فریضہ ادا کرتے ہوئے امت مسلمہ کی صحیح رہنمائی کا حق بھی ادا کر رہا ہے، اور جامعہ علوم اسلامیہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کی ایک یونیورسٹی ہے بلکہ انسان سازی کا عالمی ادارہ ہے، بلکہ درحقیقت ایک تحریک کا نام ہے، جس کی دینی، علمی، اصلاحی، اور تبلیغی خدمات کے علاوہ سماجی اور رفاہی خدمات کی بھی دنیا معترف ہے، حقیقت یہ ہے کہ جامعہ بنوری ٹاؤن نے رجال سازی میں دارالعلوم دیوبند کی یاد تازہ کر دی ہے چنانچہ جس میدان میں دیکھیں وہاں جامعہ کے فیض یافتہ نظر آئیں گے تحفظ ختم نبوت، تحفظ ناموس صحابہؓ، تبلیغ، جہاد، تصنیف و تالیف، تدریس و خانقاہ، فقہ و فتویٰ غرض ہر محاذ پر جامعہ کے فیض یافتہ قربانیاں، مشقتیں، مجاہدے برداشت کرتے ہوئے اور امت کی راہنمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جامعہ علوم اسلامیہ آج بھی باطل کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے اسی حق گوئی و بے باکی اور ہمہ جہتی خدمات کی پاداش میں ہمارے متعدد اکابر کو شہید بھی کیا گیا۔ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ، مفتی عبدالسمیعؒ، صاحبزادہ مولوی سید محمد بنوریؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، مفتی ڈاکٹر نظام الدین شامزئیؒ، مفتی محمد جمیل خانؒ، مولانا سعید احمد جلاپوریؒ، مولانا محمد امین اور کزنؒ، مفتی سعید احمد مردائیؒ، مولانا انعام اللہؒ، مولانا ارشاد اللہ عباسیؒ انہی شہداء میں شامل ہیں ان جامعہ کے فرزندان کی ہر شعبہ میں خدمات کے ساتھ ساتھ قربانیاں بھی بے مثال ہیں، آج تک پاکستان بالخصوص کراچی میں جتنے علماء کو بھی شہید کیا گیا وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ بنوری ٹاؤن ہی کے فیض یافتہ تھے چنانچہ مولانا محمد عبداللہ شہیدؒ سابق خطیب لال مسجد، مولانا محمد اعظم طارق شہیدؒ سابق مہر قومی اسمبلی، مفتی عتیق الرحمن شہیدؒ سابق استاذ

شہیدؒ سابق استاذ حدیث جامعہ بنوریہ عالمیہ، مفتی محمد ذیشان شہیدؒ سابق امیر ناتھ کراچی اہل سنت والجماعت، صاحبزادہ مولانا محمد ابوبکر مدنی شہیدؒ سابق ناظم جامعہ محمودیہ بفرزون اور مفتی فخر الزمان شہیدؒ خادم خاص حضرت جلال پوری شہیدؒ جامعہ علوم اسلامیہ کے انہی فرزندانوں میں شامل ہیں جنہوں نے اپنے خون سے تاریخ رقم کی ہے، اور دنیائے عالم کو بتلایا کہ اللہ جل شانہ کا دین ہمیں اپنی جانوں سے زیادہ محبوب ہے اور بزبان حال یہ کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے کہ ۔

جان دے دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جامعہ علوم اسلامیہ کے متعلق جمعیت علمائے اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمن فرماتے ہیں:

جب بات آتی ہے جامعہ علوم اسلامیہ کی، جس سے ہم سب کو یقیناً روحانی اور قلبی تعلق ہے، تو ماضی کی سنہری تاریخ یاد آ جاتی ہے کہ اس جامعہ نے

ہر تحریک، ہر میدان، اور امت مسلمہ کی صلاح و فلاح کے ہر موقع پر صفِ اول کا کردار ادا کیا.... (حدیث دل، ج: ۱، ص: ۲۸۴)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

حضرت بنوری قدس سرہ کے علمی و عملی مقام بلند کی وجہ سے ان کے قائم کردہ مدرسہ (جامعہ علوم اسلامیہ) کو اپنے تعلیمی معیار اور وقار کے لحاظ سے

دینی مدارس میں ایک امتیاز حاصل ہے۔ (نقوشِ رنگان، ص: ۳۳۳)

ان حضرات اکابرین کی تحریرات بھی اس بات کا بین اور واضح ثبوت ہیں کہ اللہ رب العزت نے جامعہ علوم اسلامیہ کو مرکزی حیثیت عطا فرمائی ہے اور اس مرکز کے فرزندان کی بے مثال خدمات ہیں، اور پھر اس جامعہ کی بنیادوں میں حضرت بنوریؒ کا اخلاص و تقویٰ، حضرت مفتی ولی حسنؒ کا فقہ و فتویٰ، حضرت ڈاکٹر حبیب اللہ مختارؒ کا اصول و ضابطہ، حضرت مفتی احمد الرحمنؒ کی قربانیاں، حضرت لدھیانویؒ و حضرت شامزئیؒ کی شہادتیں، مولانا جلال پوریؒ و مولانا عباسیؒ کی لہورنگ داستانیں اور مفتی جمیل خانؒ و مولانا عطاء الرحمنؒ کے دور رس فیصلے بھی شامل ہیں اور آج بھی یہ جامعہ حضرت ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر اور مولانا سلیمان بنوریؒ کی پیہم کوشش و جدوجہد اور انتھک محنت و قربانیوں سے اسی معیار پر رواں دواں اور اسی راہِ حق و عزیمت پر گامزن ہے جس پہ حضرت بنوریؒ چھوڑ کر گئے تھے۔

بہر حال یہاں کے علما سے اللہ رب العزت نے تقریباً دین کے تمام شعبوں میں تحریر العقول خدمات لیں ایسے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں افراد ہیں جن کو جامعہ نے تیار کیا اور انہوں نے ہمہ جہتی خدمات انجام دیں انہی قابل فخر فرزندانوں میں سے ایک ہمارے مخدوم اور محترم استاذ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ تھے جو ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعہ شام چھ بج کر چالیس منٹ پر طیارہ حادثہ میں اپنی ہمشیرہ اور معاون خاص مولانا مفتی محمد عرفان حمید مبینؒ سمیت اسلام آباد کے قریب شہید ہو گئے مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ بھی دینی شعبوں میں ہمہ جہتی خدمات انجام دینے والے جامعہ کے لائق ترین فرزندان تھے، چنانچہ تدریسی شعبے کی طرف دیکھا جائے تو حضرت شہیدؒ بخاری اور مسلم پڑھاتے ہوئے نظر آئیں گے امامت و خطابت کی طرف نگاہ دوڑائی جائے تو حضرت شہیدؒ صالح مسجد کے امام و خطیب نظر آتے ہیں، علوِ سند کی طرف دیکھا جائے تو حضرتؒ، مفتی ولی حسنؒ کی شاگرد نظر آتے ہیں انتظام و انصرام کی طرف دیکھا جائے تو حضرتؒ جامعہ بنوریؒ ٹاؤن کے ناظم تعلیمات اور وفاق المدارس کی امتحان و نصاب کمیٹی کے رکن نظر آئیں گے، مولانا شہیدؒ اپنی انہی ہمہ جہتی خدمات اور کارناموں کی بدولت ہر دل عزیز شخصیت تھے۔

ہمارے استاذ مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کیا تھے؟....؟

وہ اس آفتاب کی طرح تھے کہ جس کے غروب ہونے سے ادھر سے ادھر تک فضاء میں اندوہ و ملال کا غبار بکھرتا چلا جاتا ہے، مولانا شہیدؒ کی ذات کچھ ایسی ہی صفت کی آئینہ دار تھی اور کوئی نہیں گن سکا کہ ان کی شہادت پر کتنی آنکھیں اشکوں سے نہا گئیں، ان کی سیرت و سوانح، حیات و خدمات اور حالات و واقعات کے لئے یہ ایک چار صد صفحات کی کتاب کافی نہیں بلکہ کئی دفاتر کی ضرورت ہے۔

ہمارے بزرگوں کی یہ پرانی روایت رہی ہے اور یہ بات باعثِ رحمت و برکت بھی ہے کہ جب بھی ہمارے اکابر اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے متعلقین نے ادائے حقِ رفتگان اور تسلیِ پسماندگان کے لیے تحریراً ان کا تذکرہ کیا اس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخصیت کی پوری زندگی امت کے سامنے آ جاتی ہے، ان کے کارناموں کے بعض پہلو جو عوام سے مخفی رہ جاتے ہیں وہ عوام الناس میں نمایاں ہو جاتے ہیں جس کی بنیاد پر عوام کے ذہنوں میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زمانہ کتنا ہی پر آشوب کیوں نہ ہو اسلام پر کلی طور پر عمل کیا جاسکتا ہے کسی بھی نیک شخصیت کی سوانح مرتب کرنا ان کی دنیوی زندگی کے بعد بھی تبلیغ اسلام کی حیثیت ہی رکھتا ہے جو ان کی اخروی زندگی میں رفع درجات اور ترقی ثمرات کا سبب بنتا ہے گویا یہ سوانح ان کے حق میں صدقہ جاریہ کی ایک

خوش گوار صورت بن جاتی ہے چنانچہ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی شہادت کے بعد بھی سب سے پہلے ماہنامہ بینات (کہ جس کا خصوصی اشاعتوں میں ایک ریکارڈ ہے) نے ایک اشاعت خاص بلکہ ایک حسین گلدستہ (جس میں مولانا شہیدؒ پر ۲۵ مضامین تھے) نکالی، بعد ازاں مولوی محمد شعیب حقانی نے اسلامی کتب خانہ کے تعاون سے حضرت شہیدؒ سے متعلق اخباری ۲۵ مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ نکالا اور متعدد رسائل و اخبارات میں حضرتؒ کے بارے میں مضامین بھی چھپے، حضرتؒ کی شہادت کے بعد سے ہی بندہ نے حضرتؒ پر تحریری مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ بفضلہ تعالیٰ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرتؒ کی شہادت سے لے کر اب تک حضرتؒ کے بارے میں جتنے مضامین، تعزیتی ادارے، شذرے اور خبریں چھپی ہیں وہ ساری کی ساری پیش نظر کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں اور بڑے حضرات اکابرین سے مضامین لکھوائے بھی گئے جو شامل اشاعت ہیں آخر میں شہید راہ وفا کا عنوان قائم کر کے حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے سفر و حضر کے خادم اور معاون خاص مولانا مفتی عرفان حمید مین شہیدؒ کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب بہت تاخیر سے قارئین کے ہاتھوں میں آرہی ہے جس کی ایک سیدھی سی وجہ یہ عرض کروں گا کہ سوانح سے متعلق کتب اور خصوصی اشاعتوں کے مرتب کرنے کی مشقتوں کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کا ان چیزوں سے کبھی واسطہ پڑا ہو چنانچہ ابتدائی مرحلہ تحریروں کو جمع کرنے سے لے کر مکمل کتاب کی کمپوزنگ بلکہ کاپی جوڑنے تک کا کام بفضلہ تعالیٰ بندہ نے اکیلے ہی کیا۔

اس کتاب میں چونکہ حضرت شہیدؒ کا تقریباً مکمل تذکرہ اور دیگر اکابرین و متعلقین کے تاثرات کافی حد تک آگئے ہیں اس لیے اس کا نام ”تذکرۃ العطاء“ رکھا گیا۔

آخر میں، میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس سلسلہ میں کسی قسم کا بھی تعاون فرمایا بالخصوص زمزم پبلشرز کے مالک جناب مولانا محمد رفیق بن عبد الجبید صاحب زمزمی مولانا مستقیم صاحب کہ انہوں نے چھاپنے کی ذمہ داری قبول فرمائی اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس کتاب میں اگر کسی قسم کی خوبی ہے تو وہ اللہ جل شانہ کی طرف سے ہے اور حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی مقبولیت عند اللہ کا ثمرہ ہے اور اگر کچھ خامی ہے تو وہ اس ناکارہ کی طرف سے ہے، اللہ جل شانہ جامعہ کی حفاظت فرمائیں اور اس کتاب کو امت کے لیے نافع بنائیں اور میری نجات کا ذریعہ بنائیں۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

محمد زین العابدین

یکم محرم الحرام ۱۴۳۴ھ

فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

ومدرس مدرسہ امام ابو یوسف شادمان ٹاؤن نارتھ کراچی

مشاہدات و تاثرات

یا أسفا علی الشیخ عطاء

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم
رئیس و شیخ الحدیث جامعہ بنوری ٹاؤن، نائب امیر مرکز یہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت



الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام علی أشرف الأنبیاء والمرسلین سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین
مولانا عطاء الرحمن صاحب شہید رحمہ اللہ جامعہ کے ناظم تعلیمات استاذ الحدیث، ایک کامیاب مدرس، جامعہ کے ستون اور میرے دست راست تھے،
جامع مسجد صالح صدر کے امام و خطیب اور تعلیم و تربیت کورس کے بانی تھے، وفاق المدارس والجامعات العربیہ کی نصاب کمیٹی اور امتحان کمیٹی کے ایک فعال
ممبر تھے۔

وفاق کی طرف سے مجھے مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے اور مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ کو نصاب کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے دعوت نامہ ملا، ہم
دونوں کو ساتھ ملتان جانا تھا اور ساتھ واپس آنا تھا، لیکن مولانا شہید میرے پاس آئے اور کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں تین دن پہلے گھر مردان بابوزئی چلا
جاؤں، والدین سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور میری ہمشیرہ آئی ہوئی ہیں ان کو بھی گاؤں چھوڑ آؤں گا، میں نے کہا یہ بہت اچھا ہے، والدین کی زیارت
اور ہمشیرہ کا محرم کے ساتھ سفر ہو جائے گا، پھر وہاں سے ملتان آجائیں، حسب پروگرام مولانا نے جمعہ کی شام بھوجا ایئر لائنز سے سیٹیں کرائیں اور شام پانچ
بجے کراچی سے روانہ ہو گئے، شام سات بجے جہاز کے حادثہ کی خبر سنی لیکن ساتھ ساتھ یہ امید بھی تھی کہ اس طرح کے حادثوں میں بسا اوقات کچھ لوگ بچ جایا
کرتے ہیں، کچھ زخمی ہو جاتے ہیں، لیکن جب یہ خبر پہنچی کہ جہاز فضاء میں پھٹا اور آگ لگ گئی تو پھر مسافروں کی زندگی کی ساری امیدیں ناامیدی میں بدل
گئیں اور فضاء و قدر کے سامنے سر تسلیم خم کیے بغیر چارہ کار نہ رہا، جامعہ کے اساتذہ، طلباء، فضلا اور دیگر علمائے افسردہ دل اور نرم آنکھوں کے ساتھ جامعہ میں جمع
ہونے لگے اور جامعہ کی فضاء یک دم ماتم میں بدل گئی، مگر اس عظیم سانحہ کے موقع پر علمائے و طلباء کا یہی کہنا تھا اور یہی ورد کرتے رہے ’اَنَا لِلّٰہِ وَأَنَا إِلَیْہِ
رَاجِعُونَ‘۔

مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہ جدائی ایک نیک سفر کے دوران ہوئی، پھر ناگہانی موت پیش آئی جو مؤمن کے حق میں شہادت ہے، پھر خالق حقیقی سے
ملنے کے لیے دہشتی آگ کا سامنا بھی ہوا جو حدیث شریف کے مطابق اس امت کے لیے مقام شہادت ہے، رتبہ شہادت کے ان کئی اعزازات کے علاوہ اللہ
تعالیٰ کا فضل اور مولانا شہید کی کرامت دیکھیں کہ آپ کی میت پوری ملی، جسم کے اعضاء تن سے جدا نہ ہوئے بلکہ اس حال میں آپ کی میت شناخت ہوئی کہ
دونوں ہاتھ سینے پر نماز کی طرح باندھے ہوئے تھے، گویا نماز کی کیفیت میں خالق حقیقی کے سامنے پیش ہوئے ہوں۔

مولانا شہید کی شہادت کے بعد کئی اساتذہ اور طلباء نے اچھے اچھے خواب دیکھے ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ کے ساتھ جہاز میں کیا معاملہ پیش آیا
تھا؟ کہنے لگے جب جہاز کو جھٹکا لگا تو میں نے ساتھیوں سے کہا کلمہ پڑھو، اور خود میں نے ہاتھ باندھ کر نماز شروع کر دی۔

شہید مرحوم کے اس واقعے میں جہاں اور کئی سبق ہیں ایک اہم سبق یہ ہے کہ ایک مسلمان کو کسی حال میں اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں رہنا چاہیے، خاتمہ
بالخیر کے لیے فکر مند رہنا چاہیے، دنیا سے ہر انسان نے جانا ہے، جانے کے بعد بھی دنیا میں نیک نامی اور آخرت کے مراحل میں کام آنے والے سلسلے پیچھے
چھوڑ کر جائے تو ایسے لوگوں کو دنیا سے جانے کے باوجود زندہ کردار سمجھا جاتا ہے، ایسے باکردار لوگ کردار کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور ان کا زندہ
کردار آنے والی نسلوں کے لئے رہنمائی فراہم کرتا رہتا ہے، ہمارے مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی باکردار لوگوں میں سے تھے۔

اللّٰہم اغفر لہ وارحمہ وارفع درجاتہ فی اعلی الجنّات، اللّٰہم لاتحرمنا أجرہ ولا تفتنّا بعدہ واغفر لنا ولہ۔



مولانا عطاء الرحمنؒ، ایک عظیم انسان

حضرت مولانا خالد خلیل نعمانی صاحب

استاذ حدیث مدرسہ خلفائے راشدین شاخ جامعہ بنوری ٹاؤن



میرا تعلق مدرسہ عربیہ اسلامیہ (جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن) سے اس کے ابتدائی سالوں سے ہے، درس نظامی سے فراغت ۱۹۶۲ء کی ہے، جب حضرت مولانا نافع گلؒ اور حضرت مولانا لطف اللہؒ، حضرت بنوریؒ کے دست و بازو تھے، ان کے بعد حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ جیسے منتظم، حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکیؒ جیسے بے بدل اور حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ جیسے نابغہ روزگار کا زمانہ بھی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے ان حضرات کی وجہ سے جامعہ کی عزت اور رونق میں بے انتہا اضافہ ہوا، اس زمانے کے طلباء میں سے جامعہ میں اس وقت غالباً ہم دو مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب اور احقر خدمت جامعہ میں موجود ہیں، بہر حال ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۶ء تک کا عرصہ پاکستان سے باہر سعودی عرب، یوگینڈا اور کینیا میں دینی خدمات میں گزرا، چھٹیوں میں جب بھی پاکستان آنا ہوا رفیق عزیز مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ، اور قدیم کرم فرما مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کے علاوہ مولانا عبد القیوم چترائیؒ سے ملاقاتوں کی سعادت کے ساتھ ساتھ دیگر اساتذہ جامعہ سے سلام و دعا کا شرف حاصل ہوتا رہا جامعہ کے کتب خانہ میں مولانا عطاء الرحمنؒ سے بھی سلام و دعا اور ملاقات ہوتی یہ زمانہ مولانا مفتی احمد الرحمنؒ کے بعد کا ہے۔

میرے انہی ساتھیوں اور دوستوں مولانا مفتی احمد الرحمنؒ، مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ، مولانا محمد امین اور کزنؒ، مولانا عبد القیوم چترائیؒ اور مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کے شاگردوں میں سے اہم ترین، لائق ترین، علمی اور عملی قابلیت رکھنے والے، دینی حمیت و غیرت والے، بیدار مغزی میں اپنے اکابر کے جانشین اور جس نے جامعہ کے فیض کو دور دور تک پھیلا دیا وہ شخصیت مولانا عطاء الرحمنؒ کی ہے۔

۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء غالباً مغرب کی نماز کے بعد اسلام آباد سے موبائل پر پیغام آیا کہ مولانا عطاء الرحمنؒ بھی بھوجا ایرلائن کے حادثے میں وفات پا گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، دو اور ذریعوں نے بھی خبر کی تصدیق کی، دل کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی دو روز قبل ہی تو امتحانی نتائج کے اعلان کے روز جامعہ کے دفتر میں سلام و دعا ہوئی تھی، چشم تصور میں مولانا کا نورانی چہرہ سامنے آ گیا اور ایک کے بعد ایک ملاقات یاد آتی رہی، کبھی جامعہ کے کتب خانہ میں براجمان، تو کبھی صالح مسجد صدر میں امامت کرتے اور اپنی شیریں آواز کا جادو جگاتے نظر آتے، مولانا کی آواز کے سحر میں تو میں بھی اس وقت مبتلا ہو گیا تھا جب دارالحدیث سے آپ کی تلاوت حدیث شریف کی صداکانوں میں رس گھولنے لگی، میں کافی دیر تک دارالحدیث کی جانب مشرق دم بخود کھڑا رہا، حتیٰ کہ آپ کا درس اختتام کو پہنچا۔

کبھی حرم و مدینہ میں رمضان المبارک کی مبارک و مقبول ساعتوں میں اپنے رب کے حضور سجدہ ریز دیکھا تو کبھی یوگینڈا میں موجودگی کی اطلاع ملی، تو میں نے اپنے محترم مولانا عبدالخالق طارق صاحب سے ملاقات کا حال احوال جاننے کے لیے پاکستان ٹیلی فون کیا تو فرمایا ہاں حضرت ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تھے ان کے ساتھ مولانا عطاء الرحمن صاحب بھی تھے ایک ہی ملاقات نے مجھے ان کا گرویدہ کر دیا، غرض جہاں مولانا تشریف لے گئے ہر جگہ سے دوستوں نے ان کی خوشبو کی مہک کا تذکرہ ضرور کیا، مولانا کا اصل تذکرہ تو ان کے ہم نشین ساتھی اور ان کے شاگرد ہی کر سکتے ہیں ہم جیسے گوشہ نشین تو ان کی مجالس سے محرومی پر کف افسوس ہی ملتے رہیں گے ان کے ایک شاگرد رشید کے بقول:

”استاذ محترم انتہاء درجہ کے شفیق، خوش اخلاق، اور بے انتہاء ذہین تھے، دوران درس بعض اوقات کوئی بات چل پڑتی تو فی البدیہہ درجنوں اشعار

عربی پڑھ کر سامعین کو حیرت میں ڈال دیتے، ذہانت کا یہ عالم تھا کہ جامعہ میں داخلہ کے لیے پورے ملک اور بیرون ملک سے ہزاروں طلبہ آتے تھے جائزہ لیتے

ہوئے جس طالب علم سے نام پوچھا اگرچہ وہ داخلہ سے محروم رہا ہو لیکن سال ہا سال کے بعد اگر وہ مولانا سے ملا تو مولانا نے دیکھتے ہی اس کو نام لے کر پکارا۔“

انتہائی بااخلاق سادہ اور منکسر المزاج انسان، زبردست مدرّس، بہترین منتظم، جید عالم، عمدہ خطیب، بلا کے ذہین و فطین، چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ بکھری رہتی تھی، انتہائی زیرک تھے آدمی کی حرکات و سکنات اور لطیف اشارات سے بات کی تہہ تک پہنچنے میں کمال حاصل تھا اور یہ غالباً مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ کی فیض صحبت سے انہیں حاصل ہوا تھا جو انہوں نے دارالتصنیف میں مولانا کی معیت میں کتب کی ورق گردانی میں گزارے، بہر حال وہ ایک عظیم انسان تھے، کم عمری میں بہت بڑے بڑے دینی کام کر کے وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا اللہ جل شانہ ان کی مغفرت کاملہ فرمائے اور جامعہ کو صد سارا نیکو فتنہ عطاء فرمائے آمین

آہ! مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب

مدیر ماہنامہ البلاغ کراچی



۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ کا دن گزر کر رات شاید آٹھ بجے کا وقت تھا کہ عزیزم مولوی محمد انس صاحب کا فون آیا جو جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں دارالافتاء سے منسلک ہیں، صدے سے ان کی آواز شدید متاثر تھی، نہایت دلگیر آواز میں انہوں نے احقر کو یہ اندوہناک خبر سنائی کہ مولانا عطاء الرحمن صاحب آج شام کی فلائیٹ سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے تھے اور ان کا جہاز حادثے کا شکار ہو گیا۔۔۔۔۔ یہ الفاظ سن کر مجھے بھی شدید دھچکا لگا، کسی امید کے تجسس میں اور حقیقت حال جاننے کے لیے میں نے پوچھا کہ حادثہ کس نوعیت کا ہے اور کیا مولانا کے بارے میں کوئی اطلاع آئی ہے، اس پر مولوی انس صاحب نے جواب دیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے مولانا امداد اللہ صاحب نے اس حادثے میں ان کی شہادت کی تصدیق کی ہے۔

یہ اندوہناک خبر سن کر جہاں ایک طرف ایک صاحب بصیرت عالم دین، جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے نامور، مقبول اور شفیق استاذ اور اب ایک عرصہ سے وہاں کے ناظم تعلیمات کے اس طرح حادثاتی طور پر رخصت ہونے سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا وہاں دوسری طرف ان کے ساتھ گزرے ہوئے تقریباً تین ماہ کی رفاقت کے شب و روز بھی، خواب کی طرح نگاہوں کے سامنے گزرنے لگے۔

تقریباً ۲۵ سال پہلے ۲۴ مارچ ۱۹۸۷ء کا دن تھا جب جامعۃ الازہر کے ایک اسکیم کے تحت پاکستان کے مختلف حصوں سے تقریباً چالیس افراد مصری انٹر لائنز کے ذریعے قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے تھے، شرکاء کو جامعۃ الازہر کے ایک پروگرام میں حکومت پاکستان کے توسط سے شرکت کی دعوت ملی تھی، یہ پروگرام خطابت اور دعوت دین کے موضوع پر ”تربیۃ الائمة والنداء“ کے عنوان سے تقریباً تین ماہ کا تربیتی پروگرام تھا، پاکستان سے شرکت کرنے والا شاید یہ دوسرا یا تیسرا ہی تھا، اس کے بعد مزید کچھ عرصہ تک بھی یہ پروگرام جاری رہا۔۔۔۔۔ قاہرہ میں جامعۃ الازہر کے بیرون ملک طلبہ کے لیے حکومت مصر نے جمال عبدالناصر کے زمانے میں ایک بڑا کیمپس ”مدینۃ البعث الاسلامیہ“ کے نام سے بنایا تھا جس میں مختلف ممالک سے آئے ہوئے جامعۃ الازہر سے وابستہ طلبہ کے لیے قیام گاہ (ہوسٹل) بھی تھی اور اسی کیمپس میں بسا اوقات کلاسیں بھی لگتی تھیں، پروگرام میں پاکستان کے علاوہ بعض دیگر اسلامی ممالک کے نوذہ بھی شریک تھے بلکہ امریکا اور کینیڈا سے بھی بعض ایسے افراد آگئے تھے جو اصلاً عرب تھے۔

پاکستان سے شریک ہونے والے افراد میں اکثریت عربی مدارس سے وابستہ حضرات کی تھی اور چونکہ ان مدارس میں مختلف علوم و فنون کا نصاب زیادہ معیاری ہے اور طالب علم و استاذ دونوں کو دلجمعی کے ساتھ محنت کرنی پڑتی ہے، اس لیے اس تناظر میں اس تربیتی دورہ میں علمی طور پر ایک طرف تو پختگی کی کمی تھی اور دوسری طرف لیکچرر حضرات سلیس عربی کے بجائے مصر کے عامی لہجے میں گفتگو کرتے تھے جس کا سمجھنا خاصا مشکل ہوتا تھا، عرب ممالک میں یہ ایک مشترک المیہ ہے کہ ان ممالک کے باشندگان عرب ہونے کے باوجود بالعموم نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت کی زبان سے نابلد ہیں بلکہ ممالک عربیہ کے باشندوں کے لیے ایسی مشترک زبان بھی نہیں ہے جس کے ذریعے وہ آپس میں ایک دوسرے کے سامنے بے تکلفی سے اظہار خیال کر سکیں، سعودی عرب، مصر، سوريا، ليبيا، مراکش، سوڈان اور متحدہ عرب امارات کی مقامی زبانوں میں الفاظ و کلمات کا بھی اور لب و لہجے کا خاصا فرق و اختلاف پایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اختلاف عمرانیات کا تقاضا ہے یا مسلم عوام کو قرآن و سنت سے کاٹنے کے لیے سازشی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔

قاہرہ قیام کے دوران شرکاء کو تاریخی مقامات دیکھنے کا بھی موقع ملا، دنیا کا بے نظیر تعمیری عجوبہ اہرام، متحف قاہرہ، (قاہرہ میوزیم) مشہور قلعہ ابن طولون، جامعہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے تاریخی آثار دیکھنے کے علاوہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ، امام شافعیؒ، حافظ ابن حجرؒ اور دیگر ارباب فضل و کمال کے مزارات پر بھی حاضری نصیب ہوئی اور مصر قدیم و جدید کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔۔۔۔۔ اسی دوران رمضان المبارک کا مہینہ آیا تو ساتھیوں کی رائے ہوئی کہ عمرہ کا ویزا حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، شاید ان دنوں مصر اور سعودی عرب کے ڈپلومیٹک تعلقات کشیدہ اور سفارتی تعلقات منقطع تھے، سعودی مفادات کی دیکھ بھال، پاکستان کا سفارتی مشن کر رہا تھا، محمد اللہ عمرہ کا ویزہ بھی مل گیا اور پورٹ سعید کی بندرگاہ سے ”العریش“ نامی پینجر

کایہ سفر آرام و راحت سے اختتام پذیر ہوا، سمندر نہایت پرسکون تھا، اور العریش کا سفر ہوائی جہاز کے سفر کا تاثر دے رہا تھا عمرہ ادا کرنے اور کچھ وقت مکہ مکرمہ میں گزارنے کے بعد بحمد اللہ مدینہ منورہ کی حاضری بھی نصیب ہوئی، مسجد نبوی میں نمازیں ادا کرنے اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام عرض کرنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، مصر کے اس سفر میں حجاز مقدس کا یہ سفر بلاشبہ پر کیف سفر تھا، پندرہ یوم کے بعد العریش ہی سے واپسی ہوئی، لیکن جدہ سے نکلتے وقت موسم کے تیور بدلے ہوئے تھے، سمندر کے تلاطم نے جہاز کو گیند کی طرح ایسا اچھالنا شروع کیا کہ الامان والحفیظ، کسی کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا، جہاز میں خواتین کی بھی بڑی تعداد موجود تھی اور ہر آدمی شدید اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا، میں اور بھائی عطاء الرحمن رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے کیمن میں زیادہ تر وقت اپنے اپنے بستر سے اٹھنے پر قادر نہیں تھے، ایک وقت ہمت کر کے ہم جہاز کے عرشے پر آگئے تو متلاطم سمندر اور اس کے پہاڑ کی طرح بلند ہوتے ہوئے موجوں کے سامنے جہاز کی حالت قابلِ رحم تھی، ہر اٹھنے والی موج کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جہاز پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر نیچے کی طرف گر رہا ہے، اس خوفناک منظر کو دیکھنے کا زیادہ یا را نہیں تھا اس لیے ہم جلدی ہی اپنے کیمن میں واپس آئے اور دبک کر لیٹ گئے۔

بھائی عطاء الرحمن مرحوم کے ساتھ اس سفر سے پہلے صرف واجبی سی شناسائی تھی، لیکن تقریباً تین ماہ کا یہ عرصہ شب و روز کی رفاقت سے گھر کے مکینوں کی طرح گزرا، مدینۃ البعوث الاسلامیہ کے چھوٹے چھوٹے کمرے جو وافدین کو الاٹ ہوئے تھے، ہر کمرے میں صرف دو سنگل بیڈ تھے، ان میں سے ایک کمرہ ہم دونوں کو ملا تھا، ایک کمرے کے مکین ہونے کے ساتھ طعام و قیام اور مختلف مقامات پر آمد و رفت بھی ساتھ ہی ہوتی تھی۔ مولانا عطاء الرحمن صاحب کے حالات اور محاسن پر بہت سے حضرات نے لکھا ہوگا، احقر نے سفر کے یہ حالات اس لیے لکھے کہ سفر کے دوران اور باہمی معاملات میں آدمی کی افتاد طبع اور مزاجی کیفیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، اس سفر میں بھی مولانا کی شگفتہ شخصیت کی وجہ سے یہ طویل رفاقت جو بروجر اور دو ملکوں میں قیام اور طویل فاصلوں کی آمد و رفت پر مشتمل تھی احقر کو یاد نہیں پڑتا کہ کسی وقت آپس میں کوئی اختلاف رائے ہوا ہو، ان کی طبیعت میں ملنساری، بے تکلفی اور بشاشت کے جذبات ہر ملنے والے محسوس کر سکتا تھا۔

وطن لوٹنے کے بعد حالات و مشاغل اور قیام گاہوں میں فاصلے کی وجہ سے مولانا سے ملاقات کی نوبت زیادہ نہیں آتی تھی الا یہ کہ کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی، اب اس پر بہار شخصیت کی اس طرح جدائی کے بعد اگر ایک طرف ان کی قدر و منزلت دل میں زیادہ محسوس ہوتی ہے تو دوسری طرف جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں بھی یقیناً ان کے سانحہ وفات سے بڑا خلا واقع ہو گیا ہے کہ ایک صاحب بصیرت منتظم، مخلص کارکن اور شفیق و باکمال استاذ کا فقدان کسی تعلیمی ادارے کے لیے کوئی معمولی خسارہ نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

مولائے کریم بال بال مغفرت فرمائے، اپنے جوار رحمت میں مقامِ عالی سے نوازے اور فرزندان کو دینِ حنیف کی مخلصانہ خدمت کے لیے قبول فرمائے۔ آمین۔

ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطى وکل شیء عندہ باجل مسمی، برّ اللہ مضجعہ، واکرم مشواہ، انہ سمیع قریب مجیب۔



مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت

حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب

مدیر ماہنامہ لولاک ملتان



بھوجا ایئر لائن کا طیارہ ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعہ شام قریباً سات بجے راولپنڈی چکالہ ایئر پورٹ کے قریب حادثے کا شکار ہو گیا اس میں سوار تمام مسافران شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون یہ بد قسمت طیارہ کراچی سے چلا منزل مقصود راولپنڈی تھی جہاں پہنچنے سے چند منٹ قبل یہ روح فرسا حادثہ پیش آ گیا۔

یہ اچانک حادثہ یقیناً ہمارے اعمال کی سزا ہے حکومتی بد اعتدالیاں و بد دیانتیاں عروج پر ہیں قانون کو نیچا دکھانے کی پالیسی، غبن، اقرباء پروری اور ڈھیٹ پن اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ اس صورت حال میں یہ حادثہ کاش ہم سب کو توبہ و استغفار اور معاصی سے چھٹکارے کی راہ پر ڈال دے! لیکن نت نئے حادثے ہوتے ہیں رسمی تعزیتی چار بول بول کر ہم پھر اسی بے اعتدالی کی راہ پر سرپٹ دوڑنے لگ جاتے ہیں:

وائے	ناکامی	متاع	کارواں	جاتا	رہا
میر	کارواں	کے	دل	سے	احساس
زیاں	جاتا	رہا			

اللہ تعالیٰ ہم سب کو انابت کی توفیق عطا فرمائیں۔ صدر مملکت بد دیانتی کے کیسوں میں منہ چھپائے پھر رہے ہیں پوری دنیا میں پاکستان واحد ملک ہے جس کا وزیراعظم سزایافتہ مجرم ہے۔ کیا دنیا میں جینے کے یہ لچھن ہوتے ہیں؟ کاش پوری قوم اپنی قیادت کی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتی۔ اس افسوسناک حادثے کا ایک دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ اس جہاز میں مولانا عطاء الرحمنؒ استاذ الحدیث و ناظم تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی اور مولانا عرفانؒ بھی شریک سفر تھے جو شہید ہو گئے۔

مولانا عطاء الرحمنؒ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کے محبوب ترین و کامیاب مدرس تھے۔ آپ نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ سے سند فراغت حاصل کی آپ کی قابلیت، ذہانت اور اطاعت شعاری نے اللہ رب العزت کے ہاں یہ قبولیت حاصل کی کہ اپنی مادر علمی میں خدمت تدریس کا موقع مل گیا پھر بڑھے تو بڑھتے ہی چلے گئے اس وقت نہ صرف ناظم تعلیمات تھے بلکہ مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، نائب مہتمم حضرت مولانا سید سلیمان بنوری کے دست و بازو تھے جامعہ کی نمائندگی وفاق المدارس کی نصابی کمیٹی میں آپ کرتے تھے آپ انتہائی دور رس نگاہ رکھتے تھے اصابت رائے کے باعث جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے اساتذہ و طلباء میں محبوبیت کا مقام رکھتے تھے، جمعیت علمائے اسلام اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی قیادت کی آنکھوں کا تارہ تھے وہ کیا گئے ہم سب کو آزر دہ خاطر کر گئے حق تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائیں ان کے درجات بلند ہوں کہ وہ بلند کردار عالم دین تھے جہاز کے حادثے میں شہید ہونے والے تمام مسافروں کے ورثاء تعزیت کے مستحق ہیں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت پس ماندگان کے غم میں برابر کی شریک ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائیں، آمین۔



(ماہنامہ لولاک رجب ۱۴۳۳ھ)

شیخ عطاء شہید رحمہ اللہ

حضرت مولانا فضل محمد یوسف زئی صاحب

استاذ حدیث جامعہ بنوری ٹاؤن

أَيَا قَبْرٍ مَعْنٍ! كَيْفَ وَارَيْتَ جُودَهُ

وَقَدْ كَانَ مِنْهُ الْبُيُورُ وَالْبَحْرُ مُتَرَعًّا

ترجمہ:- ”اے شیخ عطاء کی قبر! تو نے شیخ کے اتنے فضائل کو کیسے چھپا لیا؟ حالانکہ شیخ کے فضائل سے بڑا بحر بھرا ہوا چھلکتا تھا۔“

جامعہ پر ایک نظر:

چند سالوں سے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن حادثات کی زد میں ہے، جامعہ کو ہر حادثہ کے نتیجے میں اپنی نوعیت کا الگ الگ نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ جامعہ کے اساتذہ میں سے شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ کی شہادت سے مسلک حق کی تصنیف کے میدان کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا مفتی عبدالسمیع شہیدؒ کی شہادت سے مسلک حق کے ”دفاع“ کو زبردست نقصان پہنچا، وہ مسلک حق کے مدارس و مساجد کے دفاع کے لئے شمشیر بے نیام تھے، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کی شہادت سے مسلک حق کے قلمی، اصلاحی اور روحانی برکات کے میدان کو نقصان پہنچا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کی شہادت سے مسلک حق کے علمی، تحقیقی، مشاورتی اور تدریسی امور کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کی شہادت سے مسلک حق کے خدماتی اور رفاہی میدان کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہیدؒ کی شہادت سے فرق باطلہ کی تشخیص اور ان کی تردید کے میدان کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا ارشد اللہ عباسی شہیدؒ کی شہادت سے جامعہ کے تدریسی میدان کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی شہادت سے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے اندرونی و بیرونی انتظام کو نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ دیگر حادثات بھی جامعہ کو پیش آئے، جن سے اپنی نوعیت کے الگ الگ نقصان کو جامعہ نے برداشت کیا۔ ہم ان حادثات پر جتنے درد کا اظہار کریں، اس میں ہم حق بجانب ہیں، کیونکہ یہ ناقابل برداشت حادثات ہیں۔ شاعر سا حرا کہتا ہے۔

إِنْ جَزَعْنَا نَـالَـهُ فَلَا عَـجَبَ
ذَآلِـحَ زُرْفِیْ الْبَـحْرِ غَیْرُ مَـعْهُ وُودَ

ترجمہ:- ”اگر ہم ان (شہداء) کے لئے جزع فزع کریں تو یہ تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ سمندر کی لہروں میں یہ نقصان غیر معمولی نقصان ہے۔“

حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ سے میری رفاقت:

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی خصوصیت میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ جامعہ کے اساتذہ کرام آپس میں ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں۔ میں جامعہ کی تدریس سے ۱۹۸۷ء سے منسلک ہوا ہوں، دو سال میں نے ملیر شاخ میں تدریس کی اور ۱۹۸۹ء میں میرا تبادلہ مرکز کے لئے ہوا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں درجہ سابعہ کی کلاس میں مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے لئے داخل ہونے لگا تو راستے میں مجھے مولانا عطاء الرحمنؒ ملے، آپ نے میری رہنمائی فرمائی اور سابعہ کی کلاس میں بٹھانے کے لئے درس گاہ تک میرے ساتھ آئے۔ آج جب میں گھر سے نکلا تو حضرت مولانا مرحوم کے دو بیٹے جمیل الرحمن اور یلیح الرحمن مجھے سیڑھیوں پر ملے جو مولانا کے جنازہ پر بابوزئی گئے تھے اور اب واپس گھر آ رہے تھے، گھر میں داخل ہونے سے پہلے میری ہی ملاقات ان سے ہوئی، میں نے ان کو ان کے گھر جانے کے لئے جب اشارہ کیا تو مجھ پر رقت طاری ہوئی اور مجھے وہی منظر یاد آیا جو مولانا مرحوم نے ۱۹/ شوال ۱۹۸۹ء میں مجھے درس گاہ جانے کے لئے اشارہ کیا تھا، شاعر نے ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا۔

یادِ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا
ماضی عذاب ہے یا رب!

حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی عمر ۵۲ سال تھی، گویا وہ عمر میں مجھ سے بارہ سال چھوٹے تھے، لیکن چونکہ وہ میرے پڑوس میں رہتے تھے اور جامعہ کی تدریس میں ہمارے رفیق تدریس تھے، اس لئے ہم نے تقریباً ۲۳ سال کا طویل عرصہ اکٹھا گزارا ہے۔ مولانا مرحوم میں احباب و رفقاء کے ساتھ محبت و مروت کا بہت بڑا جذبہ تھا، وہ آپس کے اکرام و احترام کا بہت زیادہ لحاظ رکھتے تھے، ہم ۲۳ سال تک اکٹھے رہے ہیں، اس طویل عرصہ میں ہماری آپس

میں کبھی کوئی تلخ کلامی نہیں ہوئی۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ: وہ مر گئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں عارضی زندگی گزار رہے ہیں، ہمارا حقیقی گھر یہاں نہیں ہے، بلکہ یہ تو قید خانہ ہے، اصل گھر تو مسلمان کا وہی ہے، جہاں مولانا مرحوم چلے گئے، کسی نے سچ کہا ہے:

کون کہتا ہے کہ مومن مر گیا
قید سے چھوٹا وہ اپنے گھر گیا

اگرچہ مولانا مرحوم کا یہ جانا اٹل اور مقدر تھا، لیکن جامعہ کے اساتذہ کو مولانا مرحوم کے اس طرح جلدی اٹھ جانے کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ مولانا مرحوم کی عمر بھی اتنی زیادہ نہ تھی، اس لئے ان کے اس سانحہ شہادت کو اساتذہ و طلبہ حیرت کے ساتھ اس طرح خیال کرتے ہیں، جس طرح شاعر نے کہا:

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حیرت ان باغیچوں پہ ہے جو بن کھلے مر جھا گئے

مولانا مرحوم کے پسماندگان:

مولانا مرحوم نے اپنے پیچھے ضعیف والدین، تین بہنیں، تین بھائی، ایک بیوہ اور چار بیٹے سو گوار چھوڑے ہیں، دو بیٹے عالم ہیں اور دو ابھی جامعہ میں ہی زیر تعلیم ہیں۔ مولانا مرحوم کے والد محترم مشفق الرحمن صاحب مدظلہ اس وقت عمر کی انتہائی ضعیف حالت میں ہیں، اس طرح نابغہ روزگار عالم فاضل بیٹے اور بیٹی کا ایک ساتھ اٹھ کر چلا جانا یہ ایسا صدمہ ہے کہ ایک مضبوط اعصاب کا جوان شخص اس کو برداشت نہیں کر سکتا، لیکن اس باہمت باپ نے اس حادثہ کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر تمام بے چینی کے باوجود نہایت صبر و استقلال اور عظمت و وقار کے ساتھ برداشت کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی طرح کے کردار سے تاریخ بنتی ہے۔ تعریف صبر کی ہوتی ہے، بے صبری کی تعریف نہیں کی جاتی۔ میرے خیال میں مولانا امداد اللہ صاحب مدظلہ پر اس صدمے کا بہت زیادہ بوجھ ہے، اللہ تعالیٰ سب کو صبر کی توفیق دے۔ حضرت ابن عباسؓ کے والد حضرت عباسؓ کا جب انتقال ہوا تو ابن عباسؓ کو ایسی بے چینی لاحق ہو گئی کہ کسی کی تسلی دینے سے چین ہی نہیں آ رہا تھا، وہ خود فرماتے ہیں کہ: مجھے ایک دیہاتی نے تسلی کے لئے دو شعر سنائیے، جس سے میری پوری تسلی ہو گئی اور چین حاصل ہو گیا، وہ دو شعر یہ ہیں۔

إصْبِرْ نَكُنْ بِكَ صَابِرِينَ وَإِنَّمَا
صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّاسِ

ترجمہ:- ”اے ابن عباس! آپ صبر کریں، آپ کے صبر سے ہم بھی صابر بن جائیں گے، کیونکہ بڑوں کے صبر سے چھوٹے صابر بن جاتے ہیں۔“

خَيْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ أَجْرُكَ بَعْدَهُ
وَاللَّهُ خَيْرٌ مِّنْكَ لَوْلَا عِبَّاسُ

ترجمہ:- ”تجھے جو اجر ملے گا وہ تیرے لئے عباسؓ سے بہتر ہے اور عباسؓ کے لئے اس کا رب تجھ سے زیادہ بہتر ہے۔“

صبر کی یہ تلقین صرف مولانا کے پسماندگان کے لئے نہیں ہے، بلکہ حضرت مولانا کی موت کا یہ ہمہ گیر غم جامعہ کے رئیس، اساتذہ، طلبہ اور حضرت مولانا مرحوم کے تمام متعلقین اور ہزاروں شاگردوں کے لئے مشترک غم ہے، لہذا صبر کی یہ تلقین بھی سب کے لئے ہے، کیونکہ مولانا مرحوم کی حادثاتی موت سے ان سب حضرات کی بنیادیں ہل گئی ہیں، کسی نے سچ کہا ہے۔

وَمَا هُلْكُ قَيْسٍ هُلْكُهُ هُلْكُ وَاحِدٍ
وَلَكِنَّهُ بُنْيَانٌ قَوْمٍ تَهْدَمُ مَا

یعنی شیخ عطاءؒ کی موت کسی ایک انسان کی موت نہیں ہے، بلکہ اس سے پوری قوم کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

میری ساٹھ سال عمر ہے، میں نے اس عمر میں کسی عالم یا غیر عالم کی تعزیت کے لئے دنیا کے مختلف حصوں سے اتنے لوگوں کو آتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، جتنا کہ مولانا مرحوم کی تعزیت میں سیلاب کی طرح لوگ اُمنڈ آئے، یہ مولانا کی مقبولیت عند اللہ اور مقبولیت عند الناس کی واضح دلیل ہے۔ بہر حال موت کا راستہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر ہر زندہ انسان کا گزر نا لازم ہے، اگر دنیا میں کسی کا ہمیشہ رہنا اعزاز و اکرام ہوتا تو آنحضرت ﷺ پر کبھی موت نہ آتی۔

وَلَوْ كُنَّا نَتْلُو الدُّنْيَا تَدْوُمُ لَوَاحِدٍ

لَكَانَ مُحَمَّدٌ فِيهِ أَمُخْلَدٌ

یعنی اگر دنیا میں کسی کو ہمیشہ رہنا ہوتا تو محمد ﷺ ہمیشہ یہاں رہتے۔

موت کا آنا اور ہر ذی جاند کا اس کو چکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غالب اور قادر مطلق ذات ہے وہی ”فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ“ ہے

أَلَا إِنَّكُمْ كَانَتْ وَقَاةٌ مُحَمَّدٍ

ذَلِيلٌ عَلَى أَنْ لَّيْسَ لِلَّهِ غَالِبٌ

یعنی محمد ﷺ کی وفات اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی غالب نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ موت کے میدان میں صبر کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، صبر ہی مضبوط ہتھیار ہے۔ ایک عاقل شاعر نے خوب کہا۔

سَبِيلُ الْمَمُوتِ غَايَةُ كُلِّ حَيٍّ

فَدَاعِيهِ لَأَهْلِهِ الْأَرْضِ دَاعٍ

یعنی موت کا راستہ ہر زندہ انسان کا انجام ہے، اس لئے کسی وقت بھی اس کو زمین سے جانے کے لئے کوئی بلانے والا بلائے گا۔

فَصَبْرًا فِي مَجَالِ الْمَمُوتِ صَبْرًا

فَمَا نِيلَ الْخُلُودِ بِمُسْتَطَاعٍ

پس موت کے میدان میں صبر کو اختیار کرنا چاہئے، کیونکہ ہمیشہ زندہ رہنا کسی کی طاقت میں نہیں ہے۔

انسانی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان جانے کے لئے آیا ہے، رہنے کے لئے کوئی نہیں آیا ہے، آنا ترتیب کے ساتھ ہے کہ بڑا پہلے آتا

ہے، چھوٹا بعد میں آتا ہے، لیکن جانے میں کوئی ترتیب نہیں ہے، کبھی چھوٹا پہلے جاتا ہے، بڑا بعد میں جاتا ہے، کبھی اس کا عکس ہوتا ہے، اس طرح ہر محبوب

اپنے محبوب سے جدا ہو جاتا ہے اور موت کا علاج کسی طبیب اور ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔

سَبَقْنَا إِلَى الدُّنْيَا فَلَوْ عَاشَ أَهْلُهَا

مُنْعِنًا بِهَا مِنْ جِيئَةٍ وَذَهَابٍ

یعنی ہم دنیا کی طرف لائے گئے ہیں، اب اگر موت نہیں آئے گی اور سب لوگ زندہ رہیں گے تو پھر دنیا میں چلنا پھرنا دشوار ہو جائے گا۔

وَقَدْ فَارَقَ النَّاسُ الْأَحْيَاءَ قَبْلَنَا

وَأَعْيَا دَوَاءَ الْمَمُوتِ كُلِّ طَبِيبٍ

یعنی ہم سے پہلے بھی سارے لوگ اپنے محبوبوں سے جدا ہو گئے ہیں، کیونکہ موت کے علاج نے ڈاکٹروں کو عاجز بنا دیا ہے۔

تاہم موت کی اس اٹل حقیقت کے باوجود علماء اپنی موت کے بعد بھی اپنے علمی کارناموں اور دینی خدمات کی وجہ سے اور اپنی روحانی اولاد کی وجہ سے

زندہ رہتے ہیں، شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

أَخُو الْعِلْمِ حَيٌّ خَالِدٌ بَعْدَ مَوْتِهِ

وَأَوْصَالُهُ تَحْتَ الثَّرَابِ رَابِ رَمِيمٍ

یعنی صاحب علم آدمی اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، اگرچہ اس کے جسم کے جوڑ جوڑ مٹی کے نیچے ریزہ ریزہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اسی طرح

حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ جو علم و عمل کے آفتاب و ماہتاب تھے، جو علم و عمل کے میدان میں ایک روشن بابِ رقم کر کے رخصت ہو گئے اور ”يَا أَيُّهَا النَّفْسُ

الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي“ کی کوس رحلت پر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے ہمیں

داغ مفارقت دے گئے اور ان شاء اللہ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ عاشِ سعیداً و ماتِ حمیداً و نذکرہ دھراً مدیداً۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ اور مولانا عرفان مبینؒ کے پسماندگان کو اس عظیم صدمہ کے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کو صبر جمیل

پراجر جزیل عطا فرمائے اور حضرت کے لگائے ہوئے باغ کی حفاظت فرمائے اور مرحومین کی قبروں پر رحمتوں کی بارش برسا دے، آمین یا رب العالمین۔

آسمان تیری لحد پر شبِ نیم افشانی کرے سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)

آہ! عزیز القدر مولانا عطاء الرحمنؒ کا سانحہ ارتحال

حضرت مولانا محمد زرولی خان صاحب

مدیر ماہنامہ الاحسن کراچی



سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہو گئی کہ پنہاں ہو گئیں

حق تعالیٰ نے موت جس طرح مقدر فرمائی ہے وہ اسی طرح آئے گی ’’ان اجل الله اذا جاء لا يؤخر لو كنتم تعلمون‘‘ بعض افراد کی موت پیچھے رہنے والوں کے لئے بہت زیادہ صبر آزما اور تلخ داغ مفارقت کا باعث ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے عزیز دوست حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب مرحوم و مغفور جہاز کے حادثے میں جام شہادت نوش فرما گئے مگر پسماندگان کو بہت تلخی اور صبر آزما مراحل سے دوچار فرما گئے۔

تلخ تر از فرقت تو ہیچ نیست

موصوف ایشاء کے مقتدر ادارہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں برادر مکرم مولانا امداد اللہ کے ہمراہ تحصیل علوم میں مشغول رہے طالب علمی کے زمانے سے مادر علمی کے وفادار، حضرات اساتذہ کے ساتھ کامل اخلاص اور محبت برتنے والے اور دینی عزائم اور بلندیوں کے لئے جانثار تھے، شاید ایسے ہی موقع پہ کہا گیا ہے:

بالائے سرش ز ہوش مندی می تافت ستارہٴ سربلندی

ہمارے استاد محترم اپنے وقت کے عالمگیر بادشاہ فقیہ انفس حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب رحمہ اللہ نے ایک دن جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے ان دونوں حضرات کا مجھ سے تعارف کروایا، غالباً یہ نئے نئے فاضلان ہو گئے تھے اور جامعہ کے ساتھ وابستگی ہونے والی تھی آگے چل کر ہر دونوں تخلصین نے وفاداری اور اساتذہ اور مشائخ کی اطاعت اور انقیاد کے وہ مظاہر دکھائے اور خداداد صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھائے کہ اپنے پیش روؤں سے چند قدم آگے نکلنے میں کامیاب و کامران نظر آئے۔

مولانا موصوف مرحوم کے ذمہ اپنی مادر علمی میں تدریس و تعلیم کے علاوہ نظامتِ تعلیم کی ذمہ داریاں بھی وابستہ تھیں جنہیں وہ بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نبھاتے تھے۔ مولانا مرحوم جامعہ کے قافلہٴ رشد و ہدایت کے آخری تاجدار ہمارے بزرگ اور مخدوم استاذ العرب والعم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہ کے دست راست اور معین و مددگار ثابت ہونے میں بھی اپنی نظیر آپ تھے۔ اس عاجز و فقیر کے ساتھ بھی برادرانہ تعلق اور مخلصانہ برتاؤ فرماتے تھے، احسن العلوم آمد و رفت کے موقع پر یابہاں اور وہاں کے پروگراموں میں جس شوق اور توجہ سے وہ پیش آتے تھے وہ ان کے عظیم اخلاص اور اپنوں کی مرتبہ شناسی کا مظہر اتم ہوتا تھا۔ وقت آچکا تھا اور بھوجا نیرلائن کی فلائٹ زندگانی کا آخری جھولہ اور آخرت کی دائمی نظاروں اور شیریں اور ٹھنڈے آبشاروں سے لطف اندوز ہونے کی گھڑی ثابت ہوئی۔ عزیزم مرحوم کے ساتھ ان کی ہمیشہ اور ان کے دوست بھی ہمسفر تھے وہ بھی جام شہادت نوش فرمانے میں ہمسفر اور ہم رنگ ثابت ہوئے مولانا مرحوم جس طرح الوداع کر گئے اور جس طرح اپنے مادر علمی مشائخ اور رفقاء کرام سے جدا ہوئے اپنے والدین اقربا اور اعزہ اور دیگر شرکاء کو غم اور صدمے میں جس طرح چھوڑ گئے اس کے لیے بجا طور پر کہا گیا ہے۔

پچھڑا تو اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی اک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا اللہ تعالیٰ مولانا عطاء الرحمن مرحوم ان کی ہمیشہ اور ان کے ساتھ اس سانحہ میں دیگر شہداء اور سعداء کی کامل مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات نصیب فرمائے اور اس عظیم سانحہ پر جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن اور ان کے اہل قرابت جس طرح غمزدہ ہیں اللہ اپنی شان کے مطابق بہترین بدلے اور صلہ نصیب فرمائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین



سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

حضرت مولانا محمد ازہر صاحب

مدیر ماہنامہ الخیر ملتان



۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بروز جمعہ اسلام آباد میں طیارے کے حادثے میں ۱۲ افراد کی شہادت نے پورے ملک کی فضا کو سوگ وار کر دیا ہے۔ ان تمام افراد کی یہ حادثاتی موت المناک قومی سانحہ ہے، بالخصوص ملک کی معروف دینی درس گاہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ناظم تعلیمات اور استاذ حدیث مولانا عطاء الرحمن صاحبؒ کی اپنی ہمیشہؒ اور خادم و محب مولانا عرفان مبینؒ سمیت شہادت نے دینی و علمی حلقوں کو بطور خاص مغموم و اشک بار کر دیا ہے۔ مجھے حضرت مولانا سے تفصیلی تعارف نہیں تھا لیکن روزنامہ اسلام (۲۹ جمادی الاولیٰ) میں حضرت مولانا کی دینی و علمی خدمات، ان کے اخلاص و للہیت، ان کی دیانت و امانت، ذہانت و فطانت، تصنع و تکلف اور شہرت و نمود سے ان کی طبعی نفرت و کراہت کا ایمان افروز تذکرہ ان کے تلمیذ رشید برادر محترم مولانا محمد شفیع چترالی کے اشک بار و مشک بار قلم سے پڑھا تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایسی جامع کمالات و صفات ہستی کا یکا یک نظروں سے اوجھل ہو کر تعلیم و تدریس کی محفل کو ویران کر جانا جامعہ بنوری ٹاؤن کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ دیگر تمام شعبوں میں اس جہاں سے رخت سفر باندھنے والوں کے بعد ان کی جگہ لینے والے موجود ہیں لیکن مدارس کی دنیا میں تدریسی حلقوں میں یہ تشویش ناک صورت حال ہے کہ جب علم و فضل، زہد و تقویٰ اور اہلیت و لیاقت کی جامع کوئی شخصیت داغ مفارقت دیتی ہے تو دور دور تک اس کی جگہ لینے والا اور اس خلا کو پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا، فالسی اللہ المشتکی۔

برادر م مولانا محمد شفیع چترالی سمیت مولانا عطاء الرحمنؒ کے سینکڑوں تلامذہ دلی تعزیت کے مستحق ہیں۔ حق تعالیٰ انہیں اور جامعہ بنوری ٹاؤن کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں اور اس نقصان کی تلافی فرمائیں، جو مولانا کی جدائی کی وجہ سے پوری قوم بالخصوص دینی حلقوں کو ہوا ہے۔ مولانا اور ان کے ساتھ شہید ہونے والے دیگر پانچ علمائے کرام کی زندگیاں دین حق کی اشاعت میں صرف ہو رہی تھیں، اس لیے ان کے لیے یہ اچانک موت بھی ان شاء اللہ العزیز رفع درجات کا ذریعہ ہوگی۔ ان کے ساتھ دیگر ۱۲ افراد جو لقمہ اجل بنے، ان کے لیے بھی دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمان مرحومین کی مغفرت فرمائیں اور ان کی سینات سے درگزر فرمائیں۔ تاہم ہم غافلوں کے لیے اس سانحہ میں عبرت کا بہت بڑا سامان ہے کہ ہماری زندگی کن کاموں اور کن خدا فراموش مصروفیتوں میں گزر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری غفلت اور آخرت فراموشی کا یہ حال ہے کہ اس طرح کے غیر معمولی اور عبرت ناک سانحات بھی ہماری زندگیوں میں کوئی حرکت، کوئی ارتعاش، کوئی تبدیلی یا کوئی انقلاب پیدا نہیں کرتے۔ اپنے پیاروں کی جدائی کے الم ناک و دل خراش واقعات دیکھنے، سننے اور پڑھنے کے بعد بھی ہمارے شام و سحر اسی غفلت و خدا فراموشی میں گزرتے ہیں، جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

بھول گیا موت کو دیکھ کر جینے کی بہار غفلت نے پیش نظر انجام کو رہنے نہ دیا

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے سانحات و حوادث ایک کافر و منکر خدا اور مومن اور موحّد کے درمیان خط فاصل کھینچ دیتے ہیں۔ اول الذکر صرف ظاہری اسباب اور عقلی و مادی تدبیروں اور تجویزوں اور تبصروں تک رہتا ہے، جبکہ مومن ان حوادث میں پوشیدہ اس سبق اور تنبیہ کو پڑھ اور سن لیتا ہے جو بالعموم انسان کی بد اعمالیوں پر قدرت کی خاموش آواز میں ہوتے ہیں۔ مومن ان حادثات کو صرف ایک سانحہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ تازیانہ عبرت کی نظر سے بھی دیکھتا ہے اور ان سے سبق پا کر اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کی تلافی و تدارک کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ موت کا اچانک آنا اور توبہ و استغفار اور کسی قسم کی وصیت کا موقع نہ مل سکرنا سبق آموز و لائق عبرت ہے، بالخصوص ہم جیسے غافلوں کے لیے جو ترک معاصی اور اعمال صالحہ کے عزم کو آج کل پر ٹالتے رہتے ہیں۔ اس سانحہ میں جاں بحق ہونے والوں میں بعض ایسے خوش نصیب بھی ہوں گے جنہوں نے یہ سوچا ہو کہ ہو سکتا ہے یہ ہماری زندگی کا آخری سفر ہو اور اس کے پیش نظر انہوں نے اپنے اعمال و کردار کا جائزہ لیا ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد سے متعلق اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوشی کی فکر کی ہو اور کوئی وصیت، تیاری اور اہتمام کیا ہو لیکن مقام فکر ہے کہ ہم میں کتنے افراد ایسے ہوں گے جو کسی سفر پر روانگی سے پہلے یہ سوچتے ہیں، جنہیں دنیا کی رنگینیاں اور دل فریبیاں مقصد زندگی سے غافل نہیں کرتیں، یا جو کم از کم اس نوع کے سانحات سے سبق حاصل کر کے سنبھل جاتے ہیں اور فانی دنیا کے فریب میں آنے کی بجائے آخرت کی فکر و عمل میں لگ جاتے ہیں۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بخارہ

کیا مسند، تکیہ، ملک، مکان، کیا چوکی، کرسی، تخت، چھپر



دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سانحہ کے تمام شہداء کی مغفرت فرمائیں اور ہمیں سبق آموزی اور عبرت پذیری کی توفیق نصیب فرمائیں (آمین)

مولانا عطاء الرحمنؒ کا سانحہ ارتحال

حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب

مدیر ماہنامہ القاسم نوشہرہ



۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء کو اسلام آباد انٹرنیٹ پورٹ کے قریب بھوجا انٹرنیشنل کے طیارے کے گر کر تباہ ہونے والے حادثے میں جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات و استاذ الحدیث حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحبؒ اپنی ہمیشہ اور محب صادق مولانا محمد عرفان میمنؒ سمیت شہید ہو گئے۔ مولانا عطاء الرحمنؒ مردان کے علاقے بابوزئی میں ۱۹۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم گاؤں کے ہائی سکول میں حاصل کی، پھر دارالعلوم شیرگرھ میں ابتدائی دینی کتابیں پڑھنے کے لئے داخلہ لیا۔ ۱۹۷۵ء میں مزید حصولِ علم کے لئے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا اور ۲۳ سال کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل کر کے دورہ حدیث مکمل کرنے کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔ خادمانہ مزاج رکھنے کی وجہ سے مفتی احمد الرحمنؒ کی نظرِ شفقت کے مستحق ٹھہرے اور جامعہ ہی میں تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ تدریس کے ساتھ ساتھ کراچی صدر کی جامع مسجد صالح کی امامت و خطابت کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہوئے اور مولانا عبدالقیوم چترائیؒ کی معذوری کی وجہ سے بنوری ٹاؤن کی نظامتِ تعلیمات کی بھاری ذمہ داری پر بھی مامور کر دیے گئے اور تادمِ شہادت بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات اور استاذِ حدیث تھے۔ موصوف ایک مخلص وفادار، خادم مزاج، متواضع، خلیق اور بے حد جانثار فقی تھے۔

احقر کے زمانہ دارالعلوم حقانیہ اور جامعہ ابو ہریرہ کے قیام کے بعد بھی خصوصی تعلق خاطر رکھتے تھے۔ جب بھی ان کا پنڈی اسلام آباد جانا ہوتا تو اکثر و بیشتر جامعہ ابو ہریرہ تشریف لا کر اپنی ملاقات اور شفقتوں سے سرفراز فرماتے۔

۲۰۱۰ء کے تباہ کن سیلاب کے ایام میں برادرِ مکرم مولانا امداد اللہ اور ان کے قائم فرمودہ ادارہ میں جلسہ تقسیم اسناد و دستار بندی کے موقع پر مجھے بطورِ مہمان خصوصی مدعو کیا تھا۔ موسمی حالات، شدید بارشیں اور جگہ جگہ سیلابی پانی کی یلغار کی وجہ سے بظاہر اسباب جانا ممکن نہ تھا مگر مولانا عطاء الرحمنؒ اور مولانا امداد اللہ کا اصرار تھا کہ آنا ہے اور بہر صورت آنا ہے۔ میں نے بھی ان کی محبت اور اشتیاق کی وجہ سے حامی بھر لی، رختِ سفر باندھا تو بند راستے کھلتے گئے اور مجھے ان کے ہاں اجتماع میں حاضری کی سعادت ملی۔ مرحوم اپنی اداؤں سے نچھا اور ہور ہے تھے اور مجھ گناہ گار کے ساتھ اپنے مشائخ اور اساتذہ جیسے اکرام و احترام کا معاملہ کرتے رہے۔ یہ محض ان کی متواضعانہ طبیعت کا خاصا تھا۔ ماہنامہ القاسم کے اولین روز سے قاری تھے۔ جب پرچہ میں تاخیر ہوتی یا انہیں موصول نہ ہوتا تو فون کر کے اپنے انتظار اور بے چینی کا اظہار کرتے، فرماتے:

”القاسم سے تعلق خاطر ہے ہر ماہ مطالعہ کی عادت پڑ گئی ہے علم و ادب اور قلم و کتاب کے حوالے سے اپنے طلبہ کو بھی اس کے مطالعہ کی تاکید کرتا رہتا ہوں“

اپنے درس میں بھی میری کتابوں کے حوالے دیتے اور طلبہ سے ان کے مطالعہ و استفادہ کی تاکید کرتے۔ دورانِ درس کسی بھی مناسبت سے میری کتابوں کا ذکر چھیڑ دیتے تو چھڑے رہتے ان کے تلامذہ و مستفیدین اس حوالے سے مجھے خبر دیتے تو میری حوصلہ افزائی ہوتی اور بے اختیار ان کے لئے دُعا میں کرتا رہتا۔

مولاناؒ کی شہادت کی خبر سنتے ہی جامعہ ابو ہریرہ میں ایصالِ ثواب اور دُعاے مغفرت کا اہتمام کیا گیا۔ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن، اساتذہ، طلبہ بالخصوص مولانا امداد اللہ اور شہید کے خاندان سے تعزیت کرتے ہیں بلکہ ہم خود بھی تعزیت کے مستحق ہیں۔

(ماہنامہ القاسم رجب ۱۴۳۳ھ)



صبح وصال (۱۹۷۷ء) تا شب ہجر (۲۰۱۲ء) شیخ عطاءؒ سے رفاقت کی چند جھلکیاں

حضرت مولانا امداد اللہ صاحب
استاذ الحدیث جامعہ بنوری ٹاؤن



حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب شہید رحمہ اللہ جو مجھ سے ایک چیز میں چھوٹے اور اس کے علاوہ ہر چیز میں مجھ سے بڑے تھے۔ میں خاندانی رشتہ میں ان کے والد گرامی کے چھوٹے بھائیوں میں شمار ہوتا ہوں، اس کے علاوہ شیخ عطاءؒ علم و عمل اور عمر و تجربہ میں مجھ سے بڑے تھے، مگر ان کا میرے ساتھ برتاؤ، گہری اخوت، مکمل اعتماد اور بے پناہ محبت و احترام کا برتاؤ تھا۔ اخوت و اعتماد اور محبت کا یہ رشتہ یوں تو بچپن کے گھریلو ماحول سے قائم تھا، مگر اس کا حقیقی معنوں میں احساس اور ظہور ۱۹۷۷ء سے شروع ہو کر ۲۰۱۲ء تک رہا۔ یہ طویل دورانیہ جامعہ میں ہماری تعلیمی زندگی، پھر عملی وابستگی کی حسین یادوں پر مشتمل ہے، جس کا ایک ایک لمحہ یادگار، اس کا ہر بدن ایک تاریخ اور اس کی ایک ایک رات داستانِ دراز ہے، ایسے تعلق اور اس تعلق کی یادوں کو مختصر وقت اور محدود صفحات میں سمیٹنا کتنا دشوار ہے، اس کا اندازہ وہی انسان لگا سکتا ہے جو ان مراحل سے گزرا ہو اور گزر رہا ہو، اسی طویل اور گہرے تعلق کی وجہ سے ساتھی بار بار اصرار بھی کر رہے ہیں اور کچھ باتیں عرض کرنے پر مجبور کر رہے ہیں، اس لئے محض ان کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی، بلکہ اظہارِ تعزیت و تشکر کے لئے اختصار کے ساتھ چند باتیں ”مشتملہ نمونہ از خروارے“ کے طور پر ذکر کرنے پر اکتفاء کروں گا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا کہ شیخ عطاءؒ سے میری جامعہ کی تعلیمی پھر عملی زندگی کا تعلق ۱۹۷۷ء سے شروع ہوتا ہے جو تا شبِ فرقت و ہجر بے مثال تسلسل اور توازن کے ساتھ قائم رہا، کسی بھی تعلق کے اس قدر طویل دورانیہ میں فطری طور پر بے شمار نشیب و فراز آتے رہتے ہیں، سخت سے سخت حالات آتے جاتے رہتے ہیں، مگر مجھے یاد نہیں ہے کہ اس طویل عرصہ میں ہم دونوں کے درمیان کبھی کوئی خلش یا رنجش پیدا ہوئی ہو یا ہمیں ایک دوسرے سے اعراض اور ناراضگی کی نوبت آئی ہو، اس کا بنیادی وسیلہ شیخ عطاءؒ مرحوم و مغفور کے اعلیٰ اخلاق اور حسن خلق تھا، جس نے ہمیشہ مجھے متاثر ہی نہیں بلکہ آپ کے ادب و احترام کے لئے دل و جان سے مجبور بھی کیا۔

اخوت و محبت کی اس طویل رفاقت میں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ہمارے طویل طویل اسفار بھی ہوئے، ان اسفار میں معاملات کی صفائی اور شفافیت کے لئے آپ کا جو حکیمانہ طریقہ تھا وہ میرے لئے بڑا متاثر کن اور قابلِ تقلید رہا، سفر شروع ہونے پر فرماتے کہ: امداد اللہ صاحب! سفری اخراجات کے لئے آپ امیر اور مختار ہیں، خرچ کرتے رہیں، آخر میں سارا خرچہ برابر تقسیم کر لیا جائے گا، چنانچہ زندگی بھر یہی معمول رہا اور کبھی ایک دوسرے کی طرف کسی قسم کا حساب کتاب نہیں رہنے دیا، معاملات کے اسی شفاف اصول کا نتیجہ ہے یا شاید بعض لوگ حیران بھی ہوں کہ ہم دونوں تعلیمی زندگی کے آغاز سے لے کر عملی زندگی کی شام تک کبھی ایک دوسرے کے مقروض نہیں رہے۔

شیخ عطاءؒ کے معاملات کی شفافیت کا پہلو بڑا منفرد قسم کا رہا، ملک میں مختلف مواقع پر قدرتی آفات سے متاثرین کے لئے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کی طرف سے ہنگامی امداد اور تعاون کی اپیل ہوتی رہی، جس میں ۲۰۰۵ء کا زلزلہ، سیلاب متاثرین اور متاثرین سوات و مالاکنڈ وغیرہ شامل ہیں، ان تمام مواقع پر شہر بھر کے علاوہ صدر کراچی کے تاجر حضرات نے بھی دل کھول کر حصہ لیا، ان کا تعاون جامع مسجد صالح صدر کے امام و خطیب ہونے کے ناطے حضرت شیخ عطاءؒ کے توسط سے جامعہ پہنچتا رہا، مگر کبھی آپ نے ان پیسوں کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، بلکہ اپنے پاس موجود ساتھیوں کے حوالہ کروا کر سیدھا محاسب جامعہ پہنچوا دیتے اور وصولی کی رسید ان معاونین تک پہنچوا دیتے۔

باہمی اعتماد کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھی کوئی قدم ایک دوسرے کے علم میں لائے یا مشاورت کے بغیر نہیں اٹھاتے تھے، یہ معاملہ گھریلو معمولی مسائل سے لے کر جامعہ کی عملی زندگی کے بڑے بڑے معاملات تک رہتا تھا۔ الحمد للہ! اس مشاورت کی خیر و برکت ہمیں ہر معاملے میں محسوس ہوئی اور کوئی ایسا معاملہ مجھے یاد نہیں ہے کہ جس میں مشاورت ہوئی ہو اور بعد میں پشیمانی کا سامنا ہوا ہو۔

جامعہ کی طرف سے جب ہمیں گھر ملے اور اہل خانہ کو جامعہ کی رہائش گاہوں میں لانے لگے تو اس سلسلے میں مشاورت کے علاوہ بعض دور اندیشانہ نصائح بھی فرمائے، مجھ سے فرمانے لگے کہ: ”ہم نے بڑی اخوت، محبت، اعتماد اور حسن ظن والی زندگی گزاری ہے، گھروں میں خواتین کے مسائل الجھتے

رہتے ہیں، ہمارا پڑوس بھی ہوگا (دونوں گھر آمنے سامنے ہیں) اور خواتین کا باہمی میل جول بھی رہے گا، ہمیں یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ خدا نخواستہ عورتوں کے معاملات کی وجہ سے ہماری شیریں رفاقت میں کہیں تلخی نہ آنے پائے۔ الحمد للہ! گھریلو زندگی میں اس فکر کو ہم دونوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اسی فکر کے مطابق اپنے بیوی بچوں کی تربیت کی، جس کی بدولت الحمد للہ! ہم اس طویل عرصہ میں سرخرو رہے، ہماری طرح ہمارے بیوی بچوں کے درمیان بھی کبھی کسی قسم کی رنجش یا بد مزگی محسوس نہیں ہوئی، فالحمد للہ علی ذلک۔

شیخ عطاء الرحمن شہیدؒ کا مزاج ایک طرف انتہائی نازک اور حساس تھا، مگر دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ ہر معاملے میں جوڑ اور ربط پر زور دیتے تھے، بالخصوص جامعہ اور وفاق المدارس کے قابل مشورہ مسائل میں ہمیشہ اپنا وزن اس پلڑے میں ڈالتے تھے جس میں جوڑ اور اجتماعیت کی شکل نکلتی ہو، وفاق کے معاملات میں اگر کوئی معترض بن کر آتا تو اسے یہی جواب دیتے کہ: ”وفاق“ کیا ہے؟ وفاق ہمارے اور آپ کے مدرسہ کا نام ہے، اس پر اعتراض کی بجائے اپنا مدرسہ سمجھ کر اس کی بہتری اور ترقی کے لئے مفید مشورے اور تجویز دیں، اپنے آپ کو وفاق کا فریق ثابت نہ کریں، بلکہ رفیق ثابت کریں۔

شیخ عطاءؒ کی یہ گفتگو شہادت والے جمعہ سے پہلے جمعرات کے دن مختلف مواقع پر ہوتی رہی، پھر اسی رات کو تقریباً گیارہ بجے تک جاری، یہ ہماری طویل نشستوں میں آخری نشست تھی، جس میں اتفاق سے وفاق المدارس ہی کے بعض موضوعات زیر مشورہ تھے، کیونکہ آپ کے سفری پروگرام میں وفاق کی امتحانی و نصابی کمیٹی میں شرکت بھی شامل تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وفاق المدارس کے حوالہ سے اپنے اس مزاج کے برعکس اعتراضات پر اعتراضات کرنے لگے اور میں وفاق کے دفاع میں دلائل دیتا رہا، گفتگو کے آخر میں فرمانے لگے کہ: میں وفاق پر اعتراض نہیں کر رہا تھا، بلکہ آپ سے ان اعتراضات کے جوابات نکوانا چاہتا تھا اور میرا مقصد پورا ہو گیا، الحمد للہ! مجھے ”وفاق“ کے حق میں مناسب مواد مل گیا جو بر موقع استعمال کر سکوں گا، ان شاء اللہ!۔

بہر حال یہ ان کا بڑا پین اور اجتماعیت آمیز فکر کا مظہر تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمیشہ شرف اجتماعیت سے نوازے رکھے، آپس میں جوڑ کا ذریعہ بنائے، توڑ کا باعث نہ بنائے۔ آمین

۱۹/۱۱/۲۰۱۲ء کی شب جمعرات کو اسی مجلس کے اختتام پر فرمانے لگے کہ: ”کل میرا چونکہ سفر ہے اور میرے پاس کچھ امانتیں ہیں، مجھ پر ان امانتوں کا سخت بوجھ ہے، آپ وہ وصول کر کے متعلقہ حضرات تک پہنچانے کا انتظام کر دینا“۔ چنانچہ ایسا ہی کیا، وہ امانتیں اور ان کی تفصیلات میرے حوالے کرتے ہوئے یہ نشست اختتام پذیر ہوئی، اب میں سوچتا ہوں کہ یہ تکوین کا معاملہ تھا یا کشف کا نتیجہ کہ شیخ عطاءؒ اس آخری ملاقات میں میری کئی باتوں کا بوجھ اپنے ساتھ لے گئے اور اپنی کئی امانتوں کا بار گراں میرے ناتواں کندھوں کے لئے چھوڑ کر مکینِ خلد بریں جا ٹھہرے، فیغفرہ اللہ ولنسا مغفرة ظاهرة و باطنہ۔

شیخ عطاءؒ کی زندگی جس طرح اخوت، محبت اور اعتماد کا مرقع تھی، اسی طرح آپ کی رحلت و شہادت کا تذکرہ بھی آپ کی اخوت و محبت کے دوہم سفروں کے بغیر پورا نہیں ہوتا جب بھی آپ کی شہادت کی داستان چھڑتی ہے، آپ کے ساتھ آپ کے دنیا و آخرت کے ہم سفر عزیز القدر مولانا مفتی محمد عرفان حمید میمن شہیدؒ اور آپ کی ہمیشہ محترمہ شہیدہؒ کا تذکرہ بھی ضرور کیا جاتا ہے، یہ تذکرہ صرف تذکرہ کی حد تک نہیں، بلکہ دعاء اور ایصالِ ثواب میں شرکت کے لئے بھی ہے، یہ ان دونوں ہم سفر مرحومین کے شیخ عطاءؒ کے ساتھ تعلق کا اولین ظاہری فائدہ ہے کہ آپ کے سینکڑوں رفقاء ہزاروں شاگرد جب بھی شیخ عطاءؒ کے لئے دعاء و ایصالِ ثواب کریں گے، وہ لازماً آپ کی ہمیشہ مرحومہ کے بچوں، ساس، سر، شوہر، بلکہ جملہ خاندان کے لئے اور برادرِ محمد عرفان شہیدؒ کے خاندان کے لئے تسلی کا ذریعہ بھی ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر ان دونوں مرحومین کا وقت مقررہ کسی اور بہانے سے شیخ عطاءؒ کے علاوہ پورا ہو جاتا تو شاید اس قدر دعا اور ایصالِ ثواب کا سلسلہ جاری نہ ہوتا، ان دونوں مرحومین کی خوش قسمتی یہ بھی ہے کہ جو بھی عالم یا طالب علم شیخ عطاءؒ کی قبر پر دعاء اور ایصال کے لئے حاضری دے گا، وہ ان دونوں مرحومین کی قبروں پر بھی ضرور حاضر ہوگا اور ان کی مغفرت اور رفع درجات کی دعاء ضرور کرے گا اور یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر ذی روح نے مرنا ہے اور مسلمان کو مرنے کے بعد نفع پہنچانے والی چیز یہی دعاء و ایصالِ ثواب ہے، اس لئے ان دونوں مرحومین کے خاندان والوں کو اس جدائی کے فطری رنج و الم کے ساتھ اس قابل رشک موت پر اطمینان اور تسلی بھی رکھنی چاہئے، اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر جمیل اور اجرِ جزیل عطا فرمائے، آمین۔

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)



سانحہ فاجہ

لمحہ بہ لمحہ صورتحال، احساسات و تاثرات

حضرت مولانا انعام اللہ صاحب
ناظم تعلیمات و استاذ الحدیث جامعہ محمدیہ اسلام آباد



۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بمطابق ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بروز جمعہ تقریباً پانچ بجے بوقت عصر موبائل فون اٹھایا اور جناب مفتی محمد عرفان حمید میمن صاحب کا نمبر تلاش کرنے لگا، تاکہ جان سکوں کہ کیا کراچی سے بھوجا ایئر لائن کی اسلام آباد روانگی بروقت ہے؟ اچانک خیال آیا کیوں نہ لالہ جی سے براہ راست بات کروں؟ اور انہی سے روانگی کا وقت معلوم کروں؟ شاید تبدیلی خیال وارادہ میں دست قدرت اس لیے کارفرما ہوا کہ درحقیقت کراچی ایئر پورٹ سے مسافروں کی روانگی اسلام آباد کے لیے نہیں تھی، بلکہ سفر آخرت پر روانگی تھی، اور قدرت کو منظور تھا کہ میری آخری بات چیت لالہ جی سے ہوجن کی شفقت و محبت کے باوجود ہمیشہ مجھ پر ان کی شخصیت کا رعب حاوی رہتا اور ضرورت کے بغیر ان سے بات کرنے کی جرات نہ کر پاتا۔ اسپڈ ڈائل سے ان کا نمبر دبا یا جو میرے موبائل میں نمبر ایک پر تھا، حسب عادت فوراً فون اٹھایا اور سلام مسنون کے بعد خود ہی فرمایا: ہم جہاز میں بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے پھر بھی پوچھا، کیا جہاز بروقت پرواز کرے گا؟ فرمایا بظاہر تو بروقت ہی پرواز کرے گا اور ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔ اس مختصر بات چیت کے بعد فون بند کر دیا۔ کیا معلوم تھا کہ آپ کا یہ فون ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگا۔ نماز عصر سے فراغت کے بعد دونو جوان علماء کرام قریب کی ایک مسجد سے ملنے کے لیے تشریف لائے، ان میں سے ایک عالم دین کا تعلق ”کہوئی برمول“ نامی گاؤں سے تھا جو ہمارے گاؤں ”بابوزی“ کے قریب ایک بڑا قصبہ ہے، اسی علاقائی تعلق کی بنیاد پر وہ صاحب ملنے تشریف لائے تھے، برادر مریم جناب مولانا حفظ الرحمن صاحب، جامعۃ الامام ابوحنیفہ آئی نائن فور سے تشریف لائے۔ طے یہ تھا کہ جناب مولانا حفظ الرحمن صاحب ایئر پورٹ پر استقبال کے لیے جائیں گے۔ دونوں مہمان علماء کرام کے ساتھ تعارف کے بعد گفتگو کا رخ غیر اختیاری طور پر ”کہوئی برمول“ سے تعلق رکھنے والے اکابر علماء کرام رحمہم اللہ کے حالات و واقعات اور ان کے علمی مقام اور خدمات کے تذکرہ کی طرف مڑ گیا، بالخصوص شیخ الحدیث حضرت مولانا امین گل باباجی رحمہم اللہ کا تذکرہ کثرت سے ہوا۔ میں نے مہمانوں سے عرض کیا کہ امین گل باباجی دارالعلوم شیرگڑھ، ضلع مردان میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے، ان سے ہمارے نانا (باباجی رحمہم اللہ) کے دیرینہ مراسم تھے۔ قد کاٹھ، ظاہری شکل و صورت، سر، آبرو اور ڈاڑھی کے سفید بالوں میں شدید مشابہت، سفید عمامہ و سفید لباس پہننے کی عادت، علمی وجاہت کے اعتبار سے یوں لگتا تھا، جیسے جڑواں بھائی ہوں۔ اسی تعلق کی بنیاد پر میرے ماموں زاد بھائی مولانا عطاء الرحمن صاحب، استاذ الحدیث و ناظم تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، جب ۱۹۷۶ء میں اپنے آبائی گاؤں میں میٹرک تک اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو باباجی نے انہیں دارالعلوم شیرگڑھ، مردان میں دینی تعلیم کے حصول کی غرض سے داخل کرایا۔ ایک سال تک امین گل باباجی کے ساتھ ہی کمرے میں رہائش پذیر رہے، ان کی تربیت سے فیض یاب ہوتے رہے اور ان کی خدمت کی سعادت بھی حاصل کرتے رہے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا! عجیب اتفاق ہے کہ امین گل باباجی کے گاؤں سے تعلق کی بنیاد پر ہم ان کا تذکرہ کر رہے ہیں اور ان کے شاگرد رشید مولانا عطاء الرحمن صاحب اس وقت کراچی سے اسلام آباد کی طرف محو پرواز ہیں، اور تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہ یہاں اسی کمرے میں تشریف فرما ہوں گے، جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ امین گل باباجی کے حالات کے تذکرہ میں اس بات کا بھی ذکر آیا کہ جب ان کا انتقال ہوا تو نماز جنازہ پر بڑی خلقت جمع تھی، اس علاقہ کی تاریخ میں اتنا بڑا جنازہ کسی اور شخصیت کا نہیں ہوا، اور جب گاؤں کے لوگوں نے اتنا بڑا ہجوم دیکھا تو تعجب کرنے لگے، اور کہنے لگے کہ ہم تو اس شخص کو ”امین گل“ ہی سمجھتے رہے یہ تو آج معلوم ہوا کہ یہ تو ”شیخ الحدیث حضرت مولانا امین گل باباجی صاحب“ ہیں جو ہزاروں لوگوں کے استاد اور ان کی شخصیت ہزاروں لوگوں کی عقیدت کا مرکز ہیں۔ ہم یہی گفتگو کرتے رہے اور اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ چند ساعتوں کے بعد تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے۔ امین گل باباجی کے شاگرد رشید، فیض یافتہ اور مزے لے لے کر باباجی کی باتیں سنانے والے لالہ جی (مولانا عطاء الرحمن صاحب) اپنی ہمشیرہ اور اپنے رفیق سفر و حضر اور اب رفیق سفر آخرت و رفیق مزار جناب مفتی محمد عرفان حمید میمن صاحب کے ساتھ آئی۔ ایٹ، فور، اسلام آباد کی جامع مسجد ابوبکر سے ملحق گھر میں اپنی آمد کے منتظر اپنے خالہ زاد بھائی، بہنوئی، سالے، شاگرد اور تربیت یافتہ (راقم انعام اللہ) اور اپنی بہن، بھانجیوں اور اپنے برادر خور مولوی حفظ الرحمن صاحب کے پاس تشریف لانے والے نہیں، بلکہ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد سفر آخرت پر جانے والے ہیں اور فضا ہی

میں جان جان آفرین کے حوالہ کرنے والے ہیں اور آئندہ کل بروز ہفتہ عین اسی وقت ۳۰-۶ بجے شام جب ان کے شاگردوں، عقیدت مندوں اور گاؤں علاقے کے باشندوں کا جم عفران کی نماز جنازہ میں شرکت کرے گا، تو اہل علاقہ استاد کی طرح شاگرد کے بارے میں بھی زبان حال و قال دونوں سے گویا ہوں گے کہ ”ہم تو شہید کو ”عطاء الرحمن“ ہی سمجھتے رہے، ہمیں کیا معلوم تھا کہ عطاء الرحمن اتنا بڑا آدمی تھا اور اس بڑائی و عظمت اور بام عروج پر فائز ہونے کے باوجود بمصداق دعائے نبوی ”اللہم اٰحِبِّیْ مِسْکِیْنًا وَاَمْتِیْ مِسْکِیْنًا وَاَحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاکِیْنِ“ خاک ساروں اور مسکینوں والی زندگی گزارتا رہا، اور کسی لمحے بھی زبانی یا طرز معاشرت کے ذریعے اپنے عظیم المرتبت ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔“ چنانچہ تعزیت کے دوسرے دن ہمارے پڑوسی، مقتدی اور گاؤں کے ناظم جناب عنایت خان صاحب نے انہی الفاظ میں راقم سے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کیا۔ گویا وہ بزبان شاعریوں کہہ رہے تھے۔

غربت میں جا کے چمکا گم نام تھا وطن میں

بہر حال ان دونوں علما کرام سے بات چیت کے دوران میرے ذہن میں مسلسل کراچی سے تشریف آوری کرنے والے مہمانوں کی آمد، اور نماز فجر کے بعد گاؤں کے لیے روانہ ہونے کی ترتیب کی فکر گھومتی رہی، اور میں مسلسل باہر کی طرف کھلنے والے روشن دان سے موسم کی تبدیلی کا مشاہدہ کرتا رہا، اور نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا، کہ اندھیرا چھا رہا ہے، تیز ہوا چل رہی ہے اور بارش شروع ہونے والی ہے۔ علما کرام کے رخصت ہونے کے بعد تقریباً ۱۵:۶ پر میں نے برادر دم جناب مولانا امداد اللہ صاحب کا فون نمبر ملایا اور سلام مسنون کے بعد عرض کیا کہ اسلام آباد کا موسم انتہائی خراب ہے، کہیں جہاز کا رخ لاہور یا پشاور کی طرف نہ موڑا جائے۔ میں زبان سے تو اس اندیشے کا اظہار کر رہا تھا لیکن غیر شعوری طور پر جہاز کو حادثہ پیش آنے کا خیال بھی آیا، اور ڈیڑھ سال پہلے پیش آنے والا ایئر بلو کا حادثہ یاد آیا، تاہم زبان سے اس اندیشے کے اظہار کی جرات نہ کر سکا، کہ اس تصور ہی سے جسم کا نپ اٹھتا تھا، اور دل کو تسلی دینے کے لیے خود ہی ان خیالات کو اندیشہ دور، ازکار قرار دیتا رہا۔ برادر دم جناب مولانا امداد اللہ صاحب نے میری پریشانی کا اندازہ لگا کر تسلی دی اور فرمایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں اس طرح کے موسمی حالات میں بھی جہاز اتر جاتا ہے، فون بند ہو گیا، اسی اثناء میں برادر دم جناب مولانا حفظ الرحمن صاحب ایئر پورٹ مہمانوں کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے، تاہم مجھے مسلسل پریشانی لاحق رہی، اور دل ہی دل میں کھٹکا لگا رہا کہ کہیں کچھ ہونہ جائے۔ میں نماز مغرب کے لیے تیاری کرنے لگا، ۶:۴۶ پر اذان مغرب کے بعد نماز پڑھانے کے لیے مسجد جانے لگا، تو گھر کی سیڑھیاں گیلی دیکھ کر خیال آیا کہ شاید کھڑکیوں میں سے بارش کا پانی بہہ آیا ہے، لیکن جب مسجد سے ملحق کمرہ میں سے گزرنے لگا تو دیکھا کہ تینوں بچیاں اپنی والدہ سمیت پونچھا لگانے اور کمرے کی صفائی میں مشغول ہیں۔ تب مجھے خوش گوار تعجب ہوا کہ (عن قریب ناقابل بیان صدمے سے دوچار ہونے والی) بھانجیاں اور بہن خلاف معمول عین نماز مغرب کے وقت آندھی اور بارش کے موسم میں گھر کی صفائی ستھرائی میں اس لیے مشغول ہیں کہ ان کے عظیم بھائی و مشفق ماموں جان، معصوم بہن و شفیق خالہ اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کرنے والے محبوب مہمان کراچی سے تشریف لانے والے ہیں۔ میں مغرب کی نماز پڑھاتا رہا اور نماز میں توجہ برقرار رکھنے کے لیے اس خیال سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا رہا، کہ رشتے کس قدر مقدس ہوتے ہیں جو انسان کے اندر تعظیم و احترام، الفت و محبت اور اعزاز و اکرام کی وہ روح پھونک دیتے ہیں جس کی بدولت ناتواں و کمزور جسم بھی اپنے آرام و راحت کے خیال کو ایک طرف رکھ کر مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے بیک وقت کچن میں آگ کی گرمائش کی تیش بھی سہہ رہے ہوتے ہیں، بے وقت گھر کی صفائی ستھرائی کی مشقت بھی برداشت کر رہے ہوتے ہیں اور عین اسی وقت فریضہ الہیہ کی ادائیگی کی فکر بھی دامن گیر رہتی ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ میرے تعجب کی وجوہات وہ نہیں تھیں جو میں سوچ رہا تھا، بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ جن کی آمد کا انتظار تھا اور جن کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہ تو ۶:۴۰ پر اوپر جو فضاؤں میں ہی حقیقی اور ابدی گھر کی طرف رخ موڑ چکے تھے، اور ان کے اجسام ظاہری ہوائی پرواز کی بلندیوں سے نیچے آ کر چکلا لہ ایئر بیس کے قریب حسین آباد نامی بستی کے کھیتوں اور گھروں میں لاشوں اور اعضاء کی شکل میں بکھرے پڑے تھے۔

ناقابل برداشت تکلیف اٹھانے والے اجسام کی سواریاں، یعنی ارواح، ایسی حقیقی پرواز کر چکی تھیں کہ اگر اس کے لیے ایک مرتبہ اوپر جانا مقدر ہو، تو اعلیٰ علیین پہنچ کر ہی دم لیتی ہیں، اور پھر زمین کی پستیوں کی طرف آنا ان کے لیے ناممکن رہتا ہے، اور ہمیشہ کے لیے بلندیوں پر ہی رہتی ہیں۔ اور جب موت کا سبب بھی فضائی حادثہ ہو، جس کی شدت بیان کرنے کے لیے ”درناک“، ”کرب ناک“، ”الم ناک“ جیسے درد بھرے الفاظ بھی ناکافی ہوتے ہیں، تو ایسی ارواح کا بلندیوں کی بلندی (اعلیٰ علیین) پر مزید بلندیوں پر جا کر اڑائیں بھرنے کو تو زبان نبوت نے ان مبارک الفاظ میں بیان فرمایا ہے (أرواحهم فی جوف طیر خضر، لها قنادیل معلقة بالعرش، تسرح من الجنة حیث شاءت) (صحیح مسلم) (شہداء کی ارواح سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹ

میں ہوتی ہیں، ان کے لئے عرش کے نیچے لٹکے ہوئے قنادیل ہوتے ہیں، حسب منشاء جنت میں چر رہے ہوتے ہیں) گویا اجسام اپنی دنیاوی پرواز ختم کر چکے تھے، اور ارواح حقیقی پرواز پر مجبور وارتھیں، بزبان شاعر

لَبَّی قِضَاءَ اللَّهِ فِي وَهَجِ السَّمَاءِ بَيْنَ الْغَمَامِ مَقْدَرًا بِجِزَائِهِ

شہید نے چمکتے آسمان میں بادلوں کے درمیان تقدیری فیصلہ کے مطابق حکم خداوندی پر لبیک کہ دیا

فِي أَسْفَى عَلَى شَيْخِ كَرِيمٍ أَتَاهُ الْمَوْتُ فِي جَوْ السَّمَاءِ

ہائے افسوس! عزت و تکریم والے شیخ (عطاء) کو آسمانی فضاؤں میں موت نے اپنی آغوش میں لے لیا

بہر حال نماز مغرب سے فارغ ہو کر میں جلدی جلدی جامعۃ الامام چلا گیا تا کہ مہمانوں کے گھر پہنچنے تک سبق پڑھا سکوں۔ ابھی میں درجہ اولیٰ کی درس گاہ میں بیٹھا ہی تھا، اور ایک طالب علم نے صرف کی گردان سناتے ہوئے ”تآلف يتآلف“ کے الفاظ زبان سے نکالے ہی تھے، کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی، برادرِ جناب مولانا حفظ الرحمن صاحب پریشانی کے عالم میں کہہ رہے تھے، کہ ۷ بج گئے اور ابھی تک ان کے فون بند آ رہے ہیں۔ فون بند آنے کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں، جن سے دل کو بہلایا جاسکتا تھا، لیکن معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ جس حادثے کے تصور سے جسم کا نپ اٹھتا تھا اور دل و دماغ ماؤف ہو جاتے تھے اور جس کو شیطانی وساوس و خیالات کہہ کر ہم دفع کرتے تھے، آج وہ حادثہ ہو ہی گیا۔ میں انتہائی پریشانی کے عالم میں فوراً درس گاہ سے اٹھا اور باہر آنے لگا کہ دوبارہ جناب مولانا حفظ الرحمن صاحب نے فون پر بتایا کہ ایئر پورٹ پر لوگ عجیب کیفیت سے دوچار ہیں، ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں، ایئر لائن والے مختلف باتیں کر رہے ہیں، کوئی کہہ رہا ہے کہ ہیلی کاپٹر گر گیا۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ جہاز ریڈار سے غائب ہے۔ اب تو یقین اور بھی پختہ ہو گیا تاہم مسلمان ہونے کے ناطے ایسے حالات میں واحد سہارے کے طور پر اپنانے والے طریقہ کو اختیار کیا۔ درجہ حفظ کے استاد محترم سے عرض کیا کہ حفظ و کتب کے تمام طلبہ کو ایک ساتھ بٹھا کر آیت کریمہ کا ختم شروع کرادیں۔ اس انتظام کے بعد میں وہاں سے آئی، ایٹ، فور اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا، اور غیر اختیاری طور پر بذریعہ فون گاؤں میں موجود برادرِ جناب احمد الرحمن صاحب پھر برادرِ جناب مولانا محمد شعیب صاحب اور برادرِ جناب حافظ احسان اللہ صاحب کو علی الترتیب اپنی زبان سے یہ جانکاہ خبر سنائی۔ اس وقت میں اس بات کو فراموش کر بیٹھا کہ ان عزیز واقارب کو ایک حادثہ فاجعہ کی خبر سنانے کے لیے میں اپنی زبان کو کیوں استعمال کر رہا ہوں؟ شاید میں غیر شعوری طور پر دوسروں کو شریکِ غم بنا رہا تھا اور اپنا غم کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ برادرِ جناب مولانا امداد اللہ صاحب کو فون ملا یا تو انہوں نے آہ و بکا کے ذریعہ خبر کی تصدیق کی، اور نیٹ پر چلنے والی پٹی پڑھ کر سنائی۔ جب میں گھر پہنچا تو دیکھا گھر کے افراد ابھی تک بے خبر ہو کر مہمانوں کی آمد کی تیاری اور نماز کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ ایک بچی فون سن رہی تھی، مجھے دیکھ کر کہنے لگی کہ عرفان صاحب کی اہلیہ سے بات ہو رہی ہے، وہ پوچھ رہی ہیں کہ ابھی تک ان کا فون نہیں لگ رہا ہے، کیا وجہ ہے؟ صبر کا دامن چھوٹ کر میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ ”اب ان کا فون ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند رہے گا“۔ میری زبان سے یہ نکلنا تھا کہ کھرام مچ گیا، میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف اہل خانہ کو صبر کی تلقین کرتا رہا۔ اور آیت کریمہ کا ورد کرنے کے لیے کہتا رہا، اور تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا کہ شاید اللہ تعالیٰ کسی طرح زندگیاں محفوظ رکھنے کا سامان کر دے، اور دوسری طرف صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ کیا ہوا۔ گاڑی میں بیٹھ کر دیوانہ وار جائے حادثہ کی طرف چل پڑا، حالانکہ مجھے یقین تھا، کہ ایسے حادثے کے وقت وہاں پہنچنا ممکن نہیں ہوگا۔ دوسری طرف جناب مولانا حفظ الرحمن صاحب بذریعہ فون حالات سے مطلع کرتے رہے۔ ٹریفک جام ہے، ابھی ہم کھیتوں میں جائے حادثہ کی طرف دوڑ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ، میں فیض آباد سے ہائی وے پر اترا ہی تھا کہ برادرِ جناب مولانا مفتی ابرار احمد صاحب کا فون آیا اور پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ میں اکیس نہیں، دکھ درد بانٹے اور حادثہ کے بعد کے مراحل طے کرنے کے لیے کئی ایک ہمدرد یہاں موجود ہیں۔ مفتی صاحب نے مجھے واپس آنے کے لیے کہا اور فرمایا کہ راستے بند ہیں، جائے حادثہ پر پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ چنانچہ میں آئی، نائن، فور میں واقع جامع مسجد فاروق اعظم پہنچا، جہاں مفتی صاحب بذریعہ فون لاشوں کی وصولی کے انتظامات کرتے ہوئے میرے منتظر تھے، گلے ل کر دونوں خوب روئے۔ مفتی صاحب میری ڈھارس بندھانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن خود بھی تسلی کے کلمات سننے کے متمنی تھے، ان کو بھی اس موقع پر ایک ایسے غم خوار کی ضرورت تھی کہ شریکِ غم ہو کر غم بانٹے۔ اس لیے کہ اگر میں مولانا کے قریبی عزیز ہونے کے ناطے صدمے سے دوچار تھا، تو مفتی صاحب بھی اپنے ایک شفیق و مخلص دوست اور بعض حوالوں سے ایک اچھے رفیق کا رہنے کے ناطے صدمے سے دوچار تھے۔

اسی اثناء دوئی سے مولانا کے چھوٹے بھائی برادرِ جناب مولانا لطف الرحمن صاحب کا فون آیا، پوچھنے لگے، اس خبر کی حقیقت کیا ہے؟ میں نے پھر احتیاط و صبر کے تمام تقاضوں کو ایک طرف رکھ کر اضطراری کیفیت میں مختصر جواب دیا کہ گھر کے تمام افراد سمیت ملک پہنچیں! بعد میں سوچتا رہا کہ میرے اس فیصلہ کن

اور دو ٹوک انداز کی وجہ سے ان پر کیا گزری ہوگی، وہ تو اس توقع سے فون کر رہے ہوں گے کہ میں ان کو خبر چھوٹی ہونے کی خوش خبری سناؤں یا پھر کم از کم تذریعاً ان کو حادثہ واقع ہونے کی اطلاع کروں۔ اس موقع پر پھر اس احساس نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ اسلام آباد میں موجود ہونے کی وجہ سے میری ہی زبان سے تمام عزیز واقارب و دوست احباب کو اس حادثہ فاجعہ کی خبر مل رہی تھی اور آئندہ جب کبھی بھی وہ اس حادثہ فاجعہ کا تصور کریں گے، یا اس کی کہانی کسی کو سنائیں گے تو میرا حوالہ دے کر کہیں گے کہ اس نے ہمیں اطلاع دی، یا خبر کی تصدیق کی تھی، لیکن حادثہ پیش آچکا تھا۔ ”ہونے کو انہوں نے نہیں کیا جاسکتا“، بزبان شاعر صورت حال یہ تھی۔

اَتَى نَبَأٌ عَظِيمٌ ذُو شُجُونٍ فَرَعَزَ غُلْنَا قَبْلَ الْعِشَاءِ

فَفِي الْغَبْرَاءِ وَالْخَضْرَاءِ صَجٌ وَضَوْضَاءٌ وَذَا وَقْتُ الْمَسَاءِ

عشاء سے پہلے غم و اندوہ والی بہت بڑی خبر آئی، جس نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ شام کے وقت زمین کی وسعتوں اور آسمان کی بلندیوں میں چیخ و پکار اور شور و غوغا پھیلیں۔

هَذَا لَعَمْرُ اللَّهِ سَاعَةٌ حَسْرَةٍ وَتَوَجُّعٍ أَلَمًا عَلَى لَأْوَائِهِ

بخدا یہی الم کرب اور افسوس کی گھڑی ہے جس کی شدت اور رنج و تکلیف مزید درد اور اذیت کی باعث بن رہی ہے ہمارے پاس ایک ہی راستہ تھا، تسلیم و رضا کا، صبر و حوصلے کا۔

فَإِنَّ اللَّهَ يَرْضَى عَنْ عِبَادٍ هُمْ رَاضُونَ حَقًّا بِالْقَضَاءِ

اللہ تعالیٰ دل سے قضاء و قدر پر راضی اور خوش رہنے والے بندوں سے راضی ہوتا ہے۔

فَإِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. اَللّٰهُمَّ اجْرِنَا فِيْ مُصِيبَتِنَا، وَاخْلِفْ لَنَا خَيْرًا مِنْهَا. اِنَّ لِلّٰهِ مَا اخَذَ، وَلَهُ مَا اَعْطٰى وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى“
دوسرا مرحلہ: (لاشوں کی شناخت):

اب حادثے کا دوسرا مرحلہ شروع ہو گیا، فون پر فون آنا شروع ہو گئے، کوئی خبر کی تصدیق کروانا چاہتا تھا، کوئی تعزیت کرنا چاہتا تھا، مکہ مکرمہ سے برادر م جناب مبین صاحب کا فون آیا، زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگے، حضرت! کیا ہوا؟ اب ذہن دوسرے مرحلے کی طرف منتقل ہوا تھا، یہ فکر دامن گیر ہوئی، کہ اس طرح کے فضائی حادثات میں لاشیں سالم نہیں رہتیں، ناقابل شناخت بن جاتی ہیں۔ ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ تو ہے، جب ایئر بلیو کے حادثے کے حوالے سے خبریں اخبارات نے چھاپی تھیں، اور زبان زد عام تھیں۔ ذہن میں فوراً یہ خدشات آنے لگے، کہ اگر لاشیں نہ ملیں، یا ملنے میں تاخیر ہو جائے تو کیا ہوگا؟ میں نے مبین بھائی کو تسلی دیتے ہوئے پوچھا، اس وقت آپ کہاں ہیں؟ کہنے لگے: میں بیت اللہ شریف کے بالکل سامنے مطاف میں کھڑا ہوں۔ میں نے عرض کیا، آپ حوصلہ رکھیں، بیت اللہ شریف کا طواف شروع کیجیے اور دعا کیجیے، کہ لاشیں محفوظ ہوں، اور آسانی سے شناخت ہو جائے، اور بروقت مل جائیں۔ نیز بیت اللہ شریف میں اس وقت موجود مولانا کے دیگر شاگردوں، متعلقین اور دوست احباب سے بھی یہی گزارش کیجیے۔ نماز عشاء کے بعد پنڈی اسلام آباد کے علماء، دوست احباب اور گاؤں کے لوگوں کی تشریف آوری کا سلسلہ شروع ہو گیا، یہ حضرات ہم سے تعزیت کرنے تشریف لائے تھے، لیکن خود بھی تعزیت کے محتاج تھے، تشریف لانے والے حضرات کی تعداد کو دیکھ کر فیصلہ کیا گیا کہ گھر والے کمرے کی بجائے مسجد کے ہال میں بیٹھا جائے۔ تعزیت کرنے والوں کا جم غفیر دیکھ کر ہمیں حوصلہ مل رہا تھا، اور اس بات کا احساس بڑھ رہا تھا کہ اس غم میں رشتہ دار ہونے کے ناطے ہم اکیلے نہیں، بلکہ دیگر لوگ بھی ہمارے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ اس احساس کی بدولت غم برداشت کرنے کا حوصلہ مل رہا تھا، لیکن دوسری طرف یہ احساس ہونے لگا کہ واقعی بہت بڑا سانحہ ہے، جب ہی تو اتنی بڑی تعداد میں علماء حضرات تشریف لا رہے ہیں۔ اسی اثناء میں ایک اور تکلیف دہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑا، گاؤں سے چھوٹے بھائی برادر م جناب حافظ احسان اللہ صاحب کا فون آیا کہنے لگے: ماما جی صاحب (مولانا شہید کے والد محترم) سے بات کریں، لیکن ان کو صورتحال سے آگاہ نہ کریں۔ میں نے عرض کیا، یہ کیسے ممکن ہے؟ ان کو تو بات کی تہ تک پہنچنے کی عادت ہے۔ اصل صورتحال سے بے خبر رکھ کر ان کو کیسے بہلایا جاسکے گا؟ بھائی کے جذبات بے قابو ہوئے، اور فون ماموں کے حوالے کر دیا، روتے ہوئے خیف آواز میں پوچھا، انعام اللہ! عطاء الرحمن لوگوں کا کیا بنا؟ پہنچ گئے ہیں؟ تو ریہ عرض کیا، جہاز لیٹ ہو گیا ہے! اور واقعاً لیٹ تھا، لیکن کراچی ایئر پورٹ سے نہیں، وہ تو لالہ جی نے فون پر کہا تھا کہ بظاہر جہاز کی روانگی بروقت ہے، بلکہ اسلام آباد ایئر پورٹ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر۔ اور ظاہر بینوں کی نظر میں لیٹ ہے، اب کبھی نہیں پہنچے گا، جب کہ حقیقت کی آنکھ کا مشاہدہ یہ تھا کہ سب کچھ بروقت ہوا ہے، کوئی چیز ذرا برابر آگے پیچھے نہیں ہوئی ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ اور: ﴿فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ ماموں نے اپنی افتاد طبع کے مطابق اگلا سوال کیا ”ریڈیو کی خبروں میں تو بتایا کہ جہاز کریش ہوا ہے“ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا، صبر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، جذبات کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ بعد میں ماموں نے فرمایا کہ آپ لوگ

تو مجھے صورتحال سے بے خبر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے، جب کہ میں نے آٹھ بجے کی خبروں میں جہاز کریش ہونے کی خبر سنی تھی، اور نوبے کی خبروں میں تو ان کے نام بھی سن لیے تھے اور ریڈیو والے تو میرے بچوں کے وہی نام لے رہے تھے جو میں نے پیدائش کے وقت رکھے تھے۔ یہاں پھر اس تصور نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ الہی یہ کیا ہوا؟ لالہ جی نے تو وفاق المدارس کی میٹنگ میں شرکت کے لیے ملتان تشریف لانا تھا، گاؤں آنے کا پروگرام تو محض اس لیے بنایا کہ اپنے ۸۲ سالہ سن رسیدہ، بیمار و نحیف حاجی (والد محترم) اور ضعیف امثال (والدہ محترمہ) کی زیارت اور عیادت ہو جائے تاکہ ان کو خوشی ہو، کسے معلوم تھا کہ ان کا یہ سفر پیام موت ثابت ہوگا۔

جوں ہی کمپلیکس ہسپتال، اسلام آباد میں لاشیں پہنچنے کی اطلاع ملی، تمام احباب کے ساتھ ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ میں اپنے دفتر کے رفیق کار جناب افتخار احمد صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا، جوں ہی گاڑی شاہراہ فیصل پر داخل ہوئی، فون کی گھنٹی بجی، مولانا شہیدؒ کے ہم سبق اور مدرسہ تعلیم الاسلام گلشن عمر شاخ جامعہ بنوری ٹاؤن کے مدرس جناب مولانا یسین صاحب تسلی دیتے ہوئے فرما رہے تھے ”دو سال قبل میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو یاد کریں، کہ جب میرے خاندان کے سارے افراد حادثے کا شکار ہوئے“۔ حضرت مولانا محمد زبیر منجور صاحب، حضرت مولانا قاری محمد قاسم صاحب، اساتذہ جامعہ نے تسلی آمیز کلمات کے ذریعہ غم ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ آخر میں استاد محترم حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب مدظلہ العالی نے مولانا شہیدؒ کے علمی مقام، دین داری و دیانت داری، جامعہ کے ساتھ والہانہ وابستگی، تن من دھن کو تشنگان علوم دینیہ کی خدمت کے لیے وقف کرنے، اکابر اساتذہ کے ساتھ عقیدت، تعظیم و احترام کے جذبات اور رفقاء کار کے ساتھ شفقت و محبت پر مبنی تعلق کے حوالے سے فون پر ہی اپنے مخصوص انداز میں جامع تبصرہ کیا اور ارشاد فرمایا اسی کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس شان سے شہادت کے مقام پر فائز کیا۔ سانحہ کی شدت بیان کرتے ہوئے اس کو جامعہ کے اساتذہ، طلبہ، تمام اہل علم، عوام الناس، عزیز واقارب کے لیے ایک عظیم اور ناقابل برداشت صدمہ قرار دیا، اور صبر کی تلقین فرمائی۔ استاد محترم کی طرف سے صبر کی تلقین، ہم سب کے لیے حکم کے درجے میں تھی، اور تسلیم و رضا کا تقاضا بھی یہی تھا، تاہم کان استاد محترم کی گفتگو سننے میں محو تھے اور آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ ان محترم اساتذہ جامعہ نے فون اس لیے کیا تھا، کہ تعزیت کریں، ہمیں حوصلہ دیں، تسلی آمیز کلمات کے ساتھ ہمارے غم کو ہلکا کریں، لیکن میں ان کی گفتگو سن کر رویا، اور بلک بلک کر رویا، یہاں تک کہ جناب افتخار احمد صاحب دائیں ہاتھ سے گاڑی کا اسٹیرنگ تھامے ہوئے اور بائیں ہاتھ سے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے مجھے اس انداز میں خاموش کر رہے تھے، جیسے روتے ہوئے چھوٹے بچے کو خاموش کرایا جاتا ہے۔ اور اس وقت تو انتہا ہو گئی، اور کیچہ منہ کو آنے لگا، جب میں نے استاد محترم کو بتایا، کہ اس وقت لاشیں وصول کرنے کے لیے ہسپتال جا رہے ہیں۔ لاشیں وصول کرنے؟ الہی یہ کیا ماجرا ہے؟ ابھی تو نماز مغرب کے وقت ہنستے ہستے انسانوں کے استقبال کے لیے ایئر پورٹ جا رہے تھے، اور ابھی ان کی لاشیں وصول کرنے جا رہے ہیں، اور لاشیں بھی ان لوگوں کی کہ۔

کیا خوب پسند تھی تیری اے داعی اجل
تو نے پھول ہی وہ چنا جس نے باغ کو ویراں کر دیا

ہسپتال پہنچے، ایمبولینس آ رہی تھیں، لاشیں اتاری جا رہی تھیں، لاشیں کیا تھیں؟ برخوردارم لطف اللہ نے پہلے ہی آہ و بکا کرتے ہوئے بذریعہ فون بتلایا تھا کہ یہ تو لاشیں نہیں ہیں بلکہ انسانی اعضاء ہیں، جو چادروں اور بور یوں میں لائے جا رہے ہیں۔ سینیٹر جناب طلحہ محمود صاحب تشریف لائے، مولانا فضل الرحمن صاحب، قائد جمعیت نے حادثے کے بعد کے مراحل میں ہماری مدد کے لیے اُن کی ذمہ داری لگائی تھی۔ اُن کی مدد سے ہم لاشوں والی جگہ میں با آسانی پہنچ گئے، زندگی میں پہلی بار اتنی کثیر تعداد میں انسانی لاشوں اور اعضاء کے درمیان اپنے آپ کو دیگر احباب سمیت پایا، جس صورتحال اور نقشہ کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، اور جس کے تصور سے جسم پر لرزہ طاری ہوتا ہے، اور دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں، ہم اور دیگر شہداء کے ورثاء، اور اعزاء و اقرباء اس سے دوچار تھے۔ اب یہ ایک زمینی حقیقت تھی کہ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں یا پھر انسانی اعضاء تھے، اور ان کے درمیان اعزہ و اقرباء گھومتے ہوئے ایک ایک لاش کو دیکھ رہے تھے، اور اپنے پیاروں کو تلاش کر رہے تھے۔ ہسپتال کا عملہ، نادرا کا عملہ اور فلاحی اداروں کے کارکن لاشوں کو ترتیب سے رکھنے، پوسٹ مارٹم کرنے، فنگر پرنٹس لینے اور لاشوں کو تابوتوں میں رکھنے کا بندوبست کر رہے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہاں پہنچ کر آنسو ٹھم گئے، رونے اور آہ و بکا کا نام و نشان نہیں رہا۔ سوائے ایک خاتون کے، جو کسی طرح اندر آئی اور اپنے پیارے کو دیکھ کر آہ و بکا کرنے لگی۔ تب خیال آیا کہ خواتین کو اس منظر کا مشاہدہ نہیں کرانا چاہیے، معاً یہ بھی خیال آیا کہ انسان کتنا سخت جان ہے، جب ہی تو دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ جناب مولانا نعیم اللہ صاحب مدرس جامعہ اسلامیہ راولپنڈی، آگے آگے لاشوں سے کپڑا اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے، ایک لاش کو دیکھا، دوسری کو دیکھا، تیسری کو دیکھا، میں ان لاشوں کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، اس وقت رشتہ داروں میں سے میں ہی تھا، مفتی عرفان صاحبؒ کے چہرے کا واحد شناسا بھی میں ہی تھا۔ مولانا نعیم اللہ صاحب ذرا آگے چلے گئے، پھر مجھے بلوایا، کپڑا اٹھا کر کہنے لگے یہ دیکھئے، استاد جی کی لاش تو نہیں؟ میں نے لاش دیکھی، غور کیا، تلووں، ایڑیوں،

انگلیوں اور ناخنوں کو دیکھا، پیروں کو دیکھا، جو پیچھے کی طرف اس انداز سے مڑے ہوئے تھے، جیسے قعدے کی حالت میں ہوں، دونوں ہاتھوں کو دیکھا، جو سینے پر اس انداز سے پڑے ہوئے تھے، جیسے قیام میں باندھے ہوں، اور آخر نماز کا انداز کیوں نہ ہو، تَمُوتُونَ كَمَا تُحْيَوْنَ پیغمبر صادق ﷺ کے سچے اور مبارک کلمات ہیں، مولانا شہیدؒ نے چند گھنٹے پہلے توجعۃ المبارک کی نماز سے پہلے تقریر کی تھی، موت کی تیاری کے لیے نوجوانوں کو متوجہ فرمایا تھا، خطبہ پڑھا تھا، پھر نماز پڑھائی تھی، سفید لباس اور کالی واسکت زیب تن کیے ہوئے، مسجد ہی سے سیدھے ایئر پورٹ تشریف لائے تھے، عصر کی نماز کراچی ایئر پورٹ پر پڑھی تھی، مغرب کی تیاری کر رہے ہوں گے، ضرور بالضرور ذہن میں یہ ہوگا کہ ایئر پورٹ پر ہی مغرب کی نماز پڑھیں گے، آخر پوری زندگی نماز و عبادات کی ادائیگی کی تلقین کرتے ہوئے گزاری تھی۔ وضو کی حالت میں جمعہ کے دن مغرب کی اذان سے پانچ منٹ پہلے مبارک وقت میں فضا میں شہادت کی موت ملی، حدیث کا پہلا حصہ دنیا میں صادق آیا، لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا۔ دوسرا حصہ وَتُحْيَوْنَ كَمَا تَمُوتُونَ آخرت میں ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور صادق آئے گا۔ پھر چہرے کو دیکھا، جس چہرے پر ہر وقت اپنائیت کے آثار اور مسکراہٹ چھائی رہتی تھی، اب وہ چہرہ ذرا سو جا ہوا تھا، میں نے تصدیق کی کہ یہ استاد جی کی ہی لاش ہے۔ بعد میں میرے خالہ زاد اور مولانا کے پھوپھی زاد بھائی برادر مولا نا عتیق الرحمن صاحب گاؤں سے تشریف لائے، انہوں نے دیکھتے ہی کہا، یقینی طور پر یہ اُن ہی کی لاش ہے، دیگر لاشوں کے متعلق تفتیش جاری رہی، لاشوں کی شناخت میں دقت پیش آنے کی وجہ سے اس شدید غم اور دکھ کی حالت میں ہمارے لیے مولانا شہیدؒ کی لاش کی فوری شناخت ہوا کا ایک جھوٹا ثابت ہوا، جس نے دکھ دلوں پر کافی حد تک مرہم رکھ دیا۔ دوسراطمینان بخش امر یہ تھا، کہ مولانا شہیدؒ کی لاش بالکل سالم اور مکمل تھی، کوئی عضو جسم سے الگ نہیں ہوا تھا۔ اب شاگردوں اور متعلقین میں سے جو بھی ہسپتال آتا، اُن کو لاش کے پاس لے جاتے، تاکہ اُن کی زبان سے بھی یہ سن سکیں کہ یہ مولانا شہیدؒ ہی کی لاش ہے۔ تقریباً رات دو بجے کے قریب چند نوجوان علماء کو ماسک پہنے ہوئے ہسپتال کے ایک کونے میں بیٹھے دیکھا۔ ماسک اس لیے پہن رکھے تھے، کہ ڈاکٹروں کی ہدایت تھی، ماسک پہنے اور دستاں چڑھائے بغیر لاشوں میں نہیں گھومیں، اور نہ ہاتھ لگائیں، جراثیم منتقل ہونے کا اندیشہ ہے۔ پھر اس سوچ نے آگھیرا، انسان کیا عجیب ہے؟ چند گھنٹے پہلے تو سب اعزہ و اقرباء اور دوست احباب نے ایئر پورٹ جا کر یا گھروں میں استقبال کر کے ان لوگوں سے ہاتھ ملانا تھا، معافہ کرنا تھا، ماؤں نے اپنے بچوں کے ماتھے پر چومنا اور رخساروں اور گالوں پر بوسہ دینا تھا، کراچی سے آنے والے ان مہمانوں کے لائے ہوئے تحفے تحائف کو سینے سے لگا لگا کر محبت، عقیدت اور خوشی کا اظہار کرنا تھا، اور اب جب ان کی آنکھیں بند ہو گئیں، تو کہا جا رہا ہے کہ احتیاطی تدابیر کے بغیر ہاتھ بھی نہ لگاؤ۔ اور مجھے مولانا عطاء الرحمن صاحب، جن کی لاش کے ارد گرد ہم کھڑے تھے، کی وہ عالمانہ اور دلچسپ گفتگو یاد آئی، جب وہ ایک مرتبہ گاؤں میں گرمی کے موسم میں گھر کے اندر درخت کے سائے میں بیٹھے اس حدیث شریف پر بحث کرنے لگے ”لَا عَذْوَى وَلَا ظِمْرَةٌ“ اور انتہائی پر زور انداز میں اپنا یہ پختہ اعتقاد دہرایا کہ حد سے زیادہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنا مثلاً ”کسی کا جھوٹا نہ پینا، بیماروں سے نفرت کرنا، مجھے اچھا نہیں لگتا اور فرمایا کہ جدید طبی تحقیقات کی وجہ سے بیماریوں کے متعدی ہونے کے بارے میں حد سے زیادہ حساس ہونا اس حدیث شریف کی روشنی میں مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ازراہ تواضع مجھے اپنی رائے ظاہر کرنے کا حکم دیا۔ میں نے طالب علمانہ سوال کیا کہ ”فَرٍّ مِنَ الْمَجْدُومِ فَرَاذَكَ مِنَ الْأَسَدِ“ بھی تو ہے؟ فرمایا ”فَمَنْ أُجْرَبَ الْأَوَّلُ“ بھی تو نبی صادق ﷺ کے مبارک کلمات ہیں غرض میں تطبیق دینے کی کوشش کر رہا تھا اور آپ ایک تجربہ کار و حکیم مدرس کی حیثیت سے ہم چھوٹوں کو حکیمانہ طرز تدبیر سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ اس مسئلے کو اس انداز میں ہرگز بیان نہیں کرنا چاہیے کہ جس کی وجہ سے لوگوں کا اعتقاد ہی بگڑ جائے اور ہر بیماری کے حوالے سے ظاہری وجوہات تلاش کرنے لگیں۔ کوئی رشتہ داروں میں شادی کو بیماریاں منتقل ہونے کی وجہ بتلا رہا ہے، تو کوئی جراثیم کی منتقلی کو۔ اس کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی کہ بیماری و شفاء دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ بہر حال! ان ماسک پہنے ہوئے نوجوان علماء کرام سے میں نے دریافت کیا، آپ حضرات کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کہنے لگے ”ہم بنوری ٹاؤن کے فضلاء ہیں، استاد جی کے شاگرد ہیں، تبلیغی سال میں چل رہے ہیں۔ آج رات رائے و تبلیغی مرکز میں تھے، جوں ہی حادثے کا سنا، وہاں سے سیدھا اسلام آباد کے کمپلیکس ہسپتال پہنچے۔ میں نے پوچھا ”آپ لوگوں کا استاد جی کے ساتھ کس طرح کا تعلق تھا؟ ان میں سے ایک مولوی صاحب کہنے لگے کہ میں تو روزانہ رات دیر تک ان کے ساتھ رہتا، خدمت کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش کرتا، استاد جی سونے اور آرام کا ارادہ ظاہر فرماتے تو میں جانے کی اجازت لیتا۔ میں نے عرض کیا، پھر تو آپ ان کی لاش کی شناخت بہتر طریقے سے کر سکیں گے، لاش کی شناخت تو اول و بلہ میں ہو چکی تھی، لیکن اس طرح کے حادثات میں عموماً لاشوں کی شناخت نہیں ہوتی، اور لوگوں کا ذہن یہ بنا ہوتا ہے کہ خالی تابوتوں یا پھر چند اعضا پر مشتمل تابوتوں کو دفنایا جاتا ہے۔ اس لیے فوری طور پر مولانا شہیدؒ کی لاش کی شناخت پر ہمیں غم کی حالت میں جو خوشی ہوئی تھی، اور اطمینان حاصل ہوا تھا، اس میں مزید اضافے کے لیے ”وَلَكِنْ لِّسَطَمَسْنِ قَلْبِي“ یہ چاہتے تھے کہ متعلقین اور شاگردوں میں سے جو بھی موجود ہیں، سب تصدیق بھی کر لیں، اور اسی

بہانے زیارت بھی کر لیں۔ (تاہم اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ مولانا شہیدؒ کے بڑے بیٹے عزیزم مولوی مسیح الرحمان جورات ہی کو گاؤں سے پہنچ گئے تھے، اور چھوٹے بھائی مولوی حفظ الرحمان لاشوں کی جگہ کا مشاہدہ نہ کر پائیں، ورنہ زندگی بھر تکلیف دہ صورتحال کا تصور ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا) وہ نو جوان علماء میرے عرض کرنے پر کہنے لگے، پھر ہم دیکھ لیتے ہیں! چنانچہ ہم سب لوگ لاش کے پاس آئے، ان شاگردوں نے جوں ہی چہرے سے چادر اٹھائی، فوراً کہنے لگے کہ استاد جی ہی ہیں۔ ان میں سے سے ایک شاگرد مولوی نعمان صاحب کہنے لگے، کہ میں دورہ حدیث میں سال بھر اساتذہ کی نشست کے بالکل قریب بیٹھتا تھا اور میری نظر اساتذہ کرام کے چہرے پر جمی رہتی تھی، یہ استاد جی کا ہی چہرہ ہے۔ ان کی اس گفتگو سے خوشی اور اطمینان میں اضافہ ہوا، اور میں نے ایک بار پھر برادرم جناب مولانا امداد اللہ صاحب کو اس صورتحال سے آگاہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی عجیب شان ہے کہ جس نے انسانی زندگی کو مختلف و متضاد کیفیات و احساسات کا مجموعہ بنایا ہے، ایک طرف حادثے کی شکار لاشوں اور جسمانی اعضاء کے درمیان گھومتے اپنے پیاروں کو تلاش کرتے ہوئے غم و اندوہ اور الم و کرب پہ مشتمل کیفیات و جذبات، عین اسی حالت میں مولانا شہیدؒ کی لاش کی شناخت پر خوشی و اطمینان کے جذبات و کیفیات۔ پھر اسی لمحے ہمیشہ مرحومہ اور مفتی عرفان مرحوم کی لاشوں کا تاحال شناخت نہ ہونے پر مایوسی اور الم و کرب کی کیفیات و جذبات۔ برادرم مولانا عتیق الرحمن کی تگ دو اور ڈاکٹروں سے بار بار گفتگو کے نتیجے میں تقریباً صبح تین بجے مولانا شہیدؒ کی لاش کا پوسٹ مارٹم و دیگر کاغذی کارروائی ممکن ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر اس تکلیف دہ صورتحال میں ایک خوش کن منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا، جو دین کی درس و تدریس اور نشر و اشاعت کے لیے زندگی کے تمام لمحات و ساعات اور اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کو اس راہ میں لگانے کے لیے وقف کرنے کا نتیجہ تھا۔ جہاں دیگر لاشوں کو اجنبی اور نامانوس ہاتھ اسٹریچر پر ڈال کر لے جا رہے تھے اور تابوتوں میں بند کر رہے تھے، وہاں مولانا شہیدؒ کی لاش کے ارد گرد ان کے دس بارہ شاگرد ورشتہ دار کھڑے تھے، اللہ کی راہ میں چلنے والے ان شاگرد علماء کے پاکیزہ ہاتھوں نے لاش کو اسٹریچر پر رکھا، پوسٹ مارٹم والی جگہ میں لے گئے، کفن والی چادریں پہنائیں اور جسم کی مناسبت سے سب سے نمایاں تابوت تلاش کر لیا، جو غالباً ایک ہی تھا اور اس میں لاش کو نہایت احترام و توقیر کے ساتھ رکھ دیا۔ ابتدا میں جب بظاہر یوں نظر آ رہا تھا کہ دیگر لاشوں کی طرح مولانا شہیدؒ کی لاش بھی اس طرح اجنبی اور مخصوص پس منظر رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں کے ذریعے اٹھائی جائے گی۔ جن کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ یہ کس شخصیت کی لاش ہے؟ تو اچانک اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا، کہ یہ کیسا اندوہ ناک حادثہ ہے، ان مولانا شہیدؒ کا مزاج تو یہ تھا کہ بالفرض اگر ان کے علم میں ہوتا کہ شہادت کے بعد قریبی رشتہ داروں اور جان چھڑکنے والے شاگردوں کے علاوہ کوئی اور ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوگا، تو کبھی بھی اس کو گوارا کرتے اور نہ اس کی اجازت دیتے۔ اس خیال کے تناظر میں جب اللہ تعالیٰ نے گویا غیب سے اس بات کا انتظام فرما کر ان مخلص شاگردوں اور عقیدت مندوں کو اس خدمت کے لیے بھیجا تو واقعاً یہ منظر بڑا اچھا لگا۔

تیسرا مرحلہ، لاش کی وصولی اور اسلام آباد میں نماز جنازہ کا اہتمام:

نماز فجر سے کچھ دیر پہلے تقریباً چار بجے لاش وصول کی گئی، اس وقت تک ہسپتال میں موجود رہنے والے علماء حضرات میں سے برادرم جناب مفتی ابرار احمد صاحب اور برادرم جناب قاری عتیق الرحمن صاحب، مہتمم جامعہ اسلامیہ، راولپنڈی صدر، دیگر رفقاء کار نے باہمی مشورے سے یہ پروگرام ترتیب دیا کہ بارہ بجے مسجد فاروق اعظم، آئی، نائن، فور میں نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔ اور قائد جمعیت مولانا فضل الرحمن مدظلہ العالی نماز جنازہ پڑھائیں گے جنہوں نے اس عظیم سانحہ میں مولانا عطاء الرحمن صاحب، ان کی ہمیشہ، اور رفیق سفر و حضر مفتی عرفان صاحب (رَحِمَهُمُ اللہ) کی شہادت کی وجہ سے بیرون ملک سفر پر جانے کا اپنا سرکاری دورہ منسوخ کیا تھا۔ شیڈول کے مطابق سانحے کے واقعہ ہونے کے چار گھنٹے بعد گیارہ بجے حضرت مولانا نے اس دورے پر اسلام آباد ایئر پورٹ سے روانہ ہونا تھا، مفتی ابرار صاحب بھی ہمراہ تھے، سامان سفر ایئر پورٹ پر جمع کرایا گیا تھا، ساری تیاریاں مکمل تھیں، ایک بین الاقوامی لیڈر اور خارجہ کمیٹی کے چیئرمین ہونے کی حیثیت سے مولانا کے اس سرکاری دورے کی اہمیت کے پیش نظر عین وقت پر دورے کو منسوخ کرنا ان کے بڑے پن اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ سے قلبی لگاؤ کا ثبوت ہے۔ آپ نے بنوری ٹاؤن کے اساتذہ کرام و طلبہ عظام اور مولانا شہیدؒ کے اہل خانہ کے غم میں شریک ہو کر اظہار ہمدردی فرمایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا شہیدؒ کبھی جمعیت کے رکن رہے تھے اور نہ سیاست کے میدان کے شہسوار، سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے کے باوجود وہ سیاسی میدان میں عملی طور پر حصہ لینے کے حوالے سے اپنے دادا جان (بابا جی رحمہ اللہ) کی اس وصیت پر ہمیشہ سے کاربند رہے تھے، کہ تعلیم و تعلم کو تمام مشاغل پر زندگی بھر مقدم رکھو، سیاسی گفتگو میں بھی حتی الوسع حصہ نہیں لیتے تھے، اخبار بنی میں ضیاع وقت کی بیماری سے اللہ نے ان کو محفوظ رکھا تھا، جب ہم میں سے کوئی اخباری بیان کے حوالے سے کوئی بات کرتا، تو پھر اس بیان کے حوالے سے پوچھتے اور معلومات حاصل کر کے اس وقت ایسی رائے قائم کر دیتے، جو سیاست کے میدان کے شہسواروں کی رائے پر بھاری ہوتی، تاہم ادب و شعر و شاعری سے شغف کی وجہ سے اخبار میں چھپنے والے

اشعار کو ضرور غور سے پڑھتے، اور پھر اپنی گفتگو میں ان کا حوالہ دیتے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب سے جو تعلق تھا، وہ عزت و احترام پر مبنی تھا، لیکن اس حوالے سے کہ جب مولانا بنوری ٹاؤن تشریف لے جاتے تو ملاقات ہو جاتی اور خوب ہوتی، حرمین شریفین میں ملاقات ہوتی اور یادگار ہوتی، یا پھر اسلام آباد میں کبھی ملاقات کی صورت بن جاتی، تاہم مولانا کی مصروفیات کی وجہ سے اسلام آباد میں ملاقات کے لیے گرم جوشی نہیں دکھاتے، اور ہمیں ہدایت کرتے کہ اگر آسانی سے ملاقات ہو سکتی ہے تو فبہا اور نہ چھوڑ دیں۔ بہر حال اسلام آباد میں نماز جنازہ کے حوالے سے برادر محترم جناب مولانا امداد اللہ صاحب سے بھی مشاورت کی گئی، آپ نے حسب عادت کھلے دل سے اس تجویز سے اتفاق کیا، اور یہ بھی حکم دیا کہ گاؤں میں جنازے کا وقت نماز عصر کے بعد چھ بجے رکھا جائے۔ اس مشاورت کے بعد مولانا شہیدؒ کی لاش بارہ بجے تک محفوظ رکھنے کے لیے بذریعہ ایمبولنس سرد خانے روانہ کر دی گئی، محترم قاری عتیق الرحمن صاحب رفقاء سمیت لاش کے ساتھ چلے گئے، میں اور دیگر رشتہ دار بقیہ دولاشوں کی شناخت کے لیے ہسپتال ہی میں رک گئے۔ ذہن ایک مرتبہ پھر کشمکش کی کیفیت میں مبتلا ہوا، اذیت ناک خیالات ذہن میں گھومنے لگے کہ وہ شخصیت جو اسلام آباد میں ہوتے ہوئے اکیلے کہیں نہیں جاتی تھی، اُن سے جدا ہونے کے لیے باقاعدہ پروگرام ترتیب دیا جاتا تھا، ان کے علم میں لائے بغیر اکیلے ہونے کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، یہ کیسے ممکن تھا، کہ ہم انہیں اکیلے چھوڑتے، لیکن آج ہم ان کی لاش کو اکیلے روانہ کر رہے ہیں۔ اور گھنٹوں اس عظیم انسان کی لاش دوسروں کی تحویل میں اکیلی پڑی رہے گی۔ ۱۰:۳۰ تک ہسپتال میں انتظار کیا، لاشوں کو کئی مرتبہ دوبارہ دیکھا، شک تو ہوتا تھا لیکن یقینی طور پر کسی لاش کی تعیین کا فیصلہ نہیں کر پاتے تھے، دراصل اللہ تعالیٰ نے ایک طرف ایک اور آزمائش سے گزارنا تھا جو آزمائش در آزمائش تھی۔ دوسری طرف مولانا شہیدؒ کی لاش کی فوری شناخت پر شکر ادا کرنے کا موقع فراہم کرنا تھا، اور ہمارے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کرنا کہ لاش بھی نہ ملتی تو ہم کیا کر سکتے تھے؟ اور اس وقت کیا کیفیت ہوتی اگر ہم دس دن تک بیٹھ کر تمام لاشوں کی تعیین کا انتظار کرتے ہوتے؟ گویا اس صورتحال میں پھر آزمائش میں سے انعام خداوندی کا پہلو نکل آیا۔

گیارہ بجے جامع مسجد فاروق اعظم پہنچے، علماء، طلبہ اور عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھتا ہی گیا، یہی وہ مسجد تھی، جہاں جامعۃ الامام ابی حنیفہ، جس کے قیام کو ابھی دو سال ہی ہوا چاہتے تھے، کی کسی تقریب میں علماء کو شرکت کی استدعاء کی جاتی تھی، تو کوئی معذرت کرتا، کوئی وعدے کے باوجود تشریف نہ لاتا، اور کئی ایک حضرات شریک بھی ہو جاتے، لیکن آج تو منظر ہی الگ تھا، مقامی علماء کے علاوہ راولپنڈی ڈویژن اور کشمیر، ہزارہ تک کے علماء تھے، کہ کھنچے چلے آ رہے تھے، حالانکہ اسلام آباد میں جنازہ عارضی بندوبست کے طور پر رکھ دیا گیا تھا، دوسرا جنازہ تو آبائی گاؤں بابوزئی میں ہونا تھا جہاں تدفین بھی ہونی تھی۔ کچھ دیر پہلے مجھے مولانا عبدالغفار صاحب، نائب مہتمم جامعہ فریدیہ کا فون آیا کہ اگر جنازہ کسی مرکزی جگہ ہوتا، تو علماء طلبہ کے لیے شرکت آسان ہو جاتی۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ یہ سب انتظامات برادر محترم جناب مفتی ابرار احمد صاحب اور برادر محترم قاری عتیق الرحمن صاحب نے کیے ہیں، اور سب حضرات کو اطلاع بھی ہو چکی ہے، شاید اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ آئی، نائن، فور میں ہجوم دیکھ کر خیال آیا کہ مرکزی جگہ تو وہی ٹھہرے گی، جہاں مولانا شہیدؒ کا جنازہ ہوگا، اس لیے کہ ان کی شخصیت ہی مرکزی تھی جس کو چھپائے رکھنے کا ہمیشہ سے انتظام کرتے رہتے تھے، اور اس میں کامیاب بھی رہتے۔ پھر یہ وہی مسجد تھی جہاں دو سال پہلے شوال ۱۴۳۱ھ میں جامعۃ الامام ابو حنیفہ کا آغاز ہوا، افتتاحی تقریب میں مولانا شہیدؒ مہمان خصوصی تھے۔ شوال کا مہینہ تھا جب عمرہ کی ادائیگی سے آپ کی واپسی ہوئی تھی، ڈرتے ڈرتے ان کی آمد کے موقع پر افتتاحی تقریب رکھنے کی اجازت لی، اس ہدایت کے ساتھ اجازت مرحمت فرمائی کہ زیادہ تشہیر نہ ہو، میں عام شرکاء کی طرح شریک تقریب ہو جاؤں گا۔ اُن کی آمد کا سن کر ہماری توقع سے زیادہ متعلقین بنوری ٹاؤن تشریف لائے، مدارس کی اہمیت اور ضرورت پر مختصر اور جامع گفتگو ارشاد فرمائی۔ تعلیم و تربیت کورس کے بارے میں تعارفی کلمات کے لیے میرے ہاتھ سے مائیک لیا، اور خود ہی اس کورس کی تاریخ، افادیت اور طریقہ کار کو بیان فرمایا، کہ یہی ان کی خواہش رہتی تھی کہ اس سلسلے کو آگے بڑھایا جائے۔ بعد میں مشفقانہ انداز میں ہماری سرزنش بھی فرمائی کہ آپ لوگوں نے تو کہا تھا کہ معمولی سی تقریب ہوگی اتنی بڑی تعداد میں علماء کے جمع ہونے کا تو نہیں کہا تھا! میں نے عرض کیا کہ آپ کی آمد کا سن کر علماء تشریف لائے تھے، آج اس جامعہ کے دوسرے تعلیمی سال کی اختتامی تقریب ان کی نماز جنازہ کی تقریب ٹھہری، آج بھی انہی کا سن کر علماء و فضلاء اور عامۃ الناس جوق در جوق حاضر ہوئے، لیکن اشک بار آنکھوں کے ساتھ اور بلک بلک کر روتے ہوئے۔

جنازہ سے پہلے برادر محترم جناب مولانا امداد اللہ صاحب، عزیز واقارب اور دوست احباب سمیت کراچی سے تشریف لائے۔ علماء و فضلاء ان سے گلے مل کر روتے ہوئے تعزیت کرتے رہے، رات سے فون پر تو مسلسل رابطہ تھا، تاہم ابھی تک سامنا نہیں ہوا تھا، مجھ میں سکت نہیں تھی، کہ ان کا سامنا کروں، ذہن میں چبھتے ہوئے یہ الفاظ مجھے پریشان کر رہے تھے کہ وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ ”شیخ عطاء کو کیا ہوا؟ انعام اللہ!“ آپ نے مجھ سے فون پر کہا تو تھا کہ موسم خراب ہے، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا، کہ یہ پیام موت ثابت ہوگا۔ جب ہی تو میں آپ سے کہہ رہا تھا، کہ فکر کی کوئی بات نہیں، ایسے موسم میں بھی جہاز اتر

جاتا ہے۔ پھر میرے ذہن کو ماضی کا تصور پریشان کرنے لگا، تینوں کی ایک کمرہ میں آٹھ سالہ رفاقت۔ چار سال قدیمی دارالاقامہ کے کمرہ نمبر ۱۲ میں، جب ہم تینوں طالب علم تھے، پھر وسطانی دارالاقامہ کے کمرہ نمبر ۱۱ میں، جب ہم دونوں طالب علم تھے، اور مولانا شہید مدرس و ناظم دارالاقامہ، اور اگلے سال مولانا امداد اللہ صاحب بھی مدرس و ناظم کے منصب پر فائز ہوئے، لیکن خیال رہے کہ کیا مجال جو تفاوت رتبہ اور اختلاف حیثیت کے باوجود کچھ بھی فرق آیا ہو، وہی بود و باش، وہی محبت و الفت، وہی احترام و توقیر۔ البتہ ایک فرق آیا تھا کہ میرے ناشتے کا خرچہ اب مولانا شہید برداشت کرنے لگے، جامعہ کی طرف سے ملنے والے ”کفاف“ میں سے وہ مجھے ہر مہینے سو روپے عنایت فرماتے اور مہینے بھر کے ناشتے کا خرچ بھی تقریباً اتنا ہی ہوا کرتا تھا۔ میں یہ سوچتا رہا کہ برادر ممد مولانا امداد اللہ صاحب سے ملوں تو کس طرح؟ کیا وہ مجھ سے تعزیت کریں گے اور تسلی و حوصلہ دیں گے؟ اس لیے کہ میرا رشتہ قریب تھا، بلکہ کئی رشتہ داریاں تھیں، اور جن میں سے سب سے مضبوط اور سچا رشتہ بھی تھا، یعنی استاد اور مربی ہونے کا رشتہ۔ یا پھر اس لیے ملوں گا کہ میں ان سے تعزیت کروں اور حوصلہ دوں، اس لیے کہ ان کا تو رشتہ بھی تھا اور ۳۷ سالہ رفاقت بھی، جب وہ دونوں آٹھ سال تک طالب علم کی حیثیت سے ایک ہی کمرے میں رہا کرتے تھے، پھر منصب تدریس و نظامت پر فائز ہونے کے بعد کئی سال تک ایک ہی کمرے میں رہے، اور جب جامعہ کی طرف سے پہلی مرتبہ چند منتخب اساتذہ کرام کو مکانات ملنے لگے، تو حضرت مفتی احمد الرحمن صاحب رحمہ اللہ نے اس رفاقت کی بنیاد پر اپنی مرضی کے مطابق مکانات لینے کا اختیار دیا، اور دونوں نے اس طویل رفاقت کو مزید طول دیتے ہوئے پانچویں منزل پر آئے۔ انہوں نے دو مکانات کا انتخاب کیا، اور مرتے دم تک اس رفاقت کے نبھانے کا گویا عہدہ کر لیا۔ اپنی شب و روز کی زندگی میں صرف اس وقت ایک دوسرے سے الگ رہتے، جب کبھی کسی سفر پر اکیلے جانا ہوتا، اس وقتی جدائی کی تلافی بھی یوں کرتے کہ روداد سفر ایک دوسرے کو سناتے، برادر ممد مولانا امداد اللہ صاحب تو چیدہ چیدہ باتیں اور حالات و واقعات سناتے پر اکتفا کرتے، لیکن مولانا شہیدؒ تو حرف بحرف روداد مزے لے لے کر سناتے، اور خوب سناتے، ہم رشتہ دار اور دیگر قریبی متعلقین تو ان کی روداد سفر سننے کے منتظر رہتے، کہ اس میں علمی باتوں کے علاوہ دلچسپ اور سبق آموز واقعات ہوتے۔ آج اس طویل دنیاوی رفاقت کا اختتام جو ہوا ہے، تو ایک سانحہ فاجعہ کے ذریعے۔ اس رفاقت کے اختتام کا غم برادر ممد مولانا امداد اللہ صاحب کو برداشت کرنا تھا، مولانا شہیدؒ تو بمصداق حدیث نبوی ﴿مُوتِ الْفَجَاءَ رَاحَةً لِلْمُؤْمِنِ﴾ (اچانک موت مومن کے لئے باعث راحت ہوتی ہے) آرام و راحت والی زندگی میں پہنچ گئے ہیں۔ اگرچہ اس راحت تک پہنچنے کے لیے شدید اور ناقابل بیان تکلیف سے گزر گئے، لیکن وہ تکلیف بہت مختصر وقت کے لیے تھی۔ پس ماندگان کے لیے غم و اندوہ کا پہاڑ چھوڑا، جس کا تصور مرتے دم تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ شیخین کی طویل رفاقت اور پھر اس کرب ناک انداز سے جدائی نے مالک بن نویریہ کے ان اشعار کا صحیح مطلب راسخ فی الذہن کر دیا۔

وَكُنَّا كَنَدَمَانِي جَذِيمَةً حِقْبَةً مِّنَ الدَّهْرِ حَتَّى قِيلَ لَنُتَصَدَّعَا

فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا كَانُنِي وَمَالِكًا لِّطُولِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبْتَ لَيْلَةً مَعَا

ہم دونوں ایک طویل عرصے تک جذیمۃ نامی قبیلہ کے دو ہم نشینوں کی طرح ساتھ رہے یہاں تک کہ کہا گیا کہ ہرگز یہ دونوں جدائی کے غم سے آشنا نہیں ہوں گے، پھر جب ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے، تو طویل رفاقت کی بنیاد پر گویا ہم ایک رات بھی ساتھ نہیں رہے۔

نیز یہ بھی خوب ذہن نشین ہوا، کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کی قبر پر یہ اشعار کیوں پڑھے تھے۔ بہر حال جب برادر ممد مولانا امداد اللہ صاحب دیگر علماء سے مصافحہ و معانقہ سے فارغ ہو کر جامعۃ الامام کے دفتر میں تشریف فرما ہوئے، تو میں انہی پریشان کن اور تکلیف دہ خیالات و تصورات سے مغلوب ہو کر بوجھل قدموں کے ساتھ ان کے سامنے جانے کی جرأت کر بیٹھا، اور ان کے سامنے کھڑا ہوا، ان کی نگاہیں زمین کی طرف تھیں، آنکھوں سے آنسو رواں تھے، کسی نے ان کو متوجہ کیا کہ انعام اللہ سے ملیے! بس پھر کیا تھا زندگی میں پہلی مرتبہ اس صورت حال سے دوچار ہوئے۔ اس سے پہلے بھی غم اور رونے کے مواقع آئے تھے، اساتذہ کی شہادتوں کے واقعات، والدین اور بہن بھائیوں کی وفات، ان مواقع پر بھی ہم روئے تھے اور خوب روئے تھے، لیکن اس واقعہ کی تو نوعیت ہی کچھ اور تھی، نڈھال ہی کر دیا۔ میں برادر ممد مولانا امداد اللہ صاحب سے چٹ گیا، کس لیے؟ تعزیت کرنے کے لیے؟ دل کا غم ہلکا کرنے کے لیے؟ ان کو حوصلہ دینے کے لیے؟ یا پھر ان سے حوصلہ پانے کے لیے؟ ہماری زبانیں گم سم تھیں، آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں، دل غمگین تھے، بلکہ بلک کر روئے۔

لَمَّا تَحْطَمَ حَامِلُ ب (عطاء) ہ

فیکت مآقینا علی شیخ الہدی

ہماری آنکھیں شیخ ہدایت کی وفات پر روئیں، جب مسافر بردار جہاز عطیہ خداوندی (شیخ عطاء) کو لیکر کریش ہوا۔

میں زبان حال سے ان سے اس اعرابی کے الفاظ میں درخواست کر رہا تھا، جس نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حضرت عباسؓ کی وفات کے موقع پر صبر

کی تلقین کرتے ہوئے کہا تھا۔

فَاصْبِرْ نَكُنْ بَكَ صَابِرِينَ فَإِنَّمَا
صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّأْسِ
صَبْرُ الْكَرِيمِ فَإِنَّهُ بَكَ أَغْلَمَ
وَإِذَا اغْتَرْتُكَ بَلِيَّةٌ فَاصْبِرْ لَهَا
صبر کیجیے، تاکہ ہم بھی صبر کریں، اس لئے کہ بڑوں کے صبر سے چھوٹوں کو صبر کا حوصلہ مل جاتا ہے اور یہ کہ۔
جب تجھ پر کوئی آزمائش آئے تو اس پر بلند ہمت لوگوں کی طرح صبر کریں اس لئے کہ اللہ تجھے اچھی طرح جانتے ہیں
زبان حال سے تو میں یہی درخواست کر رہا تھا، لیکن ہمارے حال پر یہ شعر زیادہ صادق آ رہا تھا۔

فَإِنَّا نَبْكَ مِنْ ذِكْرَى حَبِيبٍ وَمَنْزِلٍ
بِسْفَطِ اللَّوَى بَيْنَ الدُّخُولِ فَحَوِّ مَلٍ
دونوں رکو، تاکہ دخول اور حوّل کے درمیان سقط اللوی نامی جگہ پر ہم محبوب اور اس کے گھر کو یاد کر کے روئیں۔

اور ہماری حالت یہ تھی کہ حوصلہ دینے کے بجائے ایک دوسرے کو رونے پر برا بھلا کہتے رہے تھے۔ اب کلیجہ پھاڑ دینے والا ایک اور منظر میرا منتظر تھا، عزیزم مولوی فصیح الرحمن اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ کراچی سے پہنچ گئے تھے، گاڑی میں بیٹھ کر میرا انتظار ہو رہا تھا، ان کے ذہن میں یہ تھا کہ شہید کی لاش یہاں ہوگی، ابھی ان کے چہرے کا دیدار ہوگا۔ ہمیشہ سے یہی معمول تھا کہ کوئی خاص بات ہوتی، اور لالہ جی کے سامنے اس کا اظہار مناسب نہ سمجھا جاتا، تو مجھے واسطہ بنا دیا جاتا۔ بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے وہ ہمارے لیے ماں کے درجے میں ہیں، ان کی ہر بات حکم کے درجے میں ہے، جو جھل قدموں کے ساتھ میں ان کے سامنے گیا، الفاظ کے ذریعے تعزیت کا موقع ہی نہیں تھا، زبان سے کہنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ آنسو بہا بہا کر تعزیت کی، نہ تھمنے والے آنسوؤں کے ذریعے انہوں نے مجھے بتایا کہ کس طرح وہ آخری مرتبہ گھر سے نکلے۔ جمعہ کی نماز کی تیاری میں ایک ایک سنت ادا کی، اور دروازے پر کھڑے ہو کر حسب معمول دعائیں پڑھیں۔ اہل خانہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ فریضہ جمعہ کی ادائیگی کے لیے شایان شان طریقے سے نکلے، اور مسجد سے سیدھے ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہوں گے۔ لیکن فرشتہ اجل جانتا تھا، اور یقینی طور پر جانتا تھا کہ یہ تو سفر آخرت پر جا رہے ہیں، یہ ان کا آخری نکلنا ہے، ایسا جانا کہ اس کے بعد واپس لوٹنا نہیں۔ جمعہ کی نماز پڑھانے کے بعد اپنے بسمل کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ میں نے بھی خاموشی کے ساتھ آنسو آنسو میں اسلام آباد کی روداد سنائی۔ مجھے حسب توقع حکم دیا کہ ہمیں چہرے کا دیدار کراؤ۔ میری ہمت نہیں بندھ رہی تھی کہ میں ان کو جواب دے سکوں، اتنا کہہ دیا کہ لاش یہاں موجود نہیں، فی الحال سرد خانے میں ہے۔ پھر نہیں معلوم کہ مغموں دلوں پر کیا گزرا ہوگا؟ جنازے کی نماز ادا ہوئی، مولانا فضل الرحمن نے امامت فرمائی۔ مجھے یاد آیا کہ ابھی دو دن قبل اسی اسلام آباد میں مولانا فضل الرحمن صاحب ہی نے ایک اور علم کے پہاڑ مولانا قاضی حمید اللہ خان صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ اس موقع پر بھی علماء جمع تھے، آج بھی وہی منظر، وہ علماء، طلباء اور عامۃ الناس کا اجتماع، تاہم حادثاتی موت کی وجہ سے جذباتی مناظر کی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس مختصر وقفے کے ساتھ کسی جید عالم دین کا دوسرا جنازہ؟۔

چوتھا مرحلہ، گاؤں کے لیے لاش کی روانگی:

نماز جنازہ کے بعد لاش ایسبونس میں رکھی گئی اور گاؤں کے لیے روانہ کی گئی، دوسری گاڑیوں کے انتظار میں ہم سڑک کے کنارے کھڑے تھے، کہ مولانا کی محبوبیت اور ان پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرنے کا ایک خوش کن اور ناقابل فراموش منظر دیکھا۔ تین علماء کرام پاس آئے، سلام مسنون کے بعد اپنا تعارف کرایا، میں نے عرض کیا، پہچان لیا، مولانا اشفاق الرحمن، ایبٹ آباد والے، غالباً فراغت کے بعد پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی، پڑھنے میں مجھ سے دو تین سال آگے تھے۔ بڑی لجاجت سے کہنے لگے کہ ہمیں دیدار کرا دیجئے، میں نے عرض کیا ”تا بوقت کے اندر چہرے پر کفن ڈالا گیا ہے، دیدار ممکن نہیں۔“ کہنے لگے کہ ہم صرف تابوت کو ہاتھ لگا لیں گے، ایسبونس کا دروازہ کھولا گیا، ان حضرات نے عقیدت و احترام کے ساتھ تابوت کو ہاتھ لگایا اور نیچے اتر آئے۔

مردان شہر پہنچے، وہاں بھی عقیدت کے اظہار کا یقینہ یہی منظر سامنے تھا، سینکڑوں علماء، فضلاء، مولانا شہید کے ہم سبق، شاگرد اور عامۃ الناس کا جم غفیر مولانا کی لاش کا منتظر سڑک کے کنارے کھڑا تھا، شایان شان استقبال کی تیاری کچھ اس انداز میں ہوئی تھی، جیسے ہمارے یہاں کسی عظیم سیاسی لیڈر کی آمد کے موقع پر کی جاتی ہے۔ ان سب لوگوں نے بھی ایسبونس میں پڑے تابوت کو ہاتھ لگا کر اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا، اور عملاً یہ بتلایا کہ اس سانحہ فاجعہ میں مولانا شہید کی دنیا ئے فانی سے رحلت کتنوں کے لیے عظیم صدمے کی باعث بنی ہے۔ تابوت کو ہاتھ لگانے والوں کے جم غفیر میں سے آواز آئی انعام اللہ! ”میں قاری گلا جان ہوں“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، قاری صاحب سے مصافحہ کیا اور ہم نے ایک دوسرے سے تعزیت کی۔ ”میں قاری گلا جان ہوں“

محض چار لفظی ایک جملہ نہیں تھا، ان چار لفظوں نے ماضی کے درتچے میں جھانکے پر مجبور کر دیا، آج سے تقریباً ۳۸ سال پہلے کا زمانہ طفولیت یاد دلایا، جب میں اور مولانا شہیدؒ نماز عصر کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول بابوزئی کے چمن زار میں چٹائیوں پر بیٹھ کر قاری صاحب سے تجوید پڑھتے تھے، پڑھائی کے چند ہی دن تھے جب میں نے پہلی مرتبہ سورۃ النبأ اور سورۃ النازعات یاد کر لی تھی، اور مولانا شہیدؒ نے اپنی ذہانت و فطانت کی بدولت آخری پارے کا اکثر حصہ حفظ کر لیا تھا۔ قاری صاحب کے مختصر جملے نے گویا یاد دلایا کہ تمہارا مولانا کے ساتھ، گواہی انتہائی مختصر وقت کے لیے، ہم سبق ہونے کا بھی رشتہ ہے، جب تم دونوں نے مکتب میں میرے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر لیا تھا۔ اس جملے سے اس وقت یہ مطلب بھی سمجھ گیا کہ استاد محترم غم زدہ ہو کر ہمارے غم کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے غم کو بھی کم کرنا چاہ رہے ہیں، وہ غم، جو ایک قابل فخر شاگرد کی اچانک جدائی پر ایک استاد کو پہنچا ہے۔ شاگرد بھی ایسا، جو زندگی بھر اسکول اور مکتب کے اساتذہ کا بھی اس طرح احترام کرتا رہا، جس طرح کا احترام بخاری و مسلم پڑھانے والے اساتذہ کرام کا کرتا رہا، اور اس مختصر جملے کا اس مقام پر اظہار اس مطلب و مفہوم پر نمایاں دلالت کر رہا تھا کہ درحقیقت قاری صاحب فخریہ طور پر یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ اس عظیم انسان کے ساتھ میرا بھی استاد کی شاگردی کا تعلق ہے۔ اس چمن کی آبیاری میں ہمارا خون بھی شامل ہے۔ تاریخ کے اوراق میں کتنی ایسی عظیم شخصیات کا تذکرہ موجود ہے کہ ان کے علمی مقام کی وجہ سے ان کے اساتذہ بجا طور پر اپنے شاگردوں پر فخر کیا کرتے تھے۔

مردان سے بابوزئی تک تقریباً ۳۵ کلومیٹر پر مشتمل سفر نے تو ایک اور تاریخ رقم کی، ایک نرالی شان والا قافلہ رواں دواں تھا، مردان شہر کی پرہجوم سڑک پر پولیس مو بائیل، ایسبولنس کے لیے راستہ صاف کر رہی تھی، اور وہاں سے آگے چار موٹر سائیکلوں پر اور ایک کلش گاڑی میں سوار علماء و طلباء دونوں ہاتھوں سے ہر نظر آنے والی گاڑی کو سڑک سے ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایسبولنس سے آگے آگے جا رہے تھے، ایسبولنس کے پیچھے درجنوں گاڑیاں قافلہ کی شکل میں آ رہی تھیں۔ اس منظر پر نگاہ پڑتے ہی سڑک کے دونوں جانب قطار اندر قطار لوگ کھڑے ہوئے تھے اور صدمے کی کیفیت سے دوچار ہو کر اس قافلہ کا حیرت و استعجاب کے ساتھ مشاہدہ کرتے رہے۔ حیرت و استعجاب کی وجہ یہ تھی، کہ اس دور دراز اور پس ماندہ علاقے سے تعلق رکھنے والا یہ شخص کون ہے؟ جس کے جنازہ پر خلق خدا کا سیل رواں اٹھ آیا ہے، اس محبوبیت و عقیدت کے باوجود یہ درویش صفت آدمی آج تک اپنے علاقے کے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا، اس لیے نہیں کہ اپنے علاقے میں ان کا آنا جانا کم تھا، بلکہ وہ تو صرف اسی ایک سال میں والد محترم کی عیادت اور زیارت کی نیت سے تقریباً بارہ مرتبہ اپنے علاقے میں تشریف لائے، سینکڑوں مرتبہ ان راستوں اور سڑکوں سے گزرے، ان دیہاتوں اور قصبوں میں واقع دینی مدارس کی زیارت کرتے، اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے پاس بذات خود تشریف لے جاتے۔ اوجھل رہنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی شہرت دنیاوی بنیادوں (مال و دولت، جاہ و منصب وغیرہ) پر استوار نہیں تھی، بلکہ دین اور دین داری کی بنیادوں پر استوار تھی، اور عشق کے اس میدان میں شہسواری کے لیے بنیادی شرط اخفاء و خمول کے پردے میں مخفی رہنا ہے، تواضع و عاجزی اختیار کرنا ہے، بے تکلفی اور سادگی والی طرز معاشرت اپنانا ہے، ”مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ“ کی حقیقی روح کو اپنے اندر سمانا ہے، تب جا کر غیرت خداوندی ”رَفَعَهُ اللّٰهُ“ کے خدائی وعدے کی تکمیل کے لیے جوش میں آتی ہے، اور واقعتاً جوش میں آتی ہے۔ مولانا شہیدؒ کا انداز شہادت اور دنیا کے فانی سے جہان باقی کی طرف رحلت کے سفر میمون کے تمام مراحل متذکرہ بالا حدیث کے مضمون پر پختہ اعتقاد کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کے لیے کافی و شافی دلیل ہیں، لیکن اس کے لیے بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے واقعتاً یہ راستہ کٹھن اور پرخطر ہے، جن میں کئی شہسوار منہ کے بل گر جاتے ہیں، نمود و نمائش والی انسانی فطرت کی خود نمائی و خود رانی کے جذبات کو مسلسل دبائے رکھنے کے لیے مولانا شہیدؒ جیسے اولوالعزم اور نابغہ روزگار لوگوں جیسا حوصلہ اور تحمل چاہیے، اور اس کے ساتھ حکمت و تدبیر بھی، تاکہ اخفاء و خمول، تواضع و عاجزی، دنیا سے بے رغبتی اور صفت درویشی کو بھی اخفاء کے پردے میں چھپایا جاسکے، ورنہ شیطانی وسوسوں کا دوسرا راستہ کھل جاتا ہے۔ مولانا شہیدؒ نے اس انداز حیات و معاشرت کو اس قدر بحسن و خوبی زندگی بھر اختیار کیے رکھا، کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہونے دیا اور نہ کبھی اپنے اوپر یہ الزام لگانے کا موقع فراہم کیا کہ آپ تو تنہائی و عزلت پسندی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ قافلہ اس شان سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا، آنکھوں سے نہ تھمنے والے آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا، میں ایک طرف ان سوچوں میں گم تھا کہ پروگرام کے مطابق تو ہم نے صبح کے وقت اس راستے سے گزر کر گاؤں پہنچنا تھا، جہاں ہنس مکھ چہرے کے ساتھ والدین کی زیارت کرنی تھی، عزت و احترام کے ساتھ خاندان کے بڑوں سے ملنا تھا، شفقت و محبت کے ساتھ چھوٹوں سے پیش آنا تھا، ہنسی و خوشی کے ساتھ مقتدیوں اور متعلقین کے ساتھ معافانہ و مصافحہ کرنا تھا، لیکن اب ہم صبح کی بجائے شام کے اوقات میں اس سڑک پر جا رہے ہیں، اور مولانا شہیدؒ کی لاش کو ان پیاروں کے سامنے پیش کرنا ہے، جہاں آہوں، سسکیوں اور بلک بلک کر رونے کے مناظر ہمارے منظر ہیں، اور اس سوچ نے تو نڈھال ہی کر دیا تھا کہ ماموں جان کے سامنے مسکرا ہٹیں بکھیرنے والے لالہ جی کی بجائے مرحوم و مغفور شہیدؒ کی لاش لے جانے کی کیا توجیہ پیش کریں گے؟ اور وہ تو فوراً یہ بھی پوچھیں گے کہ بیٹی

اور مفتی عرفان کی لاشوں کا کیا بنا؟ وہ کب ملیں گی؟ اس لیے کہ وہ تو ہر سوال کا جواب لینا چاہتے ہیں، جب کہ ہمارے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ دوسری طرف وارفتگی اور والہانہ عقیدت کے دیدنی مناظر کو دیکھ کر یہ مضمون ذہن میں چلتا رہا کہ ”عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے“ اور۔

اجازت ہو تو شامل ہم بھی ہو جائیں

سنا ہے تیرے در پہ کل ہجوم عاشقان ہوگا

پھر ذہن میں بار بار یہ بات آتی رہی کہ یہ سب کچھ تو مولانا شہیدؒ کے مزاج کے خلاف ہو رہا ہے، اپنی زندگی میں تو کسی درجے میں بھی شان و شوکت کے اظہار کے نہ تو خود و وادار تھے، نہ رشتے داروں، شاگردوں یا دوست احباب میں سے کسی کو اس کی اجازت تھی، یہاں تک کہ اس طرح کے مزاج کی بھی اجازت نہ تھی، نہ صرف یہ کہ ناراض ہو جاتے بلکہ روگردانی کرنے والے کی اچھی خاصی اصلاح فرماتے، یہ الگ بات کہ اصلاح کے بعد اس تعلق اور محبت و شفقت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میری اکثر دوستوں سے دوستی کا آغاز لڑائی سے ہوا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ سب کچھ نیک نیتی اور اصلاح ہی کی غرض سے ہوتا اور اس بات سے آگاہ کرنے کے لیے کہ اگر میرے ساتھ تعلق رکھنا ہے تو مزاج سے واقفیت حاصل کریں۔ جنازے کے جلوس میں اس منظر کے تناظر میں یہ مضمون اس تسلسل سے ذہن پر چھایا رہا کہ آخر کار زبان سے اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا، اور اگلی سیٹ پر ساتھ بیٹھے مولانا نور الامین صاحب سے عرض کیا کہ بالفرض اگر مولانا شہیدؒ اٹھ کر دیکھیں کہ کس طرح ان کی لاش کے لیے ہٹو بچو کے نعرے لگائے جا رہے ہیں، ہاتھوں سے اشارے کیے جا رہے ہیں اور کس شان و شوکت کے ساتھ ان کے جنازے کا جلوس آگے بڑھ رہا ہے، تو ضرور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ ”یہ عجیب لوگ ہیں، اس کی کیا ضرورت ہے؟“۔ ان کا تو مزاج یہ تھا کہ جب ایک مرتبہ غالباً آپ حج یا عمرے کے سفر سے واپس تشریف لائے، تو برادر مراد جناب مولانا امداد اللہ صاحب بھی مردان سے ساتھ ہوئے اور خاندان کے افراد پر مشتمل تین گاڑیوں کا قافلہ گاؤں میں داخل ہوا چاہتا تھا، تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ اکٹھے گاؤں میں داخل نہ ہوں لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَاذْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ نظر بد سے حفاظت ہو نیز یا نمود کا بھی شائبہ نہ ہو۔ لیکن اب کا جلوس تو نہ سفر حج و عمرہ سے واپسی کا تھا، نہ اس کا کوئی دوسرا دینی یا دنیاوی عنوان تھا۔ یہ تو جنازے کا جلوس تھا، جس کے لیے نہ کوئی اعلان ہوا تھا، اور نہ روایتی انداز میں کسی کو اطلاع دی گئی تھی، اس کا واحد باعث تو وہ محبوبیت تھی جو بمصداق حدیث نبوی ﷺ اللہ کے نیک بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ الغرض اسی شان سے یہ قافلہ گاؤں میں داخل ہوا، الجامعۃ الاسلامیہ کے پاس طلبہ اور عوام الناس کا جم غفیر دور و کھڑا استقبال کر رہا تھا، اور جب مولانا شہیدؒ کے آبائی گھر کے پاس پہنچے جہاں ان کے تابوت کو ایبولنس سے اتارنا تھا، تو وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا، پورے گاؤں کے بچے، جوان اور بوڑھے، جب کہ گھر کے اندر گاؤں کی خواتین کرب و غم کی کیفیت سے دوچار آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کے ہار لیے استقبال کے لیے کھڑے تھے، ان کا استقبال پہلے بھی ہوتا تھا، جب مولانا شہیدؒ باہر کے سفر بطور خاص حرمین کے سفر سے سیدھے اپنے گاؤں تشریف لاتے، اور اخفا و خمول کے جذبے سے سرشار بلکہ پھلکے انداز میں اس پر ناراضگی کا اظہار فرماتے، بالخصوص جب ان کے علم میں یہ بات آتی کہ علاقے کی روایت کے مطابق استقبال کے لیے کسی بھی درجے میں اہتمام کیا گیا ہے، تاہم والد محترم کے جذبات کا پاس رکھتے ہوئے غیر محسوس انداز اختیار فرماتے۔ اور یہ استقبال آج بھی ہو رہا ہے، لیکن آج تو منظر ہی کچھ اور ہے، اہل علاقہ نے اس سے پہلے کبھی یہ منظر نہیں دیکھا، نہ کبھی اس کا تصور کیا اور آئندہ بھی اللہ تعالیٰ ان کو اس نوعیت کے کرب و غم سے محفوظ رکھیں۔ دونوں حالتوں میں فرق یہ تھا کہ اب یہ استقبال مولانا کی لاش کا ہو رہا تھا، اب نہ تو لوگوں کے اختیار میں تھا کہ گھروں میں بیٹھ کر صرف ان کے آنے کی اطلاع کا انتظار کریں اور مناسب وقت پر ملاقات کے لیے حاضری دیں، اور نہ خود مولانا کے اختیار میں کہ ناراضگی کا اظہار کریں، اب یہ ایک تکوینی امر کے تحت تھا، جس میں محض مشیت ایزدی ہی کا فرما ہوتی ہے، کسی انسان کا بس یہاں نہیں چلتا۔ ایبولنس سے تابوت اتارا گیا اب جس غم و اندوہ کے منظر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، وہ یہ تھا کہ ماموں جان بھی اس ہجوم میں ویل چیئر پر بیٹھے چلتے پھرتے عطاء الرحمن کے بجائے ایک ایسی لاش کے منظر تھے، جس کی سواری چوبیس گھنٹے پہلے اعلیٰ علیین کو سدھار چکی تھی، میں پورے سفر میں یہی منصوبے بناتا رہا کہ ماموں جان کو تسلی دوں گا، صبر کی تلقین کروں گا، اپنے پر کنٹرول کروں گا، تاکہ ہماری بے صبری اور جزع و فزع کی وجہ سے ان کے کرب و غم میں اضافہ نہ ہو، لیکن یہ منصوبہ بندی محض خیالی پلاؤ سے زیادہ کچھ نہیں تھی، ماموں جان کو دیکھتے ہی صبر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، الٹا میں ان سے خواستگار تھا کہ ہمیں تھامے رکھیں اور جب انہوں نے تابوت کو ہاتھ لگاتے ہوئے یہ کہا کہ ”باری تو میری تھی لیکن آپ مجھ سے سبقت لے گئے“ تو یہ الفاظ خنجر کی طرح دل میں پیوست ہوئے، کلیجہ منہ کو آنے لگا، ”وَالْحُزْنُ قَدْ شَقَّ الْقَوَادِ بِدَائِهِ“ ”غم نے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا“ اس تمنا نے سراٹھایا کہ کاش رات بھر لاشوں کے درمیان رہنے کے بعد اس منظر کو تو نہ دیکھتا اور یہ الفاظ نہ سنتا، واقعاً باری ان کی تھی، لیکن انسانی سوچ کے مطابق، اس لیے کہ انسانی منصوبے اور سوچیں اسی خیال کے ارد گرد گھومتی ہیں کہ پہلے آنے والے کو پہلے جانا

چاہیے، لیکن یہ خام خیالی ہے، حقیقت اس سے کوسوں دور ہے، حقیقت تو وہی ہے جو مولانا شہیدؒ نے شہادت سے تقریباً پانچ گھنٹے پہلے اپنے خطبہ جمعہ میں کراچی کے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بیان کی تھی، آپ کے الفاظ یوں تھے ”نوجوانو! موت کی تیاری کرو اس لیے کہ دنیا میں آنا ترتیب سے ہے۔ والد پہلے آتا ہے، بیٹا بعد میں، لیکن جانا ترتیب سے نہیں کتنے ہی والدین اپنے جگر گوشوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ جان جان آفرین کے حوالے کرتے ہیں اور والدین بے بسی کی تصویر بنے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں“۔ اُن کی لاش کا گاؤں کیا پہنچنا تھا کہ ایک کہرام مچ گیا، ہر شخص غزدہ تھا، اور مردوزن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ تھمنے والا سلسلہ جاری تھا، خاندان کے افراد جو اکثر و بیشتر جید علماء و فضلاء ہیں ایسے مواقع کے لیے شرعی تعلیمات سے بخوبی واقف، صبر جمیل کے فضائل اچھی طرح جانتے اور برسرِ منبر بیان کرتے رہتے ہیں، لیکن سب بے قابو ہو رہے تھے، اور صراحتاً یا زبانِ حال سے پوچھتے رہے کہ یہ کیا ہوا؟ آنسو بہانے کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا، جواب تھا کہ یہ سب کچھ ﴿کَتَبْنَا مُؤَجَّلًا﴾ ہے لیکن ایسے مواقع پر حقیقت کی آنکھ وا کرنے کے لیے صدیق اکبرؐ جیسے علم، تحمل، برداشت اور قوتِ ایمانی کی ضرورت تھی بعد میں تو سب ایک دوسرے کو یہی سمجھاتے رہے اور تقدیر کا مسئلہ بیان کرتے رہے، لیکن اس وقت سب صدمے سے دوچار تھے، آہ و بکا کرتے رہے، مولانا شعیب صاحب جو کتبِ حدیث کے مدرس ہیں مجھ سے لپٹ کر پوچھنے لگے ”ہمارا کیا بنے گا؟“ برادرِ مولانا لطف الرحمن صاحب برسرِ منبر قرآن و حدیث کے حقائق سمجھاتے رہتے ہیں، لپٹ کر روئے۔ آج مجھے یہ بات سمجھ آئی کہ کس طرح غم و صدمے کی وجہ سے آدمی ہوش و ہواس کھو بیٹھتا ہے، مختصر یہ کہ آج بابوزئی میں ایک کہرام مچا ہوا تھا، دروہام سوگ وار تھے، اداسی اور مایوسی ہر سو پھیلی ہوئی تھی، ہر طرف چیخ و پکار تھی، آہ و بکا کی آوازیں تھیں، آہوں اور سسکیوں کے ساتھ لوگ ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔

فَلَا يَكِي أَقَارِبُهُمْ فَرَادَى
يَصِيحُ النَّاسُ طُرّاً بِالْبُكَاءِ

ان کے عزیز و اقارب اکیلے نہیں رو رہے ہیں، سب لوگ چیخ چیخ کر رو رہے ہیں۔

برادرِ جناب مولانا امداد اللہ صاحب سب کو صبر کی تلقین کرتے رہے، جنازے سے متعلق ہدایات دیتے رہے، لیکن کبھی کبھار ان کے جذبات بھی بے قابو ہو جاتے، پھر اس وقت ان کے لیے کسی ایسے غم خوار کی ضرورت ہوتی، جو ان کو تھامے رکھے، حوصلہ دے اور شریکِ غم ہو جائے، بزبانِ شاعر

فَالدَّمْعُ يُسْكِبُ وَالْجَوَانِحُ تَصْطَلِي
بِلَطْفِي الْأَسَى مَاذَا جَرَى بِلَائِهِ؟

آنسو بے اختیار بہ رہے ہیں، اور اندرونِ غم کے شعلوں سے بھڑک رہا ہے، اس آفت نے کیسے غم ڈھائے؟

سوال یہ تھا کہ نمازِ جنازہ کہاں ادا کی جائے؟ گاؤں کی جنازہ گاہ میں؟ جہاں باباجی اور ایک دوسرے بزرگ ابدی نیند سو رہے ہیں، وہی باباجی، جنہوں نے ہم سب سمیت مولانا شہیدؒ کو مدرسے کی راہ دکھائی تھی، حضرت بنوریؒ سے عقیدت تھی، اور بعد از عصر جامعہ کے باغیچے میں ان کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے، ان مجالس میں ہونے والی گفتگو سناتے تھے، اسی بناء پر اپنی اولاد کے درس و تدریس کے لیے ان کا واحد انتخاب بنوری ٹاؤن تھا، اور کیا ہی خوب انتخاب تھا! استاد محترم حضرت مفتی رضاء الحق صاحب مدظلہ العالی نے الجامعۃ الاسلامیہ کے سنگ بنیاد کے موقع پر اور اب مولانا شہیدؒ کی تعزیت کے موقع پر دومرتبہ اپنی تقریر کا آغاز اس واقعہ سے فرمایا کہ باباجی رحمہ اللہ کراچی تشریف آوری کے موقع پر بالخصوص عصر و مغرب کی نمازیں بنوری ٹاؤن کی جامع مسجد میں ادا کرنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ علاقے کے ایک بزرگ ہونے کے ناطے ان سے ہماری ملاقاتیں رہتی تھیں، مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ میرا پوتا (عطاء الرحمن) ابھی سکول میں پڑھ رہا ہے، میٹرک تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں ان کو یہاں بنوری ٹاؤن میں دینی تعلیم کے حصول کے لئے داخل کراؤں گا! اسی کا نتیجہ تھا کہ آج ایک عالم حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کا مشاہدہ کر رہا تھا، واقفانِ حال تو پہلے سے جانتے تھے، لیکن ناواقفوں کے علم میں آج یہ بات آرہی تھی کہ اس بامِ عروج پر پہنچنے کی واحد وجہ باباجی رحمہ اللہ کا وہی انتخاب تھا، جو وہ آج سے ۳۷ سال پہلے کر چکے تھے۔ یا پھر جنازے کی نماز الجامعۃ الاسلامیہ بابوزئی سے بجانب قبلہ وسیع و عریض میدان میں ہو وہی جامعہ جس میں بروز اتوار ۲۲ اپریل کو بوقت صبح نو بجے تشنگانِ علوم و دینیہ کے درمیان مولانا شہیدؒ کے دست مبارک سے انعامات تقسیم ہونا طے تھا، جہاں کی دینی تقریبات میں ہمیشہ آپ کی تقریر ہوا کرتی تھی اور وہی تقریر ماتھے کا جھومر اور واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتی تھی، برادرِ مولانا امداد اللہ صاحب کی سحر انگیز اور مقناطیسی شخصیت ہی بنوری ٹاؤن اور ملک بھر کے بزرگوں، اکابر علماء کرام اور طلبہ عظام کی آمدتِ میمون کا باعث بنتی اور جب تشریف لانے والے مہمانانِ گرامی کے علم میں یہ بات آتی کہ مولانا شہیدؒ بھی گاؤں میں موجود ہیں تو ”یک نہ شد دوشد“ اور ”نُورٌ عَلٰی نُورٍ“ کے مصداق ان کی تشریف آوری اور بھی یقینی ہو جاتی، یہ الگ بات ہے کہ مولانا شہیدؒ کا انداز دعوت حسب روایت مختلف ہوتا، اور ہر میدان میں اپنی شخصیت کو مخفی رکھنے کے لیے برادرِ مولانا امداد اللہ صاحب ہی کی آڑ لیتے۔ انہی مہمانانِ گرامی کے لیے خوش آمدیدی و ترحیبی کلمات مولانا شہیدؒ ہی کی زبان سے ادا ہوتے، اور یہ فریضہ ان ہی کی شخصیت کو بختا (اِنَّمَا يَعْرِفُ ذَا الْفَضْلِ مِنَ النَّاسِ ذَوْوُهُ) (اہل

فضل و علم کو اسی میدان کے شہسوار جانتے ہیں)۔ آپ کی تقریر کا دوسرا اہم نکتہ مدارس دینیہ کی اہمیت اور ضرورت کے بیان پر مشتمل ہوتا۔ اور تیسرا نکتہ اہل علاقہ، بالخصوص بابوزئی والوں کو اس نعمت کی قدر کرنے کی ترغیب پر مشتمل ہوتا، جو الجامعۃ الاسلامیہ و دیگر مکاتب کے قیام کی شکل میں گاؤں ہی میں ان کو ملی تھی، اس نکتے کو بیان کرتے ہوئے آپ جذباتی ہو جاتے تھے۔ بہر حال نماز جنازہ گاؤں کی جنازہ گاہ میں ہو؟ یا پھر جامعہ کے ساتھ والے میدان میں؟ گاؤں کی روایات اور اہل علاقہ کے مزاج سے واقف رشتہ داروں اور گاؤں کے ارباب حل و عقد کی پر زور رائے یہ تھی کہ آج تک گاؤں کی جنازہ گاہ کا احاطہ کبھی تنگ نہیں پڑا، لوگوں کا کتنا ہی ازدحام کیوں نہ ہو، کسی بڑے سے بڑے آدمی کا جنازہ کیوں نہ ہو، بمشکل اس احاطے کے برآمدے سے باہر صف بنانے کی ضرورت پڑتی ہے، اسلام آباد سے آتے ہوئے موٹر وے پر ہی برادر م مولانا نادریس صاحب نے توجہ اس جانب مبذول کروائی کہ نماز جنازہ کا اہتمام جامعہ کے ساتھ والے میدان میں کیا جائے! فون پر برادر م حافظ احسان اللہ صاحب کے ذریعے پہلی رائے کے مؤیدین کو سمجھانے کی کوشش کی، دلیل یہی دی کہ اس کو عام جنازہ نہ سمجھا جائے! آج تو ”ہجوم عاشقان“ کا صحیح منظر ہوگا۔ اس کے پیچھے ۳۷ رسالہ دینی خدمات کی ایک طویل تاریخ ہے، عقیدتیں ہیں، محبتیں ہیں، چاہتیں ہیں۔ اور جب محسوس کیا کہ بات نہیں بنتی تو برادر م جناب مولانا امداد اللہ صاحب سے درخواست کی کہ آپ حکم دیں اور نماز جنازہ جامعہ والے میدان میں رکھنے کی ہدایت فرمائیں تاکہ کوئی نماز جنازہ میں شرکت سے محروم نہ ہو اور ازدحام کی وجہ سے لوگوں کو زحمت نہ ہو۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسی انداز میں یہ اعلان کیا گیا کہ نماز جنازہ جامعہ میں ادا کی جائے گی۔ جنازے کے بعد سب نے اسی رائے کی تائید کی۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن علاقے کی روایات سے واقف لوگ اس کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں، اہل علاقہ کی بات بھی درست تھی، وہ تو ماضی کے تجربات کی بنیاد پر اس بات پر بضد تھے، ان کی چشم تصور نے ایسے ہجوم کا کبھی خیال تک نہیں کیا تھا، علاقے کی تاریخ میں کسی بھی عنوان سے کبھی اتنی خلقت جمع نہیں ہوئی تھی، غم کے عنوان سے اور نہ کبھی خوشی کے عنوان سے۔ سیاسی جلسے کے عنوان سے، ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی ہے، شہروں میں تو اس سے بڑے کئی اجتماعات ہوتے رہتے ہیں، بالخصوص ماضی قریب میں اکابر علماء دیوبند کے جنازوں میں امام احمد بن حنبلؒ کے اس قول کی حقانیت کئی بار ثابت ہوئی کہ اہل سنت والجماعت اور دوسروں کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز جنازہ کے اجتماعات ہیں۔ لیکن دو حوالوں سے جنازے میں یہ ازدحام لوگوں کے لیے باعث حیرت و استعجاب تھا، ایک محل وقوع کے اعتبار سے کہ وطن عزیز کے انتہائی شمال مغرب کے ایک چھوٹے سے دور افتادہ گاؤں میں یہ ہجوم جمع تھا، دوسرا مولانا شہیدؒ کی شخصیت کے حوالے سے کہ آپ نے مناصب جلیلہ پر فائز ہونے کے باوجود ہمیشہ اپنے آپ کو چھپائے رکھنے کی کامیاب کوشش کی اور جنازہ کے ہجوم ہی نے اس سے پردہ اٹھا کر آشکارا کیا۔

اہل محلہ نے تابوت کو جنازہ گاہ تک ایمبولنس میں لے جانے کی بجائے کندھوں پر لے جانے کو ترجیح دی، تاکہ ایک عالم ربانی کے جنازے کو کندھا دینے کی سعادت سے محروم نہ ہوں۔ وہ سعادت جو اس شان سے شاید ان کو زندگی میں پہلی بار ملی تھی، امر تنوینی کے ذریعے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ یہ ایک عام شخص کا جنازہ نہیں، یہ علم و عمل کے پیکر مجسم کا جنازہ تھا، بلکہ ان کے تربیت یافتہ تلمیذ رشید جناب برادر م مفتی رفیق احمد بالا کوٹی کے الفاظ میں یہ اخلاص و للہیت، صورت و سیرت، ذہانت و فطانت، قابلیت و لیاقت، شفقت و رحمت، الفت و محبت، فدایت و فناءیت، امانت و دیانت، تقویٰ و طہارت، مواسات و اخوت، ادب و عقیدت، غیرت و حمیت، حوصلہ و ہمت، خودی و خودارادیت، بے تکلفی و بذات، شرافت و نجابت و عظمت، اخلاق و مروت، علمیت و عملیت جیسے اوصاف کی حامل شخصیت کا جنازہ تھا، جو اس مٹی میں دفن ہونے جا رہی تھی، جس میں ان کی پرورش اور نشو و نما ہوئی تھی۔ میں برادر م مولانا امداد اللہ صاحب کے ساتھ ساتھ جنازے کے آگے آگے جا رہا تھا اور یہ شعر بار بار ذہن میں آتا رہا۔

كُلُّ ابْنِ اَنْثَى وَاِنْ طَالَتْ سَلَامَتُهُ
يَوْمًا عَلٰى اَلَةٍ حَذَبَاءَ مَحْمُولُ

ماں کا جٹا ہر شخص، اگرچہ طویل عمر پائے، ایک نہ ایک دن جنازہ کی چار پائی پر اٹھایا جاتا ہے۔

دونوں دل ہی دل یہ سوچ رہے تھے کہ خلاف سنت کام کر رہے ہیں، جنازے کے آگے چلنے سے تو منع آیا ہے۔ معاذ کی حالت میں اجازت کا بھی خیال آیا، اعذار کئی تھے۔ جنازہ اس تیز رفتاری سے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا کہ ایک موقع پر تو ہمیں دوڑ لگانا پڑی، گویا علم و عمل کے پیکر مجسم کے حاملین کو آگے کی طرف دھکیلا جا رہا ہو، تیز رفتاری کیوں نہ ہوتی، زندگی بھر علوم دینیہ اور احادیث نبویہ کے پڑھنے پڑھانے کو اوڑھنا بچھونا بنانے والی شخصیت کا جنازہ لے جانے میں حدیث نبوی ﷺ پر عمل نہ ہو تو کب عمل ہوگا؟ یہ تو وہ صالح روح تھی جس کے لیے قبر بہترین جگہ تھی اور لوگ اس کو بہترین مقام پر پہنچانے کے لیے تیز رفتاری پر مجبور تھے۔ انہی راستوں، گلیوں اور سڑکوں پر جب مولانا شہیدؒ کسی عزیز یا گاؤں کے کسی بھی فرد کے ساتھ ٹہلتے ہوئے جاتے، تو بڑے آرام و متانت سے چہل قدمی کے انداز میں چلتے، ساتھ چلنے والے کو ان کے لیے رک رک کر جانا پڑتا تھا، اس لیے کہ آنے جانے والوں،

راستوں میں بیٹھے ہوئے جوانوں اور بزرگوں میں سے تقریباً ہر ایک کے ساتھ رکتے یا رکنے کی خواہش ہوتی، ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ مناسب حال بات ارشاد فرماتے، ماضی کے واقعات کا تذکرہ فرماتے، لطیف اور پاکیزہ مزاح فرماتے، گفتگو کے دوران غیر مناسب الفاظ اور خیالات کی اصلاح فرماتے، ہم جب انتظار انتظار کرتے کرتے اکتا جاتے، تو دل ہی دل میں سوچتے کہ ان سے جلدی کرنے کی استدعا کریں لیکن احترام و تعظیم کی وجہ سے ان کی بارعب شخصیت کے سامنے لب کشائی کی جرات نہ کر پاتے۔ البتہ برادر م مولانا امداد اللہ صاحب کبھی کبھار مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھتے اور یوں اظہار خیال فرماتے ”شیخ عطاء بھی کیا عجیب شخص ہیں، ہر ایک کی دلجوئی کرتے رہتے ہیں، ان کے مزاج میں جلدی بالکل نہیں“ اور جب کبھی زبان سے استدعا کرنا ضروری ہو جاتا، تو بلا کسی ناراضگی کے فرماتے: اچھا! چلیں، چلتے ہیں۔ اور پھر سفید دھاری دار رو مال کو مخصوص انداز میں حرکت دے کر کندھے پر ڈالتے اور گفتگو فرماتے ہوئے تیز قدموں سے چلنا شروع کرتے۔ ہم تو نظریہ دفع الوقتی کے تحت جلدی کا سوچتے، لیکن ان کی نگاہ سفر آخرت پر تھی، ان کو یقین تھا کہ حیات مستعار کے لمحات خلق خدا کی دلجوئی و اصلاح کے لیے قربان کرنے والے کے سفر آخرت کے لمحات قیمتی بن جاتے ہیں، اور حدیث نبوی ﷺ کے مصداق بن کر پھر ان کی لاش جلدی جلدی اس مقام کی طرف بڑھتی جاتی ہے، جہاں فرشتے ان کے اعزاز و اکرام کے لیے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ جوں جوں الجامعۃ الاسلامیہ کے قریب ہوتے گئے جامعہ میں نماز عصر پڑھانے والے امام کی اللہ اکبر کی صدائیں لاؤڈ اسپیکر سے سنائی دینے لگیں، جو آج خلاف معمول پورے گاؤں میں گونج رہی تھیں، سوگ و ارفضا میں نغمہ تو حید و کبریائی رب کی ان صداؤں سے عجب ساساں پیدا ہوا تھا، سلام پھیرنے اور دعاء کی آواز آئی ”اے اللہ! مولانا عطاء الرحمن شہید اور ان کے ساتھ شہید ہونے والی ان کی ہمیشہ شہیدہ اور مفتی عرفان شہید کی مغفرت فرما! درجات بلند فرما! پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرما!“ ان الفاظ نے ایک مرتبہ پھر ذہن کو عجیب کشمکش میں مبتلا کیا، کیا وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے؟ کیا ہم ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے؟ اور پس ماندگان بن کر ہمارے لیے صبر جمیل کی دعا کی جائے گی؟ اسی لاؤڈ اسپیکر سے تو کل انک کی مترنم و دل سوز اور بارعب آواز کو گوجنا تھا، جامعہ کے طلباء کے درمیان اُن کے دست مبارک سے انعامات تقسیم ہونے تھے۔ برادر م مولانا امداد اللہ صاحب دعا کی آواز سن کر چونک پڑے، یہ تو مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب ہیں، وہ انتہائی ضعف کی حالت میں ہیں، وہیل چیئر پر چلتے پھرتے ہیں، وہ کیسے تشریف لائے؟ مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب کی خوبصورت آواز صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

لَکَانَ رَسُولُ اللَّهِ فِيهَا مُخَلِّدًا

لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَذُومُ لَوَاحِدٍ

اگر اس دنیا میں کسی نے ہمیشہ کے لئے رہنا ہوتا تو رسول اللہ اس میں ہمیشہ رہتے۔

آپ کا موضوع سخن نماز جنازہ کے موقع پر اختیار کیے جانے والے موضوع سے مختلف تھا، زیادہ زور اس پر نہیں تھا کہ مرحومین کے لئے دعا کریں بلکہ زور اس پر تھا کہ شہید کی نماز جنازہ ہے، ایسے مواقع پر شرکاء جنازہ کی مغفرت ہو جاتی ہے، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنی مغفرت کا سامان مہیا کریں! آپ فرما رہے تھے، کہ اہل السنۃ والجماعۃ کثر اللہ سوادہم کے روحانی فرزندان تو حید، اکابر علماء دیوبند کا عقیدہ ہے کہ حدیث نبوی ﷺ کے مطابق عام مردوں کو بھی خطاب کے صیغے کے ساتھ سلام کرنا سنت نبوی ﷺ اور شعار الاسلام والمسلمین ہے، شہداء کا مقام تو ان سے بھی بلند ہے، جن کے بارے میں قرآن مجید کی ناقابل تردید شہادت ہے کہ (بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ) اور (وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا. بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ). (فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ) باوجودیکہ ہم ہی نے اس پر اصرار کیا تھا کہ جنازہ میں ہجوم زیادہ ہوگا، لہذا جامعہ میں نماز جنازہ کا اہتمام کیا جائے، لیکن اس وقت چونک اٹھے، جب جامعہ کے میدان کی طرف مڑتے ہوئے ہجوم پر نگاہ پڑی، علماء، صلحاء، طلباء اور عوام الناس ایک محبوب استاد، ربانی عالم دین کی لاش کے انتظار میں صدمے سے دوچار کھڑے تھے، یہ تو ذہن میں تھا کہ لوگ زیادہ ہوں گے! لیکن اتنے جم غفیر کا اندازہ نہیں تھا، معاً خیال آیا کہ گذشتہ کل نماز عصر کے بعد عین اسی وقت جب مولانا شہید کا جہاز ہواؤں کی بلندیوں میں تیرتا ہوا بل کی طرف رواں دواں تھا، ہم مولانا شہید کے عظیم استاد شیخ الحدیث حضرت مولانا امین گل باباجی رحمہ اللہ کے نماز جنازہ میں مخلوق خدا کی کثرت کا تذکرہ کر رہے تھے، خدا کی شان دیکھیں کہ آج اسی وقت ہم باباجی کے شاگرد شہید کے جنازے کے جم غفیر میں کھڑے ہیں، نماز جنازہ سے دس پندرہ منٹ پہلے برادر م جناب مولانا سید سلیمان بنوری، نائب مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن، جامعہ کے اساتذہ کرام، طلباء عظام اور دوسرے دوست احباب تشریف لے آئے، جو غمگین دلوں اور آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ الم و کرب کے مجسم پیکر بنے مولانا شہید کے تابوت کے ارد گرد کھڑے تھے، اور بزبان بعینہ یہی منظر سامنے تھا:

مِنْ جَامِعِ الْعِلْمِ الزَّلَالِ بِمَائِهِ

يَكِي عَلَيْهِ مَشَائِخُ وَ تَلَامِذُ

صَرُحُ الْعُلُومِ وَ نَبُعُهَا فِي مِحْنَةٍ بِفِرَاقِ عَالِمِنَا (الْعَطَا) وَ ذَكَائِهِ

صاف، بیٹھے اور خوش گوار پانی جیسے علوم کی جامع شخصیت کی وفات پر مشائخ اور شاگرد سب رورہے ہیں۔

ہمارے عالم بھائی (شیخ عطاء) کے فراق اور ان کے فہم و ذکا سے محروم ہونے پر خالص علوم دینیہ کا بلند و بالا قلعہ اور سرچشمہ (جامعہ) بڑی آزمائش میں ہے۔

یہ حضرات ضرور سوچتے ہوں گے کہ کس طرح اچانک وہ آواز آج خاموش ہو گئی ہے، کئی دہائیوں تک جامعہ کے درودیوار جس سے آشناء ہے، جامعہ کی محفلوں، مجلسوں اور انجمنوں میں پورے زور و شور سے وہ گونجتی رہی اور جامعہ ہی کی درس گاہیں اس کے ترنم، دل سوزی و خوش آوازی سے محفوظ ہوتی رہیں۔

زینت	محفل	لکھوں	یا	زینت	اہل	چمن
یا	لکھوں	بلبل	تھے	یا	دین	کا پروانہ
یاد	کرتا	ہے	تھے	تو	آج	بھی دارالحدیث
وہ عبارت	کی	صدائیں	پھر	سے	گوںجیں	گی کہاں

مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب، استاد الحدیث جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے نماز جنازہ پڑھائی۔ خدمت حدیث کے لئے زندگی وقف کرنے والے ایک شہید محدث کی نماز جنازہ اپنے عہد کے ایک اور عظیم محدث پڑھا رہے ہیں، جو دونوں اپنے عہد کے دو عظیم جامعات (جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن اور جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) کے درس حدیث کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ مولانا شہید گو یہ رشتہ کتنا عزیز تھا؟ اساتذہ حدیث سے ان کو کتنی محبت تھی؟ اور اس رشتہ محبت کو کس طرح وہ اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھتے تھے؟ ایک معمولی سے واقعہ سے اس کا اندازہ لگانا چاہیے۔ جب ایک مرتبہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں وفاق المدارس العربیہ کے تحت منعقد ہونے والے امتحان میں نگران اعلیٰ کی حیثیت سے ڈیوٹی سے فارغ ہوئے، آخری دن بزرگ عالم دین، استاد الحدیث حضرت مولانا مغفور اللہ صاحب کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے، رخصت ہوتے وقت حسب عادت اپنا قلم اُن کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا، جو ہی کمرے سے باہر تشریف لائے، فرمانے لگے! ہدیہ تو ان کی شان سے بہت کم تھا، تاہم امید واثق ہے کہ حضرت ضرور کبھی اسی قلم سے کسی حدیث کی عبارت اور درود شریف کے کلمات رقم فرمائیں گے، اور یہی ہمارے لئے ذریعہ شفاعت و ذریعہ نجات بنے گا۔ قبر کی طرف لے جانے کے لیے پھر سے تابوت کو کندھوں پر اٹھایا گیا، گاؤں والی سڑک پر قبرستان کی طرف چلتے ہوئے تابوت کندھوں پر اٹھائے لوگ اچانک رک گئے، پیچھے سے آنے والے لوگ رکنے کی وجہ پوچھتے رہے، معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ سڑک کے بچوں بیچ گاڑیاں اس طرح کھڑی ہیں کہ پیدل چلنے کا بھی راستہ نہیں، گاؤں کے بڑے، بوڑھوں کے لیے یہ منظر بڑا تعجب انگیز تھا کہ انہیں کبھی اس صورتحال کا مشاہدہ نہیں ہوا تھا۔ کھیتوں کی دیواروں کو پھلانگتے ہوئے تابوت کو لے جانے کی کوشش کی گئی، خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں بھاری بھر کم تابوت کندھوں سے نیچے نہ گر جائے، بڑی مشکل سے تابوت کو قبرستان تک لے جایا گیا۔ برادر م مولانا امدا اللہ صاحب کی ہدایت پر فی الحال دو قبریں کھودی گئی تھیں، میری البتہ رائے یہ تھی کہ جب تک دوسری لاشوں کی شناخت نہ ہو، اس وقت تک دوسری قبر نہ کھودی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کئی دنوں تک بقیہ لاشوں کی شناخت نہ ہو، اور قبریوں ہی پڑی رہی۔ تاہم کہا گیا کہ اگر دوسری لاشوں میں سے کوئی بھی لاش آج مل جائے تو دوسری قبر بنانا مشکل ہو جائے گی۔ علاقے میں صدیوں پرانے اسلامی رواج کے مطابق تاقد آدم گہری قبر کھودنے کا رواج ہے، شق قبر بنائی جاتی ہے، مردان سے نکلتے ہی دل میں خیال آیا تھا کہ علاقے میں تابوت کے بغیر لاشوں کی تدفین کا رواج ہے، اس کے مطابق قبریں کھودی جاتی ہیں، تابوت کے لیے زیادہ لمبے چوڑے شق کی ضرورت ہوگی۔ معاً یہ بھی اللہ نے دل میں ڈالا کہ مولانا شہید کی لاش پر مشتمل تابوت کے مطابق شق بنانی ہوگی، لمبائی چوڑائی مانی گئی اور قبر کھودنے والے نو جوانوں کو اس کے مطابق شق بنانے کی درخواست کی گئی، اللہ تعالیٰ نے ان کے بھی دل میں یہی بات ڈالی اور جب گاؤں جاتے ہوئے قبر کے پاس سے ایبولنس گزر رہی تھی، تو دوبارہ تابوت کی لمبائی چوڑائی مانی گئی، اور واقعاً قبر میں شق کی لمبائی چوڑائی کم تھی، جس میں بروقت توسیع کی گئی تھی۔ الغرض سخت زمین میں بیک وقت تاقد آدم گہری چوڑی دو قبریں کھودنے اور ان میں سے ایک قبر کو دومرتبہ کشادہ کرنے کا مشکل کام گاؤں کے ان نو جوانوں کے لیے عقیدت و احترام اور محبت و الفت کے ان جذبات کے تحت ممکن ہوا، جو اللہ تعالیٰ نے علماء ربانیین کے لیے عوام الناس کے دلوں میں ڈال رکھی ہے۔ یہ قبریں زمین کے اس احاطہ میں تھیں، جس کو علاقے کے رواج کے مطابق ماموں جان نے قبرستان کے لیے خریدی تھی، جس میں پہلی قبر میری والدہ محترمہ (مولانا شہید کی چھوٹی بہن) کی بنی تھی، جو ۱۹۹۲ء میں اس وقت وفات پا گئیں تھیں،

جب ہمارے مربی اور شفیق استاد محترم حضرت مفتی احمد الرحمنؒ اور یوں میں بیک وقت حقیقی والدہ اور روحانی والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہوا تھا۔ اب تک قبرستان کے اس احاطہ میں شہداء ثلاثہ کی قبروں سمیت کل دس قبور ہیں، جن میں سے پانچ مرحومین کی قبریں گذشتہ رمضان کے بعد اب تک بنی ہیں، وہ قریبی مرحومین رشتہ داران کے علاوہ ہیں، جو قرب و جوار کے دیگر احاطوں میں مدفون ہیں۔ یہ سب اعزہ و اقرباء ہماری آنکھوں کے سامنے ﴿وَفِيهَا نَعِيذُكُمْ﴾ کے مصداق زمین کے پیٹ میں اپنے مستقر میں چلے گئے ہیں، جن کے پاس سے گزرتے ہوئے ہمیشہ یہ شعر یاد آتا رہتا ہے، جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے شیخ اور استاد امام دارمی رحمہ اللہ کی وفات کی خبر سن کر پڑھا تھا۔

إِنْ تَبَقَّ تَفَجَّعَ بِالْأَجْبَةِ كُلِّهِمْ
وَفَنَاءُ نَفْسِكَ لَا أَبَالَكَ أَفْجَعُ

اگر زندہ رہو گے تو سب پیاروں کا غم سہو گے، اور اگر خود موت کی آغوش میں جاتے ہو تو یہ سب سے زیادہ دردناک بات ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر ہم طول عمر کی خواہش رکھتے ہیں تو اپنے پیاروں کی جدائی کا غم برداشت کرنے کا حوصلہ بھی درکار ہوگا۔ ایک وقت وہ تھا کہ سارے اساتذہ کرام حیات تھے آٹھ سالہ زمانہ طالب علمی میں کسی استاد محترم کی وفات کا غم نہیں دیکھا تھا۔ ۱۹۸۹ء میں دورہ حدیث کے آخری ایام میں حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمہ اللہ قرآن و حدیث کا درس دیتے دیتے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ اکیس اساتذہ کرام میں صرف ۷ حضرات اب تک حیات مستعار کے قیمتی لحظات دین متین کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں، بقیہ ۱۲ انفوس قدسیہ ﴿صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ﴾ والے وعدے کی تکمیل کر کے ہمیں داغ مفارقت دے کر اپنی آخری منزل کو سدھار چکے ہیں۔ وطن کی اس مٹی میں دفن ہونا مولانا شہیدؒ کی خواہش بھی تھی، مولانا مفتی عبدالرؤف غزنوی صاحب استاذ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن جب تعزیت کے لیے گاؤں تشریف لائے اور بعد نماز مغرب قبروں پر فاتحہ پڑھی وہیں کھڑے کھڑے فرمایا کہ چند دن پہلے جامعہ کے لیے الگ قبرستان کے حوالے سے تجویز آئی تھی تو مولانا شہیدؒ نے تائید کی تاہم فرمایا کہ ”اللہ نے چاہا تو ہماری قبریں تو گاؤں میں ہوں گی“۔ اللہ نے اُن کی خواہش اس طرح پوری کی کہ گاؤں آتے ہوئے اچانک موت کی آغوش میں چلے گئے اور یوں خود بخود دگاؤں ہی میں تدفین کے اسباب بن گئے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حالات میں لکھا ہے کہ حسب وصیت ان کی تدفین جنت البقیع میں رات کے وقت ہوئی، اور اپنے دو بھانجوں (عبداللہ بن الزبیر، عروہ بن الزبیر)، تین بھتیجوں (قاسم بن محمد، عبداللہ بن محمد اور عبداللہ بن عبدالرحمن) نے اُن کی لاش قبر میں اتاری۔ اس واقعہ کے پڑھنے کے بعد کسی بھی مرنے والے کی تدفین کے وقت نگاہیں اس بات کی متلاشی رہتی ہیں کہ جسد خاکی کو قبر میں اتارنے والے کون اور کیسے لوگ ہیں؟ نماز مغرب سے چند لحظات قبل جب مولانا شہیدؒ کی آخری آرام گاہ کے پاس گئے تو دیکھا کہ جامعہ کے استاد برادر م مولانا محمد عادل صاحب، مولانا محمد آصف صاحب، مولانا سلمان تاج صاحب، مولانا سفیان یونس صاحب، برادر م حسن الرحمن صاحب اور قاری عبدالغفور صاحب مولانا شہیدؒ کے جسد خاکی کو قبر میں اتار رہے ہیں، یہ حضرات ہمیشہ کی طرح ہم پر سبقت لے گئے تھے، جان چھڑکنے والے ان شاگردان رشید نے اپنے استاد محترم کی آخری خدمت کی سعادت حاصل کی، اور ہم اس مقام کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہی رہ گئے، اتارنے والوں پر بھی رشک اور اتارے جانے والے پر بھی رشک، اُن کے ہاتھوں میں تابوت دیکھ کر دل نے کہنا چاہا ”نَعْمَ الرَّاكِبُ وَنَعْمَ الْمَمْرُكُوبُ“ برادر م مولانا محمد عادل صاحب اور جناب قاری عبدالغفور صاحب نے روتے ہوئے بالترتیب قبر پر سورہ بقرہ کا پہلا اور آخری رکوع تلاوت کیا، مولانا عمران عیسیٰ صاحب نے دعا کروائی۔ بروز ہفتہ ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ، بمطابق ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء کا سورج آسمان دنیا کے افق پر غروب ہوا، تو عین اسی وقت آسمان علم و تقویٰ، کہکشاں گلشن بنوری کا یہ چمکتا دمکتا ستارہ زندگی کی ۵۲ بہاروں تک انوار علوم نبوت سمیٹنے اور بکھیرنے کے بعد اپنے مستقر میں پہنچ کر ظاہری آنکھوں سے اوجھل ہوا۔

يَذُوقُ الْمَوْتَ حَقًّا كُلُّ نَفْسٍ
وَذِي الدُّنْيَا تَصِيرُ إِلَى الْوَفَنَاءِ

فَقَدْ نَاعَالِمًا دُرًّا يَنْيَمًا
نَجِيًّا كَانَضْ أَدْكَى الْأَذْكِيَاءِ

بے شک ہر جی نے موت کا مزہ چھکنا ہے اور یہی دنیا فنا کی طرف رواں دواں ہے۔

ہم ایک دریکتا (نادرموتی) جیسے اور برگزیدہ عالم کو کھوپکے جو فہم و ذکا میں سب پر فائق تھے۔

فَإِنَّ لِلَّهِ مَا أَخَذَ، وَلَهُ مَا أُعْطِيَ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى.

مولانا عرفان شہیدؒ کی لاش شناخت ہونے میں تاخیر ہو گئی تھی، جہاز میں عرفان نام کے تین لوگ تھے، جو اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، ان میں سے بھی ایک لاش کو بہت جلد تابوت میں رکھ دیا گیا تھا، جس کا مکمل معائنہ ممکن نہیں تھا۔ کراچی میں موجود مولانا عرفان شہیدؒ کے مخلص دوست مولانا سہیل میمن صاحب سے مسلسل رابطہ رہا اور معلومات حاصل کرتے رہے کہ عرفان صاحب نے لباس کیسا پہنا تھا؟ جوتے کس طرح کے تھے؟ اُن کا شناختی کارڈ نمبر کیا تھا؟ رات بھر کی تگ و دو کے باوجود کامیابی نہیں ہوئی، صبح دس بجے کی فلائٹ میں ان کے بھائی اور برادر نسبتی اسلام آباد پہنچے اور تقریباً بارہ بجے ہسپتال چلے گئے، جہاں بقیہ لاشوں کی شناخت کا سلسلہ جاری تھا۔ اللہ نے فضل فرمایا اور تقریباً ۲۴ بجے شام تک لاش کی شناخت اور حوالگی کا مرحلہ طے ہوا۔ مولانا شہیدؒ کی تدفین کے بعد مفتی عرفان شہیدؒ کی لاش بابوزئی پہنچ گئی۔

بابوزئی میں تدفین کا فیصلہ:

برادر م مولانا امداد اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ہمت و استقلال کا کوہ گراں ثابت کیا ہے، انتظامی صلاحیتوں کی دنیا معترف ہے۔ ابھی ہم سب طالب علم تھے، میں درجہ اول کا، برادر م مولانا امداد اللہ صاحب درجہ سادسہ کے اور مولانا شہیدؒ درجہ سابعہ کے، سارے اساتذہ کرام سے ابھی تک پوری طرح واقفیت بھی نہیں تھی، جامعہ میں اجتماعی صفائی کا پروگرام تھا، حضرت مفتی عبدالسمیع شہید رحمہ اللہ قدیمی دارالاقامہ تشریف لائے اور پوچھا ”امداد اللہ کہاں ہے؟ وہ بڑا فعال قسم کا آدمی ہے۔ ابھی میں ”فعال“ کا معنی بھی نہیں سمجھتا تھا، ہر میدان میں برادر م مولانا امداد اللہ صاحب کی فعالیت کا مشاہدہ کرتے کرتے اس وقت سمجھ میں آ گیا ہے۔ غم بھی بڑے برداشت کیے، اپنے والدین کی جدائی، بہن بھائیوں کا فراق، اساتذہ کرام کی مظلومیت کے ساتھ شہادتیں، اور اب اپنے علمی، عملی، انتظامی زندگی اور سفر و حضر کے رفیق کار و ہمراز، جن کو بے تکلفی میں وہ ”شیخ عطاء“ کہہ کر پکارتے تھے، کی ناگہانی موت کا عظیم صدمہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ صلاحیت بھی دی ہے، کہ شدید غم و صدمے کی حالت میں بھی وہ انتظامی امور سے غیر متعلق نہیں رہتے، دل غمگین اور نہ تھکنے والے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ تجہیز و تکفین سے متعلق تمام امور اس حسن و خوبی کے ساتھ سرانجام دیتے رہتے ہیں، جس طرح معمول کے حالات میں۔ صورتحال یہ تھی کہ مفتی عرفان شہیدؒ کے اہل و عیال کراچی میں مقیم ہیں، سسرال نواب شاہ سندھ میں، حادثہ کراچی سے آتے ہوئے اسلام آباد میں پیش آیا ہے، لاش ملتی ہے یا نہیں؟ کس وقت ملتی ہے؟ کس حالت میں ملتی ہے؟ بوڑھی ماں اور تین ننھے منھے بچوں، جن میں سے بڑا صرف ۸ سال کا پیدائشی طور پر بینائی سے محروم، ”حبان“ مولانا شہیدؒ کا رکھا ہوا نام۔ اعزہ و اقرباء، بالخصوص بوڑھی والدہ اور غمزہ بیوہ کی ضرور خواہش ہوگی کہ شہیدؒ کا تابوت تو دیکھ لیں۔ دونوں شہداء ایک دوسرے کی عدم موجودگی میں تمام امور کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے ہوتے تھے، بالخصوص استاد جی، ان کے اہم فیصلوں میں مؤثر کردار ادا کرتے اور گھر والے بھی انہی کے فیصلوں پر مطمئن ہوتے۔ مشکل یہ تھی کہ دونوں، یعنی استاد و شاگرد، ایک ساتھ ہی راہی عدم ہوئے تھے، گویا سفر آخرت میں بھی ﴿هَذَا فِرَاقٌ بَيْنِي وَبَيْنِكَ﴾ کا مصداق بننے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اور وفاداری کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے دنیاوی اسفار میں ایک دوسرے کی جدائی برداشت نہ کرنے کی طرح آخرت کے سفر میں بھی جدائی اختیار کرنے سے مجتنب رہے۔

فَصَارَ وَفَاءُهُ كُلُّ الْوَفَاءِ

وَمَاتَ وَفِيهِ الْعِرْفَانُ أَيْضاً

اور (شیخ عطاء) کے باوفا دوست عرفان بھی ان کے ساتھ ہی موت کے آغوش میں چلے گئے، پس اُن کی وفاداری کمال وفاداری کی مثال بن گئی۔ اب یہ مشکل فیصلہ کرنا تھا کہ مفتی عرفان شہیدؒ کی تدفین کہاں ہو؟ اگر کراچی میں تدفین ہوتی، تو انتہائی قریبی اور مخلص شاگرد اور دوست احباب استاد جی کی تدفین میں شرکت نہ کر پاتے، یا پھر مفتی عرفان شہیدؒ کی تدفین میں۔ اور زندگی بھر شرکت نہ کرنے کا غم دل میں لیے پھرتے۔ برادر م مولانا امداد اللہ صاحب کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اس مشکل کا ایک حل ڈالا، چنانچہ مفتی عرفان شہیدؒ کے گھر تشریف لے گئے، ان کے اہل و عیال سے تعزیت کی، اور پھر ان کے سامنے یہ تجویز رکھ دی، کہ استاد و شاگرد دونوں زندگی بھر ساتھ رہے ہیں، موت بھی ساتھ آئی ہے، تو قبریں بھی ساتھ ہوں، جس کی صورت یہ ہے کہ مفتی عرفان شہیدؒ کی تجہیز و تکفین بابوزئی میں اپنے استاد محترم کے پہلو میں ہو جائے۔ وہی بابوزئی، جس کے ساتھ مفتی شہیدؒ کا قلبی لگاؤ تھا، اس نسبت سے کہ استاد محترم کا آبائی گاؤں ہے، اسی نسبت کی لاج رکھتے ہوئے اس دور دراز گاؤں میں وہ متعدد بار تشریف لائے، بیوی بچوں کو بھی ساتھ لائے، کئی کئی دن اس طرح رہے، جیسے اپنا آبائی گاؤں ہو، وہاں کے لوگوں سے جان پہچان ہو گئی تھی، استاد جی کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ ایسا تعلق بن گیا، جیسے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، اس کی گلی کو چوں سے خوب واقفیت تھی، اس کے پہاڑوں، صحراؤں اور لہلہاتے کھیتوں میں تفریح کے لیے یہاں کے بایسوں کی طرح آنا جانا رہتا، حالانکہ زبان مختلف، کچر مختلف۔ کہاں کراچی کا باسی اور کہاں خیبر پختونخوا کا ایک پس ماندہ دیہات، لیکن ان کی تو حالت یہ تھی کہ ۔

فَأَقْبَلَ ذَا الْجِدَارِ وَ ذَا الْجِدَارِ

وَلَقَدْ أُمِرُ عَلَى الدِّيارِ دِيارِ لیلی

فما حُبَّ الدِّيارِ شَغَفْنَ قَلْبِي

وَلَكِنْ حُبٌّ مَنْ سَكَنَ الدِّيارِ

میں لیلیٰ کے گھروں کے درود یوار کے پاس سے گزرا، تو کبھی اس دیوار کو بوسا دینے لگا اور کبھی اُس دیوار کو۔ پس ان درود یوار کی محبت نے میری دل میں جگہ نہیں بنائی تھی، بلکہ یہاں کے باسیوں کی محبت نے جگہ بنائی تھی۔

مولانا نے یہ تجویز سامنے رکھ کر ان کو صبح تک فیصلہ کرنے کا وقت دیا، تمام رشتہ داروں نے رات ہی کو مولانا کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے یہ دانش مندانہ فیصلہ کیا کہ مفتی عرفان شہیدؒ جس طرح استاد جی کے رفیق سفر و حضر تھے، داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے ساتھ تھے، تو اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن کے رفیق مزار بھی رہیں۔ مولانا شہیدؒ کی تدفین کے بعد تقریباً رات نو بجے تک یہ غریب الدیار لاش گاؤں پہنچ گئی، الجامعہ الاسلامیہ بابوزئی کے چمن میں رکھی گئی، رات دس بجے گاؤں کے جنازہ گاہ میں نماز جنازہ کا وقت مقرر کیا گیا، دن بھر کے انتظار اور مولانا شہیدؒ کی تدفین سے فارغ ہونے والے تھکے ماندے لوگ جنازہ گاہ میں جمع تھے، ایک ہی دن میں دوسری مرتبہ جنازہ گاہ میں اس عقیدت و احترام کے ساتھ موجود تھے، جس طرح اپنے کسی عزیز کے جنازے میں شریک ہوتے ہیں، جنازہ گاہ کچھ کچھ بھری ہوئی تھی، صف بندی ہوئی، پہلی مرتبہ یہاں کے درود یوار نے اتنے انسانی سروں کو دیکھا، جو سفر عدم پر جانے والے کو الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ برادر م مولانا امداد اللہ صاحب نے اسپیکر ہاتھ میں لیا اور آنسو بہاتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ فرمانے لگے ”گاؤں والو! مفتی عرفان شہیدؒ جس طرح زندگی میں ہمارے مہمان تھے، آپ لوگ اسلامی و علاقائی روایات کے مطابق ان کی مہمان نوازی کیا کرتے تھے، شہادت کے بعد یہاں کی مٹی میں مدفون ہو کر اب یہ مستقل طور پر ہمارے مہمان بن گئے ہیں، ہم سب نے ان کی اسی طرح مہمان نوازی کرنی ہے، یہ ہمارا اسلامی فریضہ ہے۔ ان کلمات نے تو لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا، ہر طرف سے آہ و بکا کی آوازیں آنے لگیں، برادر م مولانا سید سلیمان بنوری نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مفتی عرفان شہیدؒ کا زندگی میں معمول یہ تھا کہ نماز عصر سے لیکر رات گئے تک استاد جی کے ساتھ رہتے اور گیارہ بارہ بجے رخصت ہو کر اپنے بچوں کے پاس آتے، لیکن آج رات تقریباً گیارہ بجے کے قریب استاد جی شہیدؒ کے پہلو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی آخری مسکن میں ابدی نیند سو گئے:

وَالْكُلُّ يَذْكُرُ صَفْوَهُ وَمُحِبَّهُ (عِرْفَانَهُ) ذَاكَ الصَّفِيِّ لَوْفَائِهِ

ہر ایک کی زبان پر استاد جی کے با صفا دوست ان کے اپنے عرفان کے چرچے ہیں، اور استاد جی کو دل سے چاہنے والے وہی سچے دوست ہیں، جس نے وفاداری نبھائی ہے۔

مفتی عرفان شہیدؒ، مولانا شہیدؒ کے دیگر شاگردوں اور متعلقین پر یہاں بھی سبقت لے جاتے ہوئے اس سعادت سے سرفراز ہوئے کہ مولانا شہیدؒ کے ہزاروں شاگرد اور اعزہ و اقرباء جب بلاناغہ، روزانہ قبروں کے پاس سے گزرتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں گے، تو ان دعاؤں میں پورا پورا حصہ پائیں گے

این سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشنده

چار گھنٹوں کی تاخیر پر استاد جی کی روح نے ضرور کہا ہوگا کہ یا را بھی تک کہاں تھے؟ تاخیر کیوں کی؟ اور پھر یقیناً فرشتوں نے کہا ہوگا: ”نَمْ كُنْوَ مَةِ الْعَرُوسِ فَرِحْمَهُمَا اللَّهُ رَحْمَةً وَاسِعَةً“

مولانا شہیدؒ کی ہمیشہ رحمہما اللہ:

عمر کے لحاظ سے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھیں، زندگی بھر گھر میں رہیں، صرف دو مرتبہ گھر سے باہر سفر پر جانے کا اتفاق ہوا، پہلی مرتبہ جب پچھلے سال (۲۰۱۱ء) فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسباب بنائے، حج فرض نہیں تھا، پھر ارادہ کرنے کے باوجود حج کے داخلے کے آخری ایام میں چند وجوہات کی بناء پر ظاہری حالات یوں بنے کہ پروگرام موقوف ہو جائے اور آئندہ سال یعنی (۲۰۱۲ء) میں فریضہ حج کی ادائیگی کی سعادت حاصل کرے۔ میری یہی رائے تھی، اگر برادر م حفظ الرحمن صاحب بھی ہمت ہار جاتے اور اپنی رائے پر اصرار نہ کرتے، تو شاید وہ فریضہ حج کی ادائیگی اور مشاعر حج کی زیارت بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتیں۔ علم خضر سے سے محروم انسان ایسے ہی پروگرام بناتے رہتے ہیں، حج کے پروگرام کو آئندہ سال تک موقوف کرنے والی ہماری رائے پر ارادہ خداوندی ضرور زیر لب مسکرایا ہوگا کہ نا واقف لوگو! آئندہ سال تو وہ اس دنیا میں نہیں ہوں گی، جب کہ قدرت کو ایسا منظور تھا کہ ظاہری اسباب نہ ہونے کے باوجود وہ اللہ کے گھر اور مشاعر حج کی زیارت کرنے اور فریضہ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ہی وہ دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ سفر حج پر جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے صرف تین تین گھنٹے کے لیے کراچی میں قیام رہا تھا۔ پھر دوسری مرتبہ وہ گھر سے اس وقت نکلی، جب کراچی میں ایک عزیز کی تعزیت کے لیے رخت سفر باندھا اور یہی سفر ان کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا، گویا زندگی میں گھر سے باہر سفر پر

جانادومرتبہ نصیب ہوا اور واپس آنا، ایک دفعہ۔ میری پھوپھی محترمہ (مرحومہ کی ساس) نے بتایا کہ کراچی روانگی کے وقت سوئے ہوئے اپنے چھوٹے بچوں کے چہروں سے چادر اٹھائی، پیار کی نگاہ سے دیکھا، جگایا اس لیے نہیں کہ پھر وہ ساتھ جانے کے لیے ضد کرتے، گھر سے نکلتے وقت یہ ”وصیت“ کی کہ فلاں خاتون کے ذمے تین سو روپے ایک قرضہ ہے اور دو ہزار روپے دوسرا قرضہ اور بصراحت کہا کہ میرے ذمے کسی کا قرضہ نہیں، گویا اپنے بھائی جان (مولانا شہیدؒ) کی طرح دوسروں کے قرضوں کے بوجھ سے آزاد ہو کر اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت میں چلی گئیں۔

وَمَاتَتْ أَخْتُهُ أَيُّضًا كَذَٰكَ فَتِلْكَ بَلِيَّةٌ بَعْدَ الْبَلَاءِ

اور بہن بھی بھائی کی طرح شان سے جام شہادت نوش کر گئی، دونوں کی ایک ساتھ وفات مصیبت بالامصیبت ہے۔

(۲۳۰۰ روپے کا وہ قرضہ بھی اللہ والے اہل و عیال نے شہیدہ کے ایصالِ ثواب کے لیے اس خاتون کو بخش دیا)۔

کراچی سے واپسی کے کئی پروگرام بنتے اور ٹوٹتے رہے، شہادت کے دن سے دودن قبل مولانا امداد اللہ صاحب کے بچے بذریعہ بس گاؤں کے لیے عازم سفر تھے۔ دومرتبہ مولانا شہیدؒ سے کہا کہ مرحومہ میرے بچوں کے ساتھ چلی جائے گی۔ کرشمہ تقدیر دیکھئے کہ مولانا شہیدؒ بھوجا ایئر لائن میں ساتھ سفر کے فیصلے پر ہی قائم رہے، حالانکہ مزاج یہی تھا اور اس کے مطابق زندگی بھر معمول یہی رہا کہ بامر مجبوری خواتین کے ساتھ سفر کرتے۔ دلیل یہ دی کہ بہن پہلی مرتبہ کراچی آئی ہے، تو اعزاز و اکرام کے ساتھ گاؤں واپس جائے، اور محرم کے ساتھ سفر بھی ہو جائے۔ واقعاً اعزاز و اکرام سے نوازی گئی، لاکھوں شاگردوں اور عقیدت مندوں کی عقیدت و احترام کا محور و مرکز ایک عظیم بھائی کے ساتھ شہادت کی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ نام لیا گیا، دعاؤں میں یاد کی گئی اور یاد کی جا رہی ہے اور نام ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید رہے گا۔ (ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما) مرحومہ کے اس انداز میں درجہ شہادت پر فائز ہونے نے اس اعتقاد کو مزید پختہ کر دیا کہ اس پورے واقعہ میں کوئی بات اتفاقی نہیں تھی، نوشتہ تقدیر تھا، ایک اٹل فیصلہ تھا، سب کچھ اپنے وقت پر ہوا، ایک لمحہ کے لیے تقدیم و تاخیر کی گنجائش نہیں تھی ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كَتَبْنَا مُوَدَّتَهُ﴾ لاش کی پہچان بروقت نہیں ہوئی، ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے پہچان تک معاملہ مؤخر ہوا، جو سب کے لیے بالعموم اور افراد خانہ کے لیے بالخصوص ایک طویل، پریشان کن، مزید الم و کرب میں مبتلا کرنے اور صبر آزمائیاں بلکہ ایام سے گزارنے کا باعث بنا۔ یہ دس دن کیسے گزرے؟ بیان سے باہر ہے۔ دسویں دن لاش کی شناخت کے بعد پتہ چلا کہ اس لاش کو دو تین مرتبہ ملاحظہ کیا گیا تھا، تاہم خاتون ہونے کے ناطے شناخت میں مشکل پیش آئی، افراد خانہ یا دیگر خواتین کے لیے شناخت ممکن ہوتی، لیکن ان کو لاشوں والی جگہ میں لے جانا مناسب یا ممکن نہیں تھا۔ دراصل اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ ہمیں آزمائش در آزمائش سے گزار کر ابتلا و آزمائش کے وقت اپنی نوازشات و انعامات کی طرف متوجہ کر دیں اور شکر ادا کرنے کا موقع دیں، اس ایک لاش کے متعلق دس دن تک الم و کرب کی کیفیت سے گزار کر سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر اس لاش کی شناخت دسویں دن بھی نہ ہوتی؟ اور ناقابل شناخت قرار دے کر یوں ہی دفنا دیا جاتا؟ اس لاش کی طرح دیگر دولاشوں کی بھی شناخت نہ ہوتی؟ اس لاش کی شناخت پہلے دن ہوتی، اور مولانا شہیدؒ کی لاش کی شناخت مؤخر ہو جاتی؟ یہ اور اس طرح کے کئی سوالات اور صورتیں ذہن میں آتی رہیں، اور یوں زبان اور دل دونوں سے اس بات پر شکر ادا کرنے کا موقع ہاتھ آیا کہ مولانا شہیدؒ کی لاش کی شناخت فوری طور پر ہوئی، لاش سالم تھی، مفتی عرفان شہیدؒ کی لاش کی شناخت بھی بروقت ہوئی، تیسری لاش کی بھی شناخت، تاخیر سے صحیح، پر ہو تو گئی، بہر حال وقوعہ کے دسویں دن بروز پیر بوقت عشاء مرحومہ کی لاش گاؤں پہنچ گئی، دس دن تک مسلسل الم و کرب کی کیفیت میں گزارنے کے بعد گویا یہ غم پھر سے تازہ ہو گیا۔

وَلَكِنْ نِكَاءُ الْقَرْحِ بِالْقَرْحِ أَوْجَعُ

”زخم کے اوپر زخم زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے“

بعد از نماز عشاء بوقت دس بجے گاؤں کی جنازہ گاہ میں برادر م مولانا امداد اللہ صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور گیارہ بجے تدفین کا عمل مکمل ہوا، تینوں چھوٹے بھائیوں نے تابوت کو قبر میں اتارا اور مرحومہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے عظیم بھائی مولانا شہیدؒ کے پہلو میں اپنے آخری مسکن میں آرام فرما ہوئیں اور یوں بابوزئی کے قبرستان کے اس احاطہ میں تین شہداء کی قبروں کا اضافہ ہوا جو ہزاروں بندگان خدا کی آمد کا ذریعہ بن رہی ہیں، جوان مزاروں پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں، جن میں اس شہرِ نموشاں کے بانیوں کے ساتھ اس دور دراز پس ماندہ گاؤں کے خوش قسمت لوگوں کا بھی ضرور حصہ ہوگا، علماء، صلحاء اور تشنگانِ علوم دینیہ کی آمد و رفت اور دعاؤں کے نتیجے میں یہ گاؤں اور پورا علاقہ ان شاء اللہ دین کی نشر و اشاعت کا مرکز و منبع بنے گا۔

فَرِحَ حَمَلُهُمُ اللَّهُ حِمَّةً وَاسِعَةً.



مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے والد گرامی، تسلیم و رضا کے پیکر مجسم

حضرت مولانا انعام اللہ صاحب

ناظم تعلیمات و استاذ الحدیث جامعہ محمدیہ اسلام آباد



وَإِنَّ أَبَا عَطَاءٍ ذُو كُرُوبٍ: يُعْزِيهِ جَمِيعُ الْأَصْدِقَاءِ

وَرَأَى بِالْقَضَاءِ مِنَ الْإِلَهِ: وَقَاهُ اللَّهُ أَهْلُ لِلشَّاءِ

(شیخ عطاء (شہید) کے والد گرامی کئی حوالوں سے غم و کرب سے دوچار ہیں اور تمام دوست احباب ان کو تعزیت کر رہے ہیں۔ قضا الہی پر راضی ہیں، اللہ ان کو اپنی حفاظت میں رکھیں قابل تعریف شخص ہیں)

مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے تمام متعلقین، شاگرد اور دوست احباب جانتے ہیں کہ آپ کے والدین گرامین عمر کے اعتبار سے قرآنی شہادت حقہ کے مطابق ”ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً.“ کے زندہ مصداق ہیں، بالخصوص والد گرامی جن کی عمر اس وقت ۸۰ سال ہے، شوگر و قلب کا عارضہ لاحق ہے، ٹانگ ٹوٹنے کی وجہ سے صاحب فراش ہیں۔ انہی کی عیادت و تطیب قلب کی خاطر مولانا شہیدؒ بار بار گاؤں حاضری دیتے تھے۔ شہادت والا سفر بھی محض اس مقصد کے تحت ترتیب دیا گیا تھا کہ بوڑھے والدین کی زیارت، عیادت و خدمت کی سعادت حاصل کی جائے۔ ایسے میں یہ سفر ان کی اچانک موت کا پیام لے آیا، جو اعزہ و اقرباء، دوست احباب اور جان پہچان والوں کے علاوہ اجنبیوں کے لیے بھی ناقابل برداشت صدمہ کی شکل اختیار کر گیا، ایسے والدین کی کیا حالت رہی ہوگی، بالخصوص والد گرامی کی؟ اس لیے جس واقف حال نے بھی تعزیت کی غرض سے رابطہ کیا، پہلا سوال یہ کیا کہ ”مولانا کے والد صاحب کا کیا حال ہے؟“ اس سوال کے پیچھے مولانا شہیدؒ کی زندگی بھر کا والدین کے بارے میں حسن و سلوک پر مبنی طرز عمل مضمر ہے، آپ اپنے تمام متعلقین کو والد گرامی کی صحت و بیماری کے حالات کے بارے میں بتلاتے اور والد گرامی کو متعلقین کے احوال سے باخبر رکھتے۔ اس دو طرفہ حسن سلوک کا ہی نتیجہ تھا کہ ہر ایک دوست کو مولانا کے والد گرامی کے متعلق پریشانی لاحق رہی، جس کا اظہار وہ متذکرہ بالا سوال کی صورت میں کرتے ہیں۔ سانحہ وقوع پذیر ہونے کے بعد واقعہً یہی ایک اہم مرحلہ تھا کہ والد گرامی کو بیٹے، بیٹی اور خاندان کے ایک فرد کی طرح کے دوست کی اچانک المناک موت کی خبر سے کس طرح مطلع کیا جائے؟ ان کو مطلع کرنے کی جرأت کون کرے؟ اس اطلاع کے بعد وہ کس کیفیت سے دوچار ہوں گے؟ مولانا شعیب صاحب جیسے بلند ہمت شخص نے تو دو لوگ انداز میں یہ ذمہ داری اٹھانے سے صاف انکار کر دیا، میرے بھائی حافظ احسان اللہ نے اس تاکید کے ساتھ فون پر بات کروادی کہ ٹالنے کی کوشش کریں۔ کوشش تو کی! لیکن ایک ایسے سانحہ کی خبر کو کس طرح خفیہ رکھا جاسکتا تھا، جس کی نوعیت مرحومین کے مرثیہ خوانوں کے الفاظ میں کچھ یوں ہو۔

وَتَوَجَّعَ الْمَاءُ عَلَى لَأَوَائِهِ
فَزَعَزَعَ كُلُّنَا قَبْلَ الْعِشَاءِ
وَضَوْضَاءَ وَذَا وَقْتُ الْمَسَاءِ

هَذَا لَعَمْرُ اللَّهِ سَاعَةً حَسْرَةً
أَتَى نَبَأًا عَظِيمًا ذُو شُجُونٍ
فَفَى الْغَبْرَاءِ وَالْخَضِرَاءِ صَبْحٌ

بخدا یہی الم و کرب اور افسوس کی گھڑی ہے جس کی شدت اور رنج و تکلیف مزید درد و اذیت کا باعث بن رہا ہے۔

عشاء سے پہلے غم و اندوہ والی بہت بڑی خبر آئی، جس نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا۔

زمین کی وسعتوں اور آسمان کی بلندیوں میں چیخ و پکار اور شور و غوغا مچا ہوا تھا اور اسی وقت شام کے اندھیرے چھا رہے تھے۔

یہ منظر کشی محض شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت بھی یہی تھی، جدید ترقی کا کرشمہ کہیے کہ ہوا کے دوش پر الیکٹرانک میڈیا نے آنکھ جھپکنے میں ہر سو یہ خبر پھیلائی، جام شہادت نوش کرنے والے تمام مسافروں کے نام نشر ہونے لگے، مولانا شہیدؒ کا نام حادثہ کا شکار ہونے والی مشہور شخصیات کی فہرست کی زینت بننے لگا۔ مزید برآں ماموں جان، جن کو بچپن سے ہی ماما جی کہہ کر پکارتے ہیں، کی عادت یہ ہے کہ وہ ہر بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں، ہر معاملے کی تفصیلات سے باخبر رہنا چاہتے

ہیں، قابل تحسین امور پر تحسین و تشجیع فرماتے ہیں اور اصلاح طلب امور کی اصلاح و تصحیح فرماتے ہیں۔ بالخصوص روانگی کے وقت سفر کا شیڈول بتانے اور واپسی پر سفر کی روداد سنانے سے ان کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ کو اپنے والد محترم کی اس عادت شریفہ کا خوب علم تھا۔ تطیب قلب کے لیے آپ کو تفصیلات بتانے کا پورا پورا اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ کراچی تا اسلام آباد تا بابوزئی اس (آخری) سفر کی تفصیل بھی ماما جی کو معلوم تھی۔ انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ پانچ بجے جب کراچی سے روانگی کا وقت ہے، تو رے بجے اسلام آباد پہنچنا ہے اور پہنچ کر ہی بذریعہ فون اپنی آمد سے مطلع کرنا ہے۔ آٹھ بجے تک جب کسی قسم کی اطلاع نہیں ملی تو ان کا پریشان ہونا یقینی تھا، اُن کے تمام مزاج شناس اس بات سے واقف تھے۔ برادرِ مہتمم حفظ الرحمن صاحب نے سانحہ واقع ہونے کے فوراً بعد ایئر پورٹ ہی سے مجھے بذریعہ فون بتایا کہ دادا جی (والد محترم) سے ریڈیو ہٹوانے کا اہتمام کیا جائے، تاکہ ان کو خبر نامے کے ذریعے اطلاع نہ ہو، لیکن ان کی زیرک مزاجی سے واقفیت تھی، اس لیے میں نے عرض کیا، یہ کیسے ممکن ہے؟ اور اس سے تو ان کو پختہ یقین ہو جائے گا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔

یہ اطلاع ان کو کیسے پہنچی؟ اور رات کیسے گزاری؟ بعد میں خود فرمانے لگے کہ آپ لوگ تو مجھے نہیں بتا رہے تھے اور میرے پاس رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، میں چلنے پھرنے سے قاصر تھا، مولانا کی والدہ محترمہ نے کئی مرتبہ احمد الرحمن کو تلاش کیا، مگر وہ بھی اپنے کمرے میں موجود نہیں تھے، لیکن مجھے رات آٹھ بجے ریڈیو کے خبر نامہ سے واقع کی اطلاع ہوئی اور نوبے بجے خبروں میں ان کے نام بھی نشر ہونے لگے، میں اپنے بچوں کے نام پہنچانے میں کیسے غلطی کرتا، جب کہ ریڈیو والے وہی نام نشر کر رہے تھے جو پیدائش کے وقت میں نے رکھے تھے۔ اس تمام اذیت ناک صورتحال کے باوجود آپ صبر و حوصلہ اور تسلیم و رضا کا پیکر مجسم بنے ہوئے تھے، رات ہی رات مولانا شہیدؒ کی والدہ کو تسلی دیتے ہوئے ماضی کے چند الم ناک واقعات کا حوالہ دیا کہ اُن کو یاد کر کے اپنے غم کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کریں، بہر حال بڑھاپے، ضعف اور بیماری کی حالت میں المناک طریقے سے عظیم بیٹے، معصوم بیٹی اور گھر کے تمام افراد کے پیارے اور محبوب دوست کی اچانک جدائی کی شدت کو بیان کرنے کے لیے کسی شاعر کی قادر الکلامی ہی کافی ہو سکتی ہے۔

صُبَّتْ عَلَى الْآيَّامِ صِرُنَ لَيْالِي

صُبَّتْ عَلَى مَصَائِبَ لَوَائِهَا

ایسی شدید مصیبتوں کے پہاڑ مجھ پر ڈھائے گئے، اگر دنوں کے اوپر ڈھائے جاتے تو وہ دن ان کی شدت کی وجہ سے راتوں میں تبدیل ہو جاتے (غالباً اس

طرح کے حادثات کے لیے کہا گیا ہے۔

حادثے کے بعد ماموں جان کے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں؟ کس طرح کی کیفیات و احساسات سے دوچار ہوتے ہیں؟ اس کا اندازہ ہر وہ شخص لگا سکتا ہے، جو ان کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے گفتگو کرے۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے افراد خانہ اور دیگر دوست احباب صاف طور پر محسوس کرتے ہیں کہ آپ مختلف اور متضاد کیفیات و احساسات کی حالت میں حیات مستعار کے باقی ماندہ لمحات اور شب و روز کاٹ رہے ہیں۔ پشتو، اردو اور فارسی ادب شناس ہیں، اور موقع شناس بھی، اس لیے اپنے احساسات و کیفیات کے اظہار میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں کرتے۔ حال دل کو زبانِ قال کے ذریعے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اچھی طرح جانتے بھی ہیں کہ تکلیف اور درد کی حالت میں مومن کی شان کیا ہونی چاہیے، لیکن اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ مولانا شہیدؒ کی وفات سب کے لیے کتنا بڑا المیہ ہے۔ آس و یاس کی ان مختلف کیفیات سے جب گزرتے ہیں، تو مناسب حال واقعات اور اشعار سناتے ہیں۔ آنسو تو تقریباً ہر وقت ان کی آنکھوں سے جاری رہتے ہیں، لیکن عموماً تسلیم و رضا والی کیفیت غالب رہتی ہے اور جب بھی تعزیت کے لیے کوئی آتا ہے تو ان کے سامنے زبان سے اس کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ”رضا بالقضا“ اور کبھی علامہ اقبال کے اس شعر کا سہارا لیتے ہیں۔

بخش

تسلیم

منزل

را

رو

رہ

بخش

ابراہیم

ایمان

قدرت

ایک عظیم بیٹے اور معصوم بیٹی کی اندوہناک طریقے سے اچانک جدائی کا صدمہ بوڑھے، نجیف اور صاحب فراش والدین کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے، صبر یعقوبی کے بغیر اس کو سہا نہیں جاسکتا۔ ماموں جان اپنے آپ کو اور ہم سب کو تسلی دینے کے لیے اس عظیم صدمے میں بھی مثبت پہلو تلاش کرتے ہیں، سانحے کے چوتھے پانچویں دن، جب زخم ابھی ابھی تازہ تھا، میں نے ایک گھریلو مجلس میں افراد خانہ کے سامنے اس بات کا اظہار کیا کہ درحقیقت ماموں جان مولانا شہیدؒ کی ہر ترقی

مولانا شہیدؒ کی توساری ہی زندگی قابل رشک تھی، تو ماموں جان بہت خوش ہوتے اور اس خوشی کا اظہار بھی فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ شہادت کے ذریعے مولانا شہیدؒ کو ملنے والے مقام کا بھی مشاہدہ ان کو زندگی میں کرائیں، اس لیے اس ضعف کے باوجود اللہ نے اس سانحہ کا مشاہدہ ان کو کرایا، صدمے کو برداشت کرنے کی ہمت دی۔ حاضرین مجلس میں سے کسی نے کہا کہ ماموں جان کل خود بھی ایک بے تکلف قریبی دوست کے سامنے یہی بات ارشاد فرما رہے تھے۔ اگلے دن میں نے ان کے سامنے خیالات کے اس توارد و توافق کا تذکرہ کیا تو خاموشی سے سنتے رہے، میری بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر خاموش رہے پھر ہاتھ کے اشارے سے حیرت و استعجاب کا اظہار کیا، روتے ہوئے پشتوزبان میں حافظ الپوری کے حسب ذیل اشعار سنائے، جو انہوں نے اپنے جوان عمر بیٹے ”اولیاء“ کی وفات پر کہے تھے۔

ہخ طوطی چہ چغیدہ چغا اوس ولے نہ کہ مرگی یہ مہر پہ خلعے تیخے دے گویا بہ نشی

وہ چچھاتا ہوا طوطی اب کیوں نہیں چچھاتا؟ درحقیقت موت نے ان کے لبوں پر مہر نمشی لگا دی ہے، اس لیے اب کبھی بھی نہیں بولے گا۔

سپین کٹہ بازم پہ منگل ناست وو، ناسا پہ والوت کہ درست جہاں پسے پرہ کمہ نورہ بہ نشی

خوبصورت سفید باز میری کلائی پر بیٹھا ہوا تھا، جو اچانک اڑ گیا، اب اگر میں ان کی تلاش میں سارا جہاں چھان ماروں، تو واپس نہیں آئے گا۔

اصلی گوہر زما دلا سہ پہ دریاب کے ڈوب شہ کہ ڈک سندرہ نہ پسے اوج کڑمہ پیدا بہ نشی

حقیقی گوہر نایاب میرے ہاتھ سے دریا برد ہو گیا، اب اگر میں موجیں مارتے ہوئے دریاؤں کے پانی کو بھی سکھاؤں، اور ان کو ڈھونڈوں، تو نہیں ملے گا۔

کہ پہ جہان کے نئے بشرے دمہر یا نوشتہ دے حافظ بہ نئے سہ کاندے پہ سیرد (اولیاء) بہ نشی

اگر اس دنیا میں مہ جبینوں کے خوبصورت چہرے موجود ہیں، تو حافظ نے ان سے کیا لینا ہے؟ وہ میرے پیارے بیٹے ”اولیاء“ (عطاء) کی طرح خوبصورت نہیں۔

یاس کی کیفیت میں ایک غمگین والد کی حقیقی دلی کیفیت کی برجستہ اور بر محل ترجمانی نے فضا کو سوگ وار بنایا اور مجھے رونے پر برا بیچنے کیا۔ ”افسردہ دل، افسردہ کندا نچنے را“۔ سانحہ کے بعد کم ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہے کہ ہم افراد خانہ حاضر خدمت ہوں اور ماموں جان کے رونے کی وجہ سے فضا سوگ وار نہ ہو اور ہماری آنکھوں سے بھی آنسو نہ ٹپکے ہوں۔

ماموں جان ساری زندگی شعبہ تدریس سے متعلق رہے ہیں، بلاناغہ ڈیوٹی سرانجام دینا اور بروقت مقام کار پر پہنچنا نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ ہمیں بھی اس کی تلقین اور بروقت ضرورت سرزنش کرتے رہے ہیں۔ اس سانحہ سے پہلے جب بھی ہم لوگ، جو تقریباً سب کے سب مدارس دینیہ میں تعلیم و تعلم کے شعبہ سے منسلک ہیں، ملک کے اندر یا بیرون ملک مقام کار پر جانے کے لیے رخت سفر باندھتے، اجازت لینے اور الوداعی ملاقات کے لیے حاضر خدمت ہوتے، تو سفر کی تفصیلات معلوم کرتے، خوشی کا اظہار فرماتے اور بالخصوص صاحب فراش ہونے سے پہلے کبھی بھی اظہار غم نہیں کیا، جیسا کہ عموماً ایسے مواقع پر کیا جاتا ہے۔ لیکن سانحہ کے تقریباً پندرہ دن بعد جب مولانا شہیدؒ کے تین طالب علم بیٹوں کی کراچی جانے کے متعلق مولانا امدا اللہ صاحب نے اُن کی رائے معلوم کی، تو بے اختیار ایسے روئے کہ سب حاضرین مجلس کو رلا دیا۔ اسی مجلس میں مولانا امدا اللہ صاحب ایک اور معاملے کے بارے میں بھی مشاورت کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کی حالت دیکھ کر اپنے اندر بات کرنے کی جرات نہ پاسکے۔ ابھی چند دن پہلے میں نے خیریت دریافت کی، تو فرمانے لگے کہ ”پوری رات آنسو بہنے میں گزر جاتی ہے جس کی وجہ سے بینائی مزید متاثر ہوئی ہے“۔ گویا ”یَا سَفْیٰ عَلٰی یُوسُفَ وَ اَبِیْصَتْ عَیْنُہُ مِنَ الْحُزْنِ فَہُوَ کَظِیْمٌ“ کے مصداق ہیں۔ لیکن بایں ہمہ غم و ہموں، تعزیت کے لیے آنے والے تمام مہمانوں سے صبر و حوصلہ سے بات کرتے ہیں، اُن کی خیریت دریافت کرتے ہیں، حال احوال معلوم کرتے ہیں اور تسلیم و رضا پر مبنی گفتگو فرماتے ہیں، اور دعاؤں کے ساتھ ان کو رخصت فرماتے ہیں۔

مولانا کی شہادت کے بعد سے یہ معمول ہے کہ نماز عصر و مغرب مسجد میں باجماعت ادا فرماتے ہیں اور درمیانی وقفہ مسجد ہی میں تشریف فرما رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

والدین کو اولاد کی جدائی کے اس غم کو تحمل و حوصلہ سے برداشت کرنے کی توفیق مرحمت فرمائیں اور اُن کا سایہ تادیر ہم سب پر برقرار رکھیں، آمین۔

(ماہنامہ مینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)



”ہمہ یاران بہشت“

حضرت مولانا مفتی مزمل حسین کا پڑیا صاحب

نائب رئیس اقرء روضۃ الاطفال

ازل سے یونہی ہوتا آرہا ہے کہ جو دنیا میں آتا ہے وہ اپنا مقررہ وقت پورا کر کے چلا جاتا ہے بہانہ کچھ بھی بنے بہر حال ہر شخص کو اپنے مقررہ وقت پر اس کا روان رنگ و بو کو چھوڑ کر جانا پڑتا ہے، یہ نظام ابتدائے آفرینش سے یونہی چلا آرہا ہے۔ سوائے خدائے وحدہ لا شریک لہ کے کسی کو بقا نہیں ہے۔ ہر جانے والا اپنے پیچھے ایک خلا چھوڑ جاتا ہے۔ کچھ دن اس کے تذکرے ہوتے ہیں۔ پھر زندگی کی سبک رفتاری اسے نسیاً منسیاً کر دیتی ہے۔ لیکن جانے والی کچھ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے راہی عدم ہونے سے شمع بزم بجھ جاتی ہے، انجمن تار یک ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا گردش مدام تھم گئی، مدتوں بعد بھی کوئی ایسا پیدا نہیں ہوتا جو ان کے چلے جانے سے پیدا ہو جانے والے خلا کو پُر سکے۔ بقول متنبی ے

ولقد أتتني فجعزني عن نظرائه

مضت الدهور وما أتيت بمثلہ

ان کی یادیں مدتوں تک تازہ رہتی ہیں اور ان کے فیوض و برکات ان کے چلے جانے کے بعد بھی تادیر محسوس ہوتے رہتے ہیں۔ میری زندگی کا ایک طویل حصہ الحمد للہ انہی جیسی مبارک ہستیوں کے درمیان گزرا۔ کیا کیا نام گنواؤں؟ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ سے لے کر حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید نور اللہ مرقدہ تک تابندہ ستاروں کی ایک کہکشاں ہے جن کی چمک دمک سے ایک عالم منور رہا ہے۔

ہمارے بھائی، ہمارے دوست مولانا عطاء الرحمن شہید نور اللہ مرقدہ بھی اسی تابناک لڑی کے ایک درخشندہ ستارے تھے، مولانا مرحوم سے میری واقفیت اپنے طالب علمی کے زمانہ سے تھی جب میں اور مولانا جامعہ علوم اسلامیہ میں زیر تعلیم تھے۔ گو کہ مولانا میرے ہم درس نہیں رہے۔ غالباً ہمارے دورہ حدیث کے سال مولانا مرحوم سادسہ یا سابعہ میں تھے البتہ چونکہ اس زمانہ میں ویسے ہی طلبہ کا یہ ازدحام نہ تھا۔ جو الحمد للہ آج نظر آتا ہے اور بالخصوص کراچی کے شہری طلبہ تو خال خال ہی ہوتے تھے لہذا طلبہ کی آپس میں واقفیت ہوتی تھی اور کسی نہ کسی طور آپس میں رابطہ رہتا تھا، یوں ہمارا بھی آپس میں رابطہ رہتا تھا گو بہت زیادہ میل ملاپ کے مواقع تعلیمی مشغولی کی وجہ سے نہ مل پاتے تھے۔ فراغت کے بعد جب اساتذہ بالخصوص حضرت مفتی احمد الرحمن صاحب، مفتی ولی حسن صاحب وغیرہ سے ملاقات کے لیے جامعہ حاضری ہوتی تو مولانا مرحوم سے بھی ملاقات ہو جاتی کہ مولانا ابتداً درجہ تخصص کے طالب علم رہے اور پھر ان کا جامعہ میں بطور مدرس تقرر ہو چکا تھا۔

۱۹۸۲ء میں جب اکابر اہل اللہ، خصوصیت سے جامعہ کے اکابر کے ایما پر اقرء روضۃ الاطفال کا قیام ہوا تو مولانا مرحوم سے کبھی کبھی اقرء کے موضوع پر بھی گفتگو ہو جاتی۔ مولانا کو بھی اکابر جامعہ کی طرح اس ادارے پر اعتماد تھا اور وہ بھی اکابر کی طرح اس ادارے کو اپنا ادارہ سمجھتے تھے اور اسے وقت کی اہم ضرورت خیال کرتے تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اکابر نے الحمد للہ ہمیشہ ہماری سرپرستی فرمائی ہے۔ اقرء کے پہلے صدر جامعہ علوم اسلامیہ کے سابق شیخ الحدیث اور سابق رئیس دارالافتاء مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکی نور اللہ مرقدہ تھے۔ اسی طرح مہتمم جامعہ حضرت مفتی احمد الرحمن نور اللہ مرقدہ اقرء کو اپنا ہی ادارہ سمجھتے تھے۔ چونکہ حضرت مفتی صاحب کو مفتی محمد جمیل خان شہید سے وہی تعلق تھا جو ایک والد کو اپنے ہونہار فرزند سے ہوتا ہے۔ دوسری جانب مفتی محمد جمیل خان بھی مفتی صاحب کو اپنا سب کچھ سمجھتے تھے لہذا اقرء پر حضرت مفتی صاحب کی شفقتیں بے حد ہوا کرتی تھیں۔ کسی مہمان کی آمد پر حضرت مفتی صاحب جیسے جامعہ کا تعارف کراتے ویسے ہی اقرء کا بھی تعارف کرایا کرتے تھے۔ آج کل بھی ہمارے مخدوم رئیس الجامعہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہم العالی اقرء کے سرپرست ہیں۔ ان حضرات کی پیروی میں مولانا مرحوم سے بھی ہمارا اعتماد کا ایک رشتہ تھا اور جامعہ کے فضلاء میں سے جو احباب اقرء میں خدمات سرانجام دینے کا ارادہ کرتے مولانا ان کی تصویب فرماتے، ان کی ہمت بڑھاتے تھے بلکہ ہمارے رفیق کار مفتی طلحہ منیر صاحب سمیت کئی فضلاء کو مولانا نے از خود اس طرف توجہ دلائی کہ وہ اقرء میں خدمات سرانجام دیں۔ مشاغل کے ہجوم اور عوارض کی کثرت کی بنا پر گو کہ مولانا سے بہت ملاقات نہ ہو پاتی تھی لیکن جب بھی ملاقات ہوتی مولانا بہت بشاشت سے ملا کرتے بلکہ اکثر کہا کرتے کہ مبین کمیونٹی میں درس نظامی کی تحصیل کی ابتدا آپ سے ہوئی ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ بندہ اپنی کمیونٹی کے ان ابتدائی افراد میں سے ہے جنہوں نے جامعہ سے درس نظامی کی تکمیل کی۔

آج مولانا ہم میں نہیں ہیں لیکن ان سے پڑھے ہوئے، ان کے تربیت یافتہ شاگرد جہاں کہیں بھی دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے اجر و ثواب میں مولانا کا پورا پورا حصہ ہے، مولائے کریم مولانا کو اپنے جوار رحمت میں جگہ نصیب فرمائے اور ہمیں اپنے اساتذہ، مشائخ اور ساتھیوں کے ساتھ جنت میں جمع فرمائے۔ آمین، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

خدا رحمت کند اس عاشقان، پاک طینت را

بنا کردند خوش رے بخاک و خوں غلطن

جامعہ کے ناظم تعلیمات

حضرت مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

مدیر ماہنامہ بینات ہفت روزہ ختم نبوت، استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن



حجازی تقویم کے اعتبار سے ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات و استاذ الحدیث، ماہنامہ بینات کی مجلس ادارت کے عظیم رکن، وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نصابی کمیٹی کے معزز رکن، جامع مسجد صالح صدر کے امام و خطیب، چالیس روزہ تعلیم و تربیت کورس کے موجد و بانی، ہزاروں علماء و مفتیان کرام کے مخلص و ہمدرد استاذ حضرت مولانا عطاء الرحمن اپنی ہمیشہ اور مخلص و با وفا شاگرد مولانا محمد عرفان میمن سمیت طیارہ حادثہ میں مرتبہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ، اِنَّ لِلّٰہ مَا اَخَذَ وَلَهُ مَا اَعْطٰی و کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن واحد ادارہ اور یونیورسٹی ہے، جس کے اکابر، استاذہ اور بزرگوں کی المناک اور کربناک شہادتوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ سابق رئیس جامعہ و شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ، حضرت مولانا مفتی عبدالسمیع شہیدؒ، ان کے ہمراہ ڈرائیور طاہر شہیدؒ، سابق نائب رئیس جامعہ جناب مولوی سید محمد بنوری شہیدؒ، شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ، ان کے ہمراہ ڈرائیور عبدالرحمن شہیدؒ، جامعہ کے سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر نظام الدین شامزئی شہیدؒ، جامعہ کے با وفاروحانی فرزند حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ، جامعہ کی ملیر شاخ کے استاذ حضرت مولانا مفتی سید سعید احمد اخوندزادہ مردانی شہیدؒ، ماہنامہ بینات کے مدیر حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہیدؒ، حضرت مولانا انعام اللہ شہیدؒ، حضرت مولانا ارشاد اللہ عباسی شہیدؒ نور اللہ مراقدہم۔ یہ سب وہ حضرات اور اکابر ہیں جو اپنی دینی و ملی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے راہ حق میں شہید ہو گئے۔ اس کی وجہ صرف یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جس شخصیت یا جس ادارے کو جتنا بلند مقام عطا فرمانا چاہتے ہیں، اُسے اتنا ہی آزمائشوں اور مصائب و آلام کی بھیٹی سے گزارتے ہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”عن مصعب بن سعد عن أبيه قال: قلت: يا رسول الله! أي الناس أشدُّ بلاءً؟ قال: الأنبياء ثم الأمثل فالأمثل، يبتلى الرجل على حسب دينه، فإن كان في دينه صلواً اشتد بلاءه وإن كان في دينه رقة ابتلى على قدر دينه، فمما يبرح البلاء بالعبد حتى يتركه يمشي على الأرض وما عليه خطيئة“۔ (ترمذی، ج: ۲، ص: ۶۵)

ترجمہ: ”حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! سب سے زیادہ آزمائش کس کی ہوتی ہے؟ فرمایا: انبیاء کرام علیہم السلام کی، پھر جوان سے قریب تر ہو، پھر جوان سے قریب تر ہو، آدمی کو اس کے دین کے مطابق آزمایا جاتا ہے، پس اگر وہ اپنے دین میں پختہ ہو تو اس کی آزمائش بھی کڑی ہوتی ہے اور اگر اس کے دین میں کمزوری ہو تو اسے اس کے دین کے بقدر آزمائش میں ڈالا جاتا ہے، پس آزمائش بندے کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہے، یہاں تک کہ ایسا کر چھوڑتی ہے کہ وہ زمین پر ایسی حالت میں چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔“ اسی طرح سنن ترمذی کے اسی صفحہ پر ایک اور حدیث ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ جب کسی سے محبت فرماتے ہیں تو اسے مصائب و آلام سے آزماتے ہیں، پس جو شخص اس حالت میں اللہ تعالیٰ سے راضی رہا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنی رضا لکھ دیتے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے راضی رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔“

کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری جامعہ اور جامعہ کے رئیس حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، نائب رئیس مولانا سید سلیمان بنوری، استاذہ جامعہ اور طلباء کے ساتھ بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت کا معاملہ ہے کہ ان چند سالوں میں انہیں اتنے سارے سانحات اور صدمات کو برداشت کرنا اور سہنا پڑا۔ کیونکہ ابھی تک گزشتہ شہداء کے زخم مندمل ہونے اور بھرنے نہ پائے تھے کہ حضرت مولانا عطاء الرحمن نور اللہ مرقہ کی شہادت اور جدائی کا گہرا زخم پوری جامعہ کو گھائل کر گیا۔

حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نے ۶ اگست ۱۹۶۰ء میں مردان، بابوزئی کے مقام پر جناب مشفق الرحمن صاحب کے گھر میں آنکھ کھولی، آپ نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم شیرگڑھ میں حاصل کی، میٹرک کرنے کے بعد ایشیاء کی عظیم یونیورسٹی جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن خان ٹوکنیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ، حضرت مولانا محمد بدیع الزمانؒ، حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہؒ، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ، حضرت مولانا محمد سوائیؒ، حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ اور حضرت مولانا محمد امین اور کزنی شہید رحمہم اللہ، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم اور دیگر وقت کے نابغہ روزگار اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ۱۹۸۳ء میں دورہ حدیث کی تکمیل کی، دو سال تخصص کرنے کے بعد اپنی مادر علمی میں تدریس پر فائز کئے گئے۔

حضرت شہیدؒ نے ابتدائی کتب سے دورہ حدیث تک تمام درجات میں اسباق پڑھائے، اس سال بھی دورہ حدیث میں صحیح مسلم کی تدریس آپ کے ذمہ تھی، آپ کا طریقہ تدریس بہت ہی عمدہ اور وجد آفریں ہوتا تھا، صحیح مسلم کا جب سبق پڑھاتے تو دارالحدیث کے علاوہ جامعہ بھی آپ کی آواز سے گونج رہا ہوتا۔

شہادت سے غالباً دو روز قبل دفتر اہتمام میں حضرت مولانا مفتی محمد عاصم ذکی مدظلہ کے ساتھ آپ تشریف فرما تھے اور مجھے دیکھتے ہی فرمایا: مولوی صاحب! میں نے آپ کا اداریہ بنام ”صریح نصوص کے بارے میں اجتہاد کی ضرورت کیوں؟“ پڑھا ہے۔ آپ نے بہت اچھا لکھا ہے، اور پھر رسالہ لے کر حضرت مولانا مفتی محمد عاصم ذکی صاحب کو سنانے لگے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ان کی خوردنوازی کی اعلیٰ مثال ہے۔ حضرت مولانا شہیدؒ دوسروں کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور اپنے آپ کو ہمیشہ اخفا کے پردہ میں چھپاتے تھے، اس پر ایک نہیں، کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہم اللہ کی پہلی نماز جنازہ اسلام آباد میں قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمنؒ کی امامت میں ادا کی گئی اور دوسری نماز جنازہ آپ کے علاقہ بابوزئی مردان میں حضرت مولانا شیر علی شاہ صاحب دامت برکاتہم نے پڑھائی، جس میں علماء، طلبہ، علاقہ کے معززین، دینی، مذہبی، سیاسی و سماجی جماعتوں کے راہنماؤں اور عوام الناس کے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ جامعہ سے نائب رئیس جامعہ حضرت مولانا سید سلیمان بنوری مدظلہ، استاذ حدیث حضرت مولانا امداد اللہ صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد عاصم ذکی صاحب، حضرت مولانا مفتی رفیق احمد بالا کوٹی صاحب، حضرت مولانا محبت اللہ صاحب، حضرت مولانا سعید عبدالرزاق صاحب، حضرت مولانا محمد عمران صاحب، حضرت مولانا عبدالغفار صاحب اور راقم الحروف کے علاوہ کئی اور اساتذہ (جن کے نام ابھی ذہن میں نہیں آ رہے، وہ) بھی بابوزئی مردان پہنچے اور آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔

حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نے اپنے سگواروں میں والدین، چار بیٹے، بیوہ، تین بھائی، تین ہمشیرہ اور ہزاروں شاگرد و عقیدت مند چھوڑے ہیں۔ آپ کے ایک صاحبزادے مولوی مسیح الرحمن عالم دین اور اپنے علاقہ بابوزئی میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دوسرے بیٹے مولوی فصیح الرحمن جو دورہ حدیث میں وفاق المدارس کے امتحانات میں پورے پاکستان میں اول نمبر آئے، وہ اب جامعہ میں تخصص سال دوم میں ہیں اور چھوٹے دو بیٹے بھی باقاعدہ زیر تعلیم ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دل و دماغ بند ہے، قلم لکھنے کے لئے ساتھ نہیں دے رہا، آنکھیں ہیں کہ آپ کی جدائی میں ابھی تک پر غم ہیں، سمجھ نہیں آ رہا کہ لکھوں تو کیا لکھوں؟ اور کیسے لکھوں؟ اسی لئے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

قارئین سے استدعا ہے کہ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ، مولانا محمد عرفان میمن شہیدؒ، ان کی ہمشیرہ اور اس سانحہ میں جملہ شہداء کے ایصال ثواب کے ساتھ ساتھ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس، نائب رئیس، جملہ اساتذہ، طلبہ اور آپ کے اعزہ اقرباء کے لئے بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ تمام حضرات کو صبر جمیل سے نوازیں اور جامعہ کو علمی اور روحانی ترقیات سے مالا مال فرماتے رہیں۔

کچھ یادیں، کچھ باتیں

مولانا ولی خان المظفر



ابھی چار پانچ روز قبل ہی کی بات ہے، جامعہ بنوری ٹاؤن کے سامنے سے میں کسی کام سے پیدل جا رہا تھا، حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحبؒ کسی کے ساتھ بایک پر پابہ رکاب تھے دیکھ کر فوراً اتر گئے اور بارونق، پروقار، پر بہار اور بابرکت چہرے کے ساتھ اپنے خاص انداز میں گویا ہوئے ”یہیں کہیں ہو مگر کہیں نظر نہیں آتے ارے بھائی کبھی غلطی سے ہی جامعہ میں تشریف لایا کریں“ عرض کیا ”حضرت! جہاں گھر روڈ کے ایک غار میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں آپ حضرات کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے کیوں آکر ضائع کروں“ فرمانے لگے یہی تو آپ کا مغالطہ ہے، اسلام اور اسلامی خدمات کی انجام دہی میں ریٹائرمنٹ کہاں سے آگئی؟ یہ ڈیوٹی آخر دم تک کی ہے۔

فضائی حادثہ میں ان کی شہادت کی خبر سنتے ہی وہ پورا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، مولاناؒ کے رفیق جماعت حضرت مولانا محمد یلین پچر زئی صاحب کا سنایا ہوا یہ پشتو شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

چہ یار مخ پہ کفن پٹ کڑوار مان راغی

مائے مخ تہ پہ زور زیر کتلی نہ وو

ترجمہ: میں نے ان کے چہرے پر ٹک کر نگاہ کیوں نہ ڈالی، اب جب ان کا چمکتا دمکتا چہرہ کفن میں جا چھپا تو اس کی آرزو ہونے لگی۔
مذکورہ ملاقات سے قبل یوں ہی ایک اور آمنة سامنا بھی یاد آنے لگا راقم، مولانا عبدالرحمن سندھی، علامہ سعید الحسنی اور یاسر عرفات نقشبندی کسی ضروری کام کے لیے دفتر المظفر سے نکلے، قاری محمد اقبال ناظم امور متفرقہ عامہ جامعہ بنوری ٹاؤن کو بھی لینا تھا ابھی ہم دفتر مجلس دعوت و تحقیق اسلامی کے سامنے کھڑے تھے کہ حضرت ہمارے قریب آکر بایک سے اترے، علیک سلیک کے بعد راقم کے ظاہری جبے قے پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے گویا ہوئے ”کیا بات ہے“ میں نے عرض کیا ایک شو میں جانا ہے، کہا اللہ اکبر شو؟ کیا کہہ رہے ہو، میں نے ہنس کر کہا کہ حضرت! ایک دعوت میں قاری اقبال صاحب مہمان خصوصی ہیں ہم طفیلی ہیں سوچا کہ لوگ کھانا ظاہری لباس کو دیکھ کر کھلاتے ہیں اس لیے ذرا بن سنور کر نکلے ہیں فرمایا حالات کا کوئی پتہ نہیں چلتا ذرا احتیاط۔ آج یہ سطور لکھتے ہوئے حیران ہوں کہ ان اللہ والوں کو شاید کچھ دن قبل ہی رفیق اعلیٰ سے ملنے کا پتہ چل جاتا ہے، آپ غور فرمائیں ان کے الفاظ پر اور ان کے آخری دم تک ریٹائرمنٹ نہ ہونے کے کلمات پر، جمعرات تک آن ڈیوٹی رہے تدریس، تعلیم، امامت اور جمعے کے دن خطابت اور اس کے بعد اپنی بیمار ہمشیرہ کو گھر پہنچانے کے لیے اسی دن کی روانگی اور اگلے روز فرائض کی انجام دہی کے لیے واپسی کی فکر ہم جیسے غفلوں کو کیا سبق دے رہے ہیں شاید انہی کے بارے میں کسی نے کہا تھا۔

جانے کیا کیا میری روداد کے عنوان ہوں گے

جب کبھی اہل وفا یاد کریں گے ہم کو

۱۴۰۸ھ میں جامعہ فاروقیہ کراچی میں راقم کا تقرر ہوا تب سے مولانا امداد اللہ اور مولانا عطاء الرحمنؒ سے برادرانہ، بے تکلفانہ اور وفاق المدارس کے امور سے متعلق مشاورت و مصاحبت کا تعلق رہا، جو روز بروز گہرا اور بڑھتا ہی رہا، وفاق المدارس کے امتحانی معاملات، امتحانی کمیٹی، نصابی کمیٹی، شوریٰ و عاملہ کی مجالس مختلف مراکز امتحان میں ایک ساتھ نگرانی، مختلف مراکز کے دورے ایسے بہت سے امور تھے اُن میں صحبت کے مواقع نصیب ہوئے، مجال ہے کبھی ان کی پیشانی پر بل نظر آئے ہوں ہر وقت ”قربان زلب یار گہے غنچہ گہے گل“ کی تصویر بنے ہوئے شفقت، مہربانی، اور حوصلہ افزائی جیسی صفات تو ان کے نمیر کا حصہ تھیں، صالح مسجد اور جامعہ بنوری ٹاؤن پر رشک آتا تھا کہ ایسے ایسے ظاہر و باطن کے محاسن و کمالات کے حاملین یہاں جلوہ افروز ہیں۔

حضرت مفتی ڈاکٹر نظام الدین شامزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب کی ایک مجلس میں جامعہ بنوری ٹاؤن کے حوالے سے کچھ گفتگو ہو رہی تھی اسی اثناء میں حضرتؒ نے فرمایا ”ارے بھائی مفتی صاحبؒ کا خلا پر ہونا تو یقیناً مشکل ہے لیکن وہاں مولانا عطاء الرحمن صاحب جیسے لائق وفاق حضرات جب تک ہیں فکر کی ضرورت نہیں، پھر فرمانے لگے مولانا عطاء الرحمن صاحب بخاری ترمذی سمیت درس نظامی کے ہر فن مولیٰ مدرس ہیں“ میں نے کسی مناسب موقع پر حضرت کے یہ کلمات ان کے سامنے نقل کیے تو جھوم اٹھے اور پھر کہنے لگے کہ ”من آثم کم من دانم“ پر حضرت اقدس کہ یہ کلمات میرے لیے سرمایہ حیات ہیں۔

ادب و عربیت میں ان کو کمال حاصل تھا، ایسی شستہ اور رواں عربی بولتے کہ آدمی عیش عیش کراٹھے، عالم عرب کی معلومات، وہاں کے اسفار، عرب شیوخ کی خاص

خاص مواقع پر چیدہ چیدہ تعبیرات ان کو ازبر ہوتی تھیں، عرب اور عربی زبان کی فصیلت، اہمیت وسعت اور ہمہ گیریت پر جب کلام فرماتے تو ایک بحر بیکراں ٹھٹھیں مارتا دکھائی دیتا، مصری لہجہ، سعودی لہجہ اور فصیح عربی میں بسا اوقات بے ساختہ کلام کرتے، جامعہ بنوری ٹاؤن میں جامعۃ الازہر کے مبعوث شیوخ کو اپنے مختلف دوروں اور امتحانی ہالوں میں نگرانی کے لیے ساتھ رکھتے، علمی نکات اور نظرافت ولطافت کے چشمے رواں دواں ہوتے، اب یہ وقت بتائے گا کہ ان کے دوستوں، تلامذہ اور متوسلین میں کون کون ان کے کردار، اخلاق اور اعلیٰ علمی صلاحیت کو اپنا کران کے مشن کی تکمیل کرتا ہے۔

گزشتہ سال ان کے گاؤں بابوزئی میں سالانہ جلسے میں دیگر اکابر و رفقاء کے ساتھ اس ناچیز کو بھی انہوں نے اور حضرت مولانا امداد اللہ صاحب نے دعوت دی تھی، مولانا شہیدؒ کے رفیق سفر و حضر اور خادم خاص مولوی عرفان حمید مین شہیدؒ بھی ہمراہ تھے اُن میں بھی حضرتؒ کی روح رچ بس گئی تھی ہمہ وقت اپنے استاد کی خدمت کے لیے مستعد اور ہشاش بشاش، چنانچہ ۲۱ جون ۲۰۱۱ء کو دن ایک بجے انیر بلوکی فلائٹ سے مفتی محمد عاصم زکی صاحب، مولانا قاری زبیر احمد چترالی صاحب اور مولانا عرفان مینؒ کی معیت میں ہم پشاور کے لیے محو پرواز تھے، انیر پورٹ پر مولوی احمد الرحمنؒ برادر خورد شیخ عطاء الرحمنؒ اپنے دوستوں کے ساتھ خیر مقدم کے لیے موجود تھے، وہاں سے علی طول قافلہ مردان سٹی میں فضل حق کالج کے قریب حضرت قاری اسد اللہ صاحب کے عظیم الشان اور مثالی ادارہ جامعہ احیاء العلوم پہنچے، کچھ خاطر تواضع اور عصر کی نماز سفرانہ سے فراغت کے بعد اب ہم اپنی منزل مقصود تحصیل کائنات کے علاقے میں واقع حضرت مولانا امداد اللہ استاذ حدیث جامعہ بنوری ٹاؤن کے قائم کردہ دانش گاہ جامعہ اسلامیہ بابوزئی کے پر نور و پرسکون فضاؤں کے رخ پر تھے، یہاں رات بعد از مغرب ایک مسابقہ و مقابلہ تحفیز القرآن الکریم منعقد تھا جس میں ضلع مردان و مضافات کے مختلف مدارس و مکاتب حفظ کے چھوٹے اور معصوم طلبہ شریک تھے بطور رنج صاحبان کے جناب مولانا قاری زبیر احمد چترالی صاحب اور دینی سے تشریف لائے ہوئے جناب مولانا قاری لطف الرحمن صاحب مسند پر براجمان تھے شرکائے مسابقہ سے طے شدہ نظام کے مطابق تین تین سوالات کی ذمہ داری جناب قاری ہارون صاحب کے سپرد تھی، پوزیشن حاصل کرنے والے کیا، سب ہی طلبہ اس لائق تھے کہ ہر ایک کو علماء و مشائخ کے اس عظیم مجمع میں ڈاؤس پر آ کر تلاوت کرنے پر انعام دیا جائے اور داد دی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سب کو انعامات سے نوازا گیا اخیر میں احقر کو خطاب کے لیے بلایا گیا میں نے اپنی معروضات میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال مرحوم کا یہ شعر بھی پیش کیا۔

تیرے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے رازی نہ صاحب کتاب

رات گئے پروگرام سے فارغ ہوئے جامعہ کے شعبہ جات، تعمیرات اور ماحول کا تفصیلی دورہ ہوا بہت خوشی اس بات کی ہوئی کہ جامعہ کے درو دیوار میں عربی زبان و ادب کا غلغلہ ہے وسعت فکری کے ساتھ ساتھ بالکل دیہات میں جدت کا حامل اور گلوبلائزیشن کے تقاضوں سے ہم آہنگ علمی، نظریاتی اور صاف ستھرا ماحول ہے، مولانا امداد اللہ صاحب کا پورا خیل خانہ علم و معرفت کے شناور دل دادہ ہیں جامعہ بنوری ٹاؤن کا مزاج و مذاق بالکل یک دم نمایاں ہے، بابوزئی کے مشرق میں یعنی پشت پر آسمان سے راز و نیاز کرتے پہاڑ اور مغرب میں سبزے کی شال میں پلٹا ہوا میدانی علاقہ ہے، جو جنگلی میکیزم کے حوالے سے انتہائی اسٹریٹجک سمجھا جاتا ہے، شیخ عطاء الرحمن صاحبؒ کے مستجاب الدعوات والد گرامی قدر کی خدمت اقدس میں علماء، خواص اور عوام سب ہی کا تانتا بندھا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ صحت کاملہ کے ساتھ اس شجر سایہ دار کو زندہ و تابندہ رکھے، پٹھانوں کی ضیافت اور مہمان داری دیکھنی ہو تو یہاں کا سفر ضرور کیا جائے، مزاجوں، مذاقوں، تبصروں اور تجزیوں کا صحیح توازن دیکھنے کے لیے رحیم اللہ یوسف زئی بطور نمونہ سب کے سامنے ہیں، یہاں کے کوہستانی سلسلے میں کشمیر غار بھی سیاحوں کے لیے نہایت پرکشش و جاذب ہے اس غار کی انتہاء تک کسی کی رسائی شنید کے مطابق نہیں ہوئی، جامعہ بنوری ٹاؤن کی سمر کلاسز کے لیے تعلیم و تربیت نامی کتابوں کا نصاب و نظام یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں بھی باقاعدہ منظور شدہ نافذ العمل ہے، جامعہ اسلامیہ بابوزئی اور بدر ہائی اسکول کی کچھ اس طرح کی کلاسوں کے معائنے کا موقع ملا، مولانا محمد بشیر کی کوششوں اور کاوشوں کو دورے کے علماء و مشائخ داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ یہاں کے بچوں اور بڑے اسٹوڈنٹس کو عربی، اردو، انگریزی اور پشتو چار زبانوں کی تعلیم و تربیت اور تکلم و حوار کی عجیب و غریب تربیت دی جاتی ہے، چنانچہ آپ ان سے کوئی سوال ان چاروں زبانوں میں سے کسی ایک میں کریں اور جواب علی الترتیب چاروں زبانوں میں سماعت فرمائیں، ان جلی علاقوں کے یہی وہ اسباب و عوامل ہیں جو مولانا امداد اللہ و شیخ عطاء الرحمنؒ کو اہل کراچی کی بے پناہ محبت و عزت افزائی کے باوجود یہاں کی مستقل سکونت کی بجائے وہاں کھینچ لے جاتی رہی اس وقت خوشحال خان کا یہ مصرع دل و دماغ پر بار بار دستک دے رہا ہے ع

بادشاہان بہ دہلی ناست وی پہ تخت
ترجمہ: شاہان دہلی اپنے تخت پر جلوہ افروز ہوں گے تو ہوں گے، عبدالرحمن کے لیے تو بہادر کلمے دہلی سے کم نہیں ہے۔

ان علاقوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی حکومتیں قائم تھیں یہاں جگہ جگہ (شہیدان بابا) کے قبرستان ہیں یہاں ان مجاہدین کو سروں پر بٹھایا گیا تھا ان کی تکریم و احترام کی مثالیں یہاں کا متاعِ گراں ہے، یہیں مردانِ شہر کے قریب حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دادا پیردادا شیخ و مرشد کا مزار (سنگر بابا) کے نام سے مشہور ہے، حضرت نفیس شاہ الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کی آمد و رفت یہاں برابر رہتی تھی۔

بہر کیف اگلے دن یہاں جامعہ اسلامیہ بابوزئی میں تقریب ختم بخاری شریف کا انعقاد تھا علماء و صلحاء، اولیاء و طلباء، مشائخ اور عامۃ المسلمین کا ایک دریا اُٹھ آیا تھا شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا محمد زرولی خان صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا قاری مفتاح اللہ صاحب کی آمد نے محفل کو وہ رونق بخشی تھی کہ کیا کہنے! مولانا محمد زرولی خان صاحب کا فصیحانہ، بلیغانہ اور ادبیانہ انداز بیان بڑا مسحور کن تھا، وہ محدث العصر حضرت بنوریؒ، مفتی اعظم پاکستان حضرت ٹوکیؒ اور امام اہلسنت حضرت مفتی احمد الرحمنؒ کا بڑا والہانہ تذکرہ کر رہے تھے، مولانا حافظ شیر محمد آف پیر بابا، مفتی محمد عاصم زکی، شیخ عطاء الرحمنؒ اور راقم الحروف نے بھی اپنا اپنا حصہ بقدر جتن لیا تھا، مولانا انعام اللہ، مولانا شعیب اور مولوی ادریس کی خوشیاں دیدنی تھیں، مفتی سلیم الدین شامزئی کے چاروں طرف دوستوں اور محبت کرنے والوں کی کہکشاں لگی رہتی تھی، حضرت مفتی شامزئی شہیدؒ کے تذکرے ہی تذکرے تھے، حافظ شیر محمد صاحب کے بیان کے آخر میں تو تبلیغی سہ روزوں، چلوں اور چار ماہ کی تشکیلیں بھی ہوئیں شیخ عطاء الرحمنؒ کی عربی لہجہ میں پشتو بہت پسند کی گئی، رابعہ کے ایک طالب علم کی عرب لب و لہجہ کی تقریر اتنی اچھی لگی کہ وہیں پر عام مجمع سے انعامات کی بارش کی گئی۔

بروز جمعرات ۲۳ جون کو صبح لفظ ”امداد و عطاء“ کا معنی مزید ابھر کر سامنے آیا جب ان دونوں شخصیات کی کوششوں سے ۱۳۶ جوڑوں کی شادیاں نوشہرہ سٹی میں ہونے جارہی تھیں اس باغ و بہار تقریب کا نظم و نسق دیکھنے کا تھا مولانا عطاء الرحمن سابق وفاقی وزیر سیاحت، مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ، مولانا محمد زرولی خان، مولانا قاری مفتاح اللہ، مفتی کفایت اللہ، مولانا حامد الحق حقانی اور دیگر بیسیوں علماء و بزرگوں نے اسٹیج کو رونق بخشی ہوئی تھی، مولانا عطاء الرحمنؒ نے جامعہ بنوری ٹاؤن اور علامہ بنوری ٹرسٹ ایسوسی ایشن کے اس کردار کے تناظر میں دارالعلوم دیوبند اور جمعیت علماء کا جو حسین نقشہ کھینچا اس پر پورا مجمع انگشت بدنداں تھا اور سب ہی کہہ رہے تھے کہ فرزند بنوریؒ نے حق ادا کر دیا، مولانا امداد اللہ صاحب نے کشمیر و ہزارہ کے زلزلے، زیارت زلزلہ، مالاکنڈ کے آپریشن زدگان اور حالیہ سیلاب زدگان کے لیے جامعہ بنوری ٹاؤن کے چاروں صوبوں اور مختلف علاقوں میں خدمات کا تفصیلی خاکہ پیش کیا جس کا میزانیہ کروڑوں میں تھا، انہوں نے کہا کہ ماہ گزشتہ مانسہرہ کے علاقے بٹل میں جامعہ نے ۱۵۰ جوڑوں کی شادیاں کرائی تھیں اور یہاں ۱۳۶ کا انتظام تھا ان کا کہنا تھا کہ یہ سلسلہ جامعہ کی طرف سے ملک کے مختلف پس ماندہ اور آفت زدہ علاقوں میں برابر چلایا جائے گا۔ جب دولہوں سے استدعا کی گئی کہ وہ حضرات اپنے اپنے نکاحوں کی وکالت حضرت مولانا قاری مفتاح اللہ صاحب کو سپرد کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائیں تو شرکائے مجمع سب ہی نے ہاتھ اٹھا دیئے جس پر مولانا امداد اللہ صاحب نے مولوی حفظ الرحمن صاحب سے مانگ لیتے ہوئے مزاحاً کہا کہ ہر ایک چاہتا ہے۔

کہ ہو اوج ثریا پہ مقیم پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

اس اجتماع کے قریب ہی (محبت آباد) واقع ہے جو کہ حضرت بنوریؒ کی جائے پیدائش ہے میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا اپنے آپ سے کہ علامہ بنوریؒ کی سخاوت دیکھیے کہ حاتم طائیؓ کی طرح بعد از وصال بھی اپنے علاقے کے لوگوں کو خوشیوں میں ہدایا و تحائف تقسیم فرما رہے ہیں:

ہر گز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اس موقع پر عوامی حلقوں کی طرف سے جامعہ بنوری ٹاؤن کو زبردست داد دی جارہی تھی، بالآخر حکیم عبدالودود صاحب ٹرسٹی جمعیت تعلیم القرآن کے یہاں مدرسہ میں مفتی عمیر صاحب نے مہمانوں کے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا تھا، جس کے بعد اطراف و اکناف سے آئے ہوئے حضرات اپنی اپنی منزلوں کی طرف گامزن ہوئے۔ ہم مولانا محمد یاسین، مولانا رزین شاہ اور مولانا محبت اللہ کے ساتھ مولانا سمیع الرحمنؒ کی امارت میں بٹخالی کے لیے روانہ ہوئے جہاں بہادر کلمے میں خاندان میں ہمارے چچا جناب مولانا عبدالشکور صاحب ہیں، مولانا محمد یاسین صاحب کے سر ہیں، سال گزشتہ مولانا کی بلڈنگ کے انہدام کا جو واقعہ پیش آیا تھا اس میں ان کی صاحبزادی اور صاحبزادے علیم اللہ کی شہادت بھی ہوئی تھی، تعزیت کے لیے حاضری دی وہ بے حد خوش ہوئے، ہمارے والد بزرگ وار جناب حاجی مظفر خان مرحوم کا بار بار تذکرہ کیا اور دعائیں دیں، ہمارے والد صاحب کے ماموں زاد و پھوپھی زاد بھائی جناب محمد ایوب خان صاحب اور بھانجے مولانا شریف الرحمنؒ اشرف بھی وہیں تھے مولانا محمد یاسین چغزئی کی طرح یہ دونوں بھی مولانا عبدالشکور صاحب

کے داماد ہیں۔ عصر میں مولانا سمیع الرحمن آف دیر بالہ اور حاجی اقرار خان کے ساتھ شمس الاسلام کی رہبری میں جامعہ عربیہ شیرگڑھ آگئے، مولانا محمد قاسم تشریف فرما تھے، جامعہ کے بانی و مہتمم حضرت مولانا حاجی محمد احمد صاحب سابق ایم این ایو امیر جمعیت علماء ضلع مردان، نیز ان کے مرحوم صاحبزادے حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ و اخلاص پڑھنے کے بعد مولانا قاسم اور مولانا محمد طیب نے پورے ادارہ کا دورہ کرایا ایک عظیم الشان جامع مسجد زیر تعمیر تھی جو شاید ملک بھر کی عظیم مساجد میں سے ایک ہوگی، شعبہ جات و اداروں کا بھی مفصل معائنہ ہوا اور روز بعد ان کے یہاں ختم بخاری کا پروگرام تھا جس کے لیے تیاریاں عروج پر تھیں، جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ ٹنک کی طرح سینکڑوں طلبہ یہاں شریک دورہ حدیث ہیں، اس ادارہ کا سالانہ بجٹ کروڑوں میں ہے، حکومت سے امداد یا مہتمم کا حکومت میں سرگرم ہونے کے باوجود کسی بھی کرپشن سے حاصل کی گئی رقم کا یہاں داخلہ تو کجا دور دور تک بوجہی نہیں، للہیت اور روحانیت کی یہاں کرنیں پھوٹی ہیں، عربی زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے یہاں کوششیں ہو رہی ہیں، مولانا محمد قاسم تو ایک نابغہ روزگار ہی ہیں، کئی اساتذہ بھی عربی ادب کے شہسوار ہیں، یہیں پر ہم بیٹھے ہی تھے کہ ضلع مردان کے ایک نوجوان محقق و مدقق علامہ سجاد ابن الحجابی بھگم بھاگ تشریف لائے، پشاور یونیورسٹی کے لیکچرار مولانا جنید اکبر صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے، دونوں جامعہ فاروقیہ کے معہد میں ہمارے پاس تھے، طالب علمی ہی سے ذرخیزی کے آثار دونوں پر نمایاں تھے، وسعت مطالعہ اور حصول علم کے لیے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا ان کا مشغلہ ہے۔ یہ دونوں حضرات جامعہ اسلامیہ بابوزئی کی روحانیت سے بھرپور فضاؤں میں بھی ہماری ملاقات اور تقریب میں شرکت کے لیے قدم رنجائی کر چکے تھے، علامہ ابن الحجابی تو علمی حلقوں میں خاصے مشہور ہیں مولانا جنید کی علمی و ادبی تگ و تاز کے لیے اتنا کافی ہے کہ ڈاکٹر قبلہ ایاز کے معتمد اور پشاور یونیورسٹی میں انہی کے ہاتھوں کا کاشت کیا ہوا پودا ہے۔

مغرب کے بعد ہم تینوں مردان تبلیغی مرکز میں شب جمعہ میں شریک ہوئے، دھیمہ بیان جیسے کانوں و دلوں میں رس گھول رہا ہو، پوری انسانیت، پوری دنیا اور کل کائنات کی بات چل رہی تھی، بشارتوں پر زور اور مشرف باسلام ہونے کے نئے نئے اور آسان ٹیکچر پیش ہو رہے تھے سب کو ساتھ لے کر چلنے کی دعوت دی جا رہی تھی، مولانا حبیب الحق (شوئے مولئی صاحب) مسئول جماعت مردان سے عربی اور پشتو میں دیر تک گفتگو ہوئی، حالیہ دنوں میں چلہ لگانے والے فنکار نعمت سرحدی، شہنشاہ گلزار عالم و دیگر بھی ملنے کے لیے آئے، کسی نے چھ سولہوں میں کام کیا تھا تو کسی کی چار ہزار کیسٹیں مارکیٹ میں تھیں اور اب اللہ اللہ کے ذکر میں مگن ایک نئی زندگی کے لیے عازم سفر تھے، رات مولانا جنید اور راقم انٹرنیٹ، لیپ ٹاپ اور ایکسٹرنل ہارڈ ڈیسک میں لگے رہے، فجر کی اذان ہوئی محلے کی مسجد میں باجماعت نماز ادا کی اور راستے میں سید احمد شہیدؒ کے بعض شہید مجاہدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے ہوئے پشاور کے لیے روانہ ہوئے، امداد و عطاء کے کردار، معنی اور ان کی ذوات میں ان کے اسماء کے اثرات پر غور کرتے کرتے ہم ایئر پورٹ پہنچے اور دن کے نوبے کراچی میں تھے۔

یہ روداد تھی اُس سفر کی جو آج سے ڈیڑھ سال پہلے ہوا تھا حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اور حضرت مولانا امداد اللہ صاحب کی دینی خدمات اور ان کے خاندان کی صفات آپ نے ملاحظہ فرمائیں اور ان حضرات کی کاوشوں سے گاؤں میں جو دینی فضاء قائم ہے وہ ایک لائق تقلید اور تحریک کارنامہ ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اس زمانے کے آدمی نہیں تھے انہوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں اپنے اکابرین سے بہت کچھ سیکھا اور اُس کو عملی زندگی میں لائے اور اس کم عمری میں جو ہمہ جہتی خدمات انجام دیں، اور جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ہم سب کے لیے مشعل راہ ہیں مہمان نوازی، اعلیٰ ظرفی، وسعت قلبی، فقیری میں بادشاہی اور حسن اخلاق کے جو کرشمہ ہم نے ہمیشہ سے حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ میں دیکھے تھے ان کا سرچشمہ دراصل ان کے والد ماجد جناب مشفق الرحمن صاحب اور ان کا پورا خانوادہ تھا عربی کہاوت ہے کہ:

”طہارۃ الاخلاق من کرم الاعراق“، یعنی حسن اخلاق کا تعلق نسبی شرافت سے ہم رشتہ ہوتا ہے، کیا چھوٹے، کیا بڑے، سب ہی مکارم اخلاق اور حسن معاشرت کے مینار تھے، اب سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان کی تعزیت کس سے کی جائے، ان کے خاندان سے، جامعہ بنوری ٹاؤن سے، مولانا امداد اللہ صاحب اور حضرت شہیدؒ کے صاحبزادگان سے یا پورے ملک اور عالم اسلام سے کہ ایسی ہستیاں روز بروز پیدا نہیں ہوتیں۔

ہزاروں سال نرس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و در پیدا



وہ اس دور کے آدمی نہیں تھے!

قاری محمد عثمان
امیر جمعیت علمائے اسلام کراچی



آہ!..... حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب شہیدؒ بھی شہدائے حق کی صف میں بھوجا ایئر لائن کے حادثہ میں اپنی ہمیشہ اور خادم خاص مولانا عرفان میمن کے ہمراہ شامل ہو گئے۔ انکا مسکراہٹ سے بھرا نورانی چہرہ بھول نہیں رہا۔ خاص کر جب بھی علامہ بنوری ٹاون جانا ہوتا ہے اور عام طور پر جس وقت یاد آتے ہیں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ابھی سامنے سے چاق چوبند اپنے مخصوص انداز میں علم و حکمت کے پہاڑ، حسن و اخلاق کے پیکر، مسکراہٹوں سے بھرا نورانی چہرے والے شیخ عطاء نمودار ہو رہے ہیں۔ ویسے تو میں حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب کو زمانہ طالب علمی سے جانتا تھا، مگر خاص طور پر فراغت کے بعد، جانشین محدث عصر حضرت اقدس حضرت مولانا علامہ محمد یوسف بنوریؒ، ولی کامل، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحبؒ نے حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحبؒ کی تعلیمی قابلیت اور تیزی سے ابھرنے والی ہمہ جہت شخصیت کو دیکھتے ہوئے ان کی بحیثیت مدرس تقرر کی کا فیصلہ فرما کر انہیں جب جامعہ میں ابتدائی درجات کے اسباق دیئے تو بہت جلد مولانا عطاء الرحمن شہید اپنی خداداد صلاحیتوں اور اساتذہ کرام کی خصوصی توجہ سے ترقی کے منازل طے کرتے بہت جلد بڑے درجات کی کتابوں کے ساتھ ساتھ جامعہ میں ایک گننام منتظم کی حیثیت سے کئی شعبوں میں ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے اکابرین کے معتمد خاص کے طور پر کام کرتے رہے۔ حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحبؒ کے آخری دور میں مولانا عطاء الرحمن صاحب ان کے خادم خاص کے طور پر جامعہ کے تعلیمی نظام، تعلیم و تربیت میں بڑی گہری دلچسپی لیتے رہے۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہ ناظم تعلیمات ہوتے تھے۔ یہ ایک ایسا مبارک دور تھا اگر اس پر قلم اٹھایا جائے تو شاید حق ادا نہ کیا جاسکے اور کیوں ایسا نہ ہوتا؟ حضرت بنوریؒ کے دونوں خصوصی شاگرد ایک مہتمم اور جانشین تھا اور دوسرا حضرت بنوریؒ ہی کے زمانے سے ناظم تعلیمات تھے۔ جن کی تربیت علامہ بنوریؒ نے کی ہو ان کا دور زوالہ اور مبارک کیوں نہ ہوتا؟ بہر حال! حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب، حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ کے دور میں جب نظامت سے علیحدہ ہوئے تو شیخ الحدیث حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہؒ، ناظم تعلیمات بنے۔

چونکہ حضرت شاہ صاحبؒ بھی مولانا عطاء الرحمنؒ کے استاد خاص تھے۔ حضرت شاہ صاحب بھی مولانا کی تربیت فرماتے ہوئے ان سے جامعہ کے تعلیمی نظام کے امور چلاتے رہے۔ حضرت شاہ صاحب بھی وہ ہیرے تھے جنہیں حضرت بنوریؒ نے 1961-1962 سے اپنے ساتھ بطور مدرس رکھا تھا۔ حضرت بنوریؒ نے جس ٹیم کا انتخاب کیا تھا وہ ٹیم بھی مبارک تھی اور ان کے دور کی ایک ایک یاد سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ گویں نے کبھی دفتر میں اپنی سیٹ پر بیٹھے نہیں دیکھا۔ یہ تھا ایسے اکابرین کا اخلاص، عجز و انکساری۔ شاہ صاحب ہر طالب علم، شاگرد اور علماء کو مولوی صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ بڑے حضرات کو حضرت مولانا فرما کر پکارتے۔ کبھی کسی کا نام لیکر نہیں.....، یہ ہمارے اکابرین تھے۔ ایسے حضرات جن کی تربیت کریں تو پھر مولانا عطاء الرحمنؒ آج ہیرا کیوں نہ بنتا؟ مولانا عطاء الرحمنؒ نے اپنے اکابر اساتذہ کرام کی ہر اد پر عمل کر کے دکھادیا۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ وہ حضرت بنوریؒ کے باغ کے بہترین مالی تھے۔ آج گلشن بنوری، شیخ عطاءؒ کے حادثہ پر جہاں غم زدہ اور سوگوار ہے وہاں شیخ عطاءؒ کے منظم کئے تعلیمی نظام کو شیخ عطاءؒ کی یادگار کے طور پر دیکھ کر خوش محسوس کی جا رہی ہے۔ یوں تو مولانا عطاء الرحمنؒ اپنے ایک اور استاد اور حضرت شاہ صاحب کے بعد کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ کے دور نظامت سے عملی طور پر تعلیمی نظام کو منظم کر رہے تھے۔ حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ چونکہ حضرت شاہ صاحب کے بعد مقام، مرتبے اور بزرگوں کی یادگار کے طور، ناظم تعلیمات کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے مگر وہ بھی سارا کام اپنے شاگرد حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب سے لیتے تھے۔ جب حضرت مولانا چترائیؒ وفات پا گئے تو پھر باضابطہ طور پر جامعہ کے رئیس بقیۃ السلف حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہ نے تمام حضرات کی مشاورت سے حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کو ناظم تعلیمات مقرر فرمایا۔

امام المجاہدین حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ بہت زیادہ شیخ عطاءؒ پر اعتماد اور محبت فرمایا کرتے تھے۔ جب بھی سوات جانا ہوتا تو حضرت مفتی صاحب مردان بابوزئی سے ہوتے ہوئے جاتے اس لئے کہ شیخ عطاءؒ اور برادر مکرم حضرت مولانا امداد اللہ صاحب کی ناراضگی حضرت مفتی صاحب قطعاً برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے ہاں ہو کر جایا کرتے تھے۔ یہ تو وہ ہستیاں تھیں کہ جن کے غیر بھی مداح بن جاتے تھے۔ جس دن حضرت مفتی صاحب کو ظالموں نے شہید کر دیا تو حضرت مفتی صاحب کو زخمی حالت میں جامعہ کے سامنے جمعیت علماء اسلام کے جھنڈے والے چوک سے جب گاڑی ہسپتال لے جا رہی تھی تو مولانا عطاء الرحمن جیسے ہی وہاں پہنچے گاڑی سے حضرت مفتی صاحب نے خون آلود ہاتھ مبارک سے مولانا عطاء الرحمن کو

اشارہ فرمایا اور شاید یہ ان کا آخری اشارہ تھا۔ حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب جب یہ منظر بیان فرماتے تھے تو رورو کر نڈھال ہو جاتے تھے۔ حضرت مولانا عطاء الرحمن جامعہ کے وہ عظیم سرمایہ تھے جس نے اپنے اسلاف، حضرات، اساتذہ کرام سے تربیت اور فیض حاصل کرنے کے بعد جامعہ کے تعلیمی نظام اور دیگر معاملات کو ایسا منظم کیا تھا کہ تمام شاخوں میں یکساں نظام اور ایک حکم کی اطاعت اساتذہ کرام سمیت ہزاروں طلبہ کا مثالی اور قابل رشک عمل ہے۔ جس طرح حضرت بنوریؒ کی دعاؤں سے آج جامعہ دنیا بھر کی دینی یونیورسٹیز، اداروں اور جامعات میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے تو وہاں اسی طرح جامعہ کا رعب و احترام عام لوگوں کے دلوں میں آئے روز بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جامعہ کے مایہ ناز اساتذہ کرام، اور اکابرین کے فیض یافتہ شیخ عطاء جیسے مخلص دیانتدار، قابل اعتماد، جامع الصفات کے مالک جاشاران جامعہ نے اپنی ساری صلاحیتیں جامعہ کی تعمیر و ترقی، جامعہ کے تعلیمی نظام اور تمام معاملات کو محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے جذبے کے تحت اعلیٰ معیار پر چلانے میں صرف کر دیں۔

حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ میرے خاندان کی ہر خوشی غمی میں شریک ہونا انہوں نے اپنے اوپر لازم کیا ہوا تھا۔ کئی بار گزشتہ اکابرین کے ساتھ ہمارے جامعہ عثمانیہ تشریف لاتے تھے اور جب آج سے پانچ سال قبل جامعہ عثمانیہ میں دورہ حدیث کا آغاز ہوا تو میں نے آغاز سے قبل حضرت اقدس حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ کو درخواست دی کہ ہمارے دورہ حدیث کے تمام طلبہ کو جامعہ میں داخلہ عنایت فرمائیں تو حضرت نے شفقت فرماتے ہوئے 16 طلبہ کو دورہ حدیث میں داخلہ دیکر یہ تحریری فیصلہ صادر فرمادیا کہ آئندہ قاری صاحب کی سفارش پر دوسرے حضرات کی طرح ایک آدھ طالب علم کو داخلہ دیا جائے گا۔ جبکہ باقی طلبہ سے معذرت کی جائے گی۔ تو حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب نے وہ تحریری فیصلہ مجھے دیتے ہوئے فرمایا: قاری صاحب اب آئندہ آپ خود دورہ حدیث کا فیصلہ کر لیں۔ خیر میں نے وہ بات معمول کا جواب سمجھ کر ضد شروع کر دی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بہر حال حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب نے بڑے مدلل انداز میں مجھے مطمئن کرنے اور قائل کرنے کی کوشش فرمائی بالآخر سالانہ امتحانات کے موقع پر میں نے ایک اور درخواست حضرت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں جمع کرادی کہ اگر آئندہ میرے جامعہ عثمانیہ کے دورہ حدیث کے تمام طلباء کو داخلہ نہیں دیا جائے گا تو پھر حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب کو ہمارے ہاں بخاری شریف پڑھانے کی اجازت دی جائے، حضرت ڈاکٹر صاحب اس کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے اور میرا مقصد بھی یہی تھا۔ اس لئے کہ ہمارے پاس وسائل بھی نہیں تھے اس مسئلہ کو بھی حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب نے شفقت فرماتے ہوئے یوں حل فرمایا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا قاری مفتاح اللہ صاحب مدظلہ کی نہ صرف تجویز دی بلکہ حضرت مولانا امداد اللہ صاحب سے مشورہ کر کے دونوں حضرات نے مجھے مشورہ میں شریک فرما کر طے کیا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا قاری مفتاح اللہ صاحب مدظلہ سے سب ملکر درخواست کرتے ہیں کہ وہ جامعہ عثمانیہ میں بخاری شریف پڑھانے کے لئے تیار ہو جائیں تو میں اور حضرت مولانا امداد اللہ صاحب حضرت قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے جامعہ عثمانیہ میں بخاری شریف پڑھانے کی درخواست کی جو کہ حضرت قاری صاحب نے مشروط طور پر قبول فرمائی کہ اگر ڈاکٹر صاحب اجازت دیں گے تو انشاء اللہ آپ حضرات کی درخواست منظور ہوگی۔ بعد ازاں ہم نے یہ ساری صورت حال حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ کے سامنے رکھی تو حضرت ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اجازت دی بلکہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: ارے میاں! اپنے ہاں دورہ حدیث کا آغاز کرو۔ پھر ان دونوں حضرات کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ان کی ضد اب پوری ہوگئی۔ حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب نے وفاداری کا حق ادا کرتے ہوئے حضرت قاری صاحب کا انتخاب کر کے مجھے ڈھیر کر دیا۔ جب کہ اس کے بعد باقاعدہ ہمارے جامعہ عثمانیہ کی نگرانی کرتے رہے۔ باقاعدہ طے ہوا کہ حضرت مولانا امداد اللہ صاحب مدظلہ جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی نظام کی نگرانی کریں گے۔ حالانکہ اس فیصلے سے پہلے بھی ہمارے ہاں تشریف لاتے تھے مگر اس فیصلے کے بعد چاہے وہ طلبہ کی انجمن کا اجتماع ہو یا سالانہ تقریب، مختصر وقت کے لئے کیوں نہ ہوتا ہماری تقریب کی زینت بنتے۔ تقریری امتحانات کے لئے امتحان کا انتظام حضرت مولانا امداد اللہ صاحب کرتے۔ جبکہ دورے حدیث کے امتحانی پرچوں کا اہتمام بھی شیخ عطاء کرتے۔ آج کون ایسا ملے گا جو اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ہم جیسے کمزوروں کی بھی مکمل نگرانی کرے؟ اور یہ سب کچھ خندہ پیشانی اور اپنی ذمہ داری سمجھ کر کرتے۔ حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب شہید اس دور کے آدمی نہیں تھے مگر ہمیں پہچان نہیں تھی۔ وہ طلبہ پر اس قدر شفقت فرماتے کہ عام آدمی حیران ہو کر رہ جاتا۔ جامعہ میں تعلیم و تربیت کا جو جامع نظام مرتب کیا تھا وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ ایک عرصہ سے جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی ہر چھوٹی بڑی تقریب کی نظامت کیا کرتے تھے۔ ہر زبان پر انہیں عبور حاصل تھا۔ ان کی عربی زبان میں گفتگو اور ہر زبان کے اشعار آج بھی گونجتے ہیں۔

ایک بار بڑے اچھے کپڑے اور واسکٹ پہنے ہوئے تھے، ویسے بھی وہ حسین اور اچھے لگنے والے انسان تھے۔ میں نے اور مولانا حماد اللہ شاہ صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ یہ حسین سوٹ ہمیں بھی مل جائے۔ چند دنوں کے بعد اپنے ناپ پر ایک بہترین واسکٹ اپنے شاگرد خاص مولوی عرفان میمن یا مفتی

عمران مین کو دی کہ یہ قاری صاحب کو پہنچا دیں۔ جب میں نے پہنی تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے ہی ناپ پر بنی ہے۔ میں کئی سالوں سے اسے ہی پہنتا ہوں۔ اب تو اور بھی اچھی لگتی ہے اس لئے کہ حضرت عطاءؒ کی نشانی ہے۔ بہر حال! حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ بہت بڑے آدمی تھے، وہ ہر دل عزیز اور عظیم انسان تھے۔ ویسے تو اگر ان کے کارناموں، علمی استعداد اور ہمہ جہت صفات کے حوالے سے لکھا جائے تو اس کے لئے ان جیسے قلم کار کی ضرورت ہوگی۔ میں نے چند بے ربط یادیں تحریر کی ہیں۔

آخری بات عرض ہے کہ گزشتہ سے گزشتہ سال 1431ھ کے سفر حج کے دوران جب پہلے دن منی حجاج روانہ ہو رہے تھے ہماری رہائش بن داؤد میں حضرت مفتی محمد نعیم کے ساتھ تھی جو کہ جمرات کے بالکل قریب تھی ہم کافی ساتھی پیدل چل پڑے، نماز عصر مسجد خیف میں پڑھی، میرا خیمہ بالکل مزدلفہ کے باڈر پر تھا۔ باقی ساتھیوں کی خواہش تھی کہ نمازیں پڑھنے کے بعد چونکہ جگہ قریب ہے واپس آرام کے لئے رات کو رہائش گاہ پر چلے جائیں گے فجر کو پھر آجائیں گے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے خیمے میں چلا جاؤں۔ جہاں حضرت مولانا امداد اللہ صاحب، حضرت مفتی محمد عاصم زکی صاحب، ہمارے جامعہ عثمانیہ کے مدرس مفتی عمران صاحب۔ کا بھی وہیں خیمہ تھا۔ مسجد سے جب نکلے میں نے خیمے میں ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسا ہی آگے مسجد سے سڑک پر جانے لگا تو اچانک ہم دونوں کا آمناسنا مانا ہو گیا۔ اتنی خوشی کا اظہار فرمایا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے ساتھ دو چار خدام علماء بھی تھے۔ خیریت دریافت کے بعد فرمایا ساتھی کھانا لینے گئے ہیں ان کا انتظار کرتے ہیں۔ خیر جب کھانا ساتھی لے آئے خود بڑے ساز کا گتہ اٹھایا اور ایک جگہ سائیڈ پر بچھا کر جگہ بنائی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم سب ختم نوبۃ حج گروپ کے خیمے میں گئے۔ وہاں حضرات سے ملاقات ہوئی پھر میرے لئے پریشان تھے کہ آپ کی جگہ دور ہے۔ انہیں خود کسی نے اپنے ہاں آنے پر مجبور کیا تھا بڑی مشکل سے اجازت دی اور پھر میں اپنے خیمے میں چلا گیا جہاں بقیہ حضرات بھی تشریف لے آئے۔ غرض حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب بہت بڑے شفیق انسان تھے۔ ہمیشہ فرماتے کہ قاری صاحب مجھے آپ کی بڑی فکر رہتی ہے۔

جامعہ بنوری ٹاؤن کے وہ اکابرین جن کو شہادت کا مرتبہ ملا حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ شہادت کا مرتبہ پانے والے ان اکابرین میں سے تیرہویں فرد ہیں سب سے پہلے حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ اور حضرت مولانا مفتی عبدالسمیع کو بمع ذرا بنیور کے شہید کیا گیا پھر جناب صاحبزادہ مولوی سید محمد بنوریؒ کو پھر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خانؒ، حضرت مولانا سعید احمد جلاپوریؒ، حضرت مولانا سید عنایت اللہ شاہؒ، حضرت مولانا محمد امین اور کزئیؒ، حضرت مولانا مفتی سید سعید احمد اخوندزادہ مردائیؒ، حضرت مولانا انعام اللہؒ، حضرت مولانا ارشاد اللہ عباسیؒ اور اب ہمارے محب و محبوب حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو گئے، ہمارے یہ اکابر اتنے جامع الصفات ہوا کرتے ہیں کہ جب ان کی شہادتوں کے بعد پس ماندگان ان حضرات کی ذمہ داریوں کی فہرست نکالا کرتے ہیں تاکہ ان کاموں کو جاری رکھا جائے، تو ششدر رہ جاتے ہیں کہ ذمہ داریاں اتنی ساری! اور کام کرنے والا بندہ ایک موزوں نظر نہیں آتا، اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات بیک وقت کتنا ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت لدھیانویؒ کی شہادت کے بعد جب ان کے کاموں کو تقسیم کرنے کے لئے فہرست بنائی گئی تو وہ ۱۶ افراد پر تقسیم ہوئی اسی طرح حضرت شامزئیؒ کی ذمہ داریاں ۱۰ افراد پر تقسیم کرنا پڑیں، مفتی محمد جمیل خان صاحبؒ کے کام بھی کئی افراد پر تقسیم کرنا پڑے، مولانا جلاپوری صاحبؒ کے کام ۱۲ افراد کو دینے پڑے، مولانا ارشاد اللہ عباسیؒ کی خدمات ۲۴ افراد پر تقسیم کرنا پڑا بعینہ اسی طرح جب حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت ہوئی تو جامعہ والے حیران و پریشان تھے کہ حضرت مولانا جیسی ہمہ جہت شخصیت! ان کی تمام ذمہ داریوں کو کون پورا کرے گا؟ ایک طرف جامعہ کی نظامت کا مسئلہ، دوسری طرف تدریس کا، تیسری طرف صالح مسجد کی امامت و خطابت کا، چوتھی طرف تعلیم و تربیت کورس کی نگرانی، پانچویں طرف وفاق کی امتحان اور نصاب کمیٹی، چھٹی طرف جامعہ اور شاخ ہائے جامعہ کی نگرانی وغیرہ بہر حال یہ تمام امور ایسے ہیں کہ ہر ایک کے لئے ایک ایک جید عالم کی ضرورت ہے، چنانچہ یہی کیا گیا کہ مولانا کی ذمہ داریوں کو مختلف افراد پر تقسیم کیا گیا۔ لیکن بہر حال برادر مكرم مولانا امداد اللہ صاحب کو اللہ پاک جزائے خیر عطاء فرمائے کہ انھوں نے مولانا شہیدؒ کی اکثر ذمہ داریوں کو سنبھال لیا ہے، چونکہ اللہ پاک اس دین کو تاقیامت قائم رکھیں گے اسی لئے دینی شعبوں کے لئے افراد کا چناؤ بھی اللہ پاک خود ہی کیا کرتے ہیں، انسان سوچتا اور کرتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ جب حضرت لدھیانویؒ شہید ہوئے تو اگرچہ ان کی ذمہ داریوں کو مختلف افراد پر تقسیم کیا گیا لیکن اصل ان کی تمام ذمہ داریوں کو سنبھالنے والے حضرت مولانا سعید احمد جلاپوریؒ تھے، اسی طرح حضرت جلاپوریؒ کے بعد ان کے کاموں کو ۱۲ افراد پر تقسیم تو کر دیا گیا! لیکن اب اگر دیکھا جائے تو ان کی اکثر ذمہ داریوں کو برادر مكرم مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب احسن طریقے سے نبھا رہے ہیں، اللہ پاک ان کو اس چیز کی توفیق عطاء فرمائے، اسی طرح حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے اکثر کاموں کے لئے اللہ پاک نے حضرت مولانا امداد اللہ صاحب کو چن لیا ہے، اگرچہ صالح مسجد کی امامت و خطابت مولانا شہیدؒ کے صاحبزادے اکابرین کے حکم سے کر رہے

ہیں لیکن اُس کے علاوہ تقریباً تمام ذمہ داریاں حضرت مولانا امداد اللہ صاحب نے سنبھال لی ہیں، اللہ پاک اُن کی حفاظت و صیانت فرمائے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی شہادت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کتنا بڑے انسان تھے، اللہ پاک اُن کے درجات بلند فرمائے، اُن کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔

آج اُن کا خاندان ہی نہیں، جامعہ علوم اسلامیہ اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے جامعہ کے فضلاء، ان کے شاگرد جمعیت علماء اسلام کے قائدین، کارکنان اور جامعہ کا بہت وسیع حلقہ ان کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہا ہے، وہ ایک فرد نہیں ایک بڑی منظم تحریک کا نام ہے، انہیں خراج تحسین پیش کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ ان کے مشن کو جاری رکھا جائے۔



جنت کے مسافر

مولانا مفتی عبدالحق عثمانی

مدیر ماہنامہ الانوار کراچی



بچپن میں کسی کتاب میں ایک بہت خوبصورت بات پڑھی تھی جو ہمیشہ کے لیے دل و دماغ سے چپک کر رہ گئی کتاب میں کسی بڑی شخصیت کا قول لکھا ہوا تھا کہ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ رورہا ہوتا ہے اور ارد گرد والدین اور تمام رشتہ دار خوش ہو رہے ہوتے ہیں۔ خوش بخت ہے وہ انسان کہ جب وہ دنیا سے جائے تو وہ خوش ہو باقی سب لوگ اس کی جدائی کے غم میں رو رہے ہوں۔ افسوس کہ گزشتہ دنوں ایسی بہت سی عظیم شخصیات ہم سے جدا ہو گئیں جن پر یہ شعر بالکل صادق آتا ہے۔

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ڈھونڈو گے گر ملکوں ملکوں

بلاشبہ وہ لوگ تو شہادت کی عظیم سعادت اپنے دامن میں سمیٹے خوش خوش اپنے رب کے پاس یہ کہتے ہوئے حاضر ہو گئے:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جان دے دی، دی ہوئی اسی کی تھی

اور یقیناً بارگاہ الہی سے اپنے ان مخلص بندوں کو یہ مژدہ جاں فزا سنایا گیا ہوگا: ”یا ایہا النفس المطمئنہ، ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ،

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی“۔

کراچی میں قائم عظیم دینی و تعلیمی ادارہ جامعہ بنوری ٹاؤن دینی خدمات اور قربانیوں کی ایک لازوال تاریخ رکھتا ہے حضرت بنوریؒ کے قائم کردہ اس ادارہ کے درودیوار پر ایک مرتبہ پھر اس وقت اداسی چھا گئی یہاں پڑھنے والے طلباء کے دل غم سے نڈھال ہو گئے اور جامعہ کی فضاء بوجھل، بوجھل نظر آنے لگی کہ جب اسلام آباد سے یہ اطلاع ملی کہ جامعہ میں طالب علمی سے لے کر ناظم تعلیمات تک کا سفر طے کرنے والے استاذ العلماء، محبوب الصلحاء حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھوجا ایئر لائن کے حادثے میں اپنے رفیق سفر شاگرد سمیت جام شہادت نوش فرما گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت شہید ہزاروں علماء کے استاد تھے اور برسوں آپ نے جامعہ میں مسند تدریس کو رونق بخشی آپ کا درس مشکل مباحث کی تسہیل اور زندہ دلی کا مرقع ہوتا تھا آج آپ کی درس گاہ کا نظارہ چشم تصور سے دیکھتا ہوں تو آپ کا وہ باوقار انداز تدریس، بات بات پر بر محل اشعار، لطائف، بذلہ سنجی اور خوش مزاجی سب یاد آکر سماں باندھ دیتے ہیں کہ۔

رو رو کر فریاد کرو گے

وفا میں ہماری یاد کرو گے

حضرت شہیدؒ نے جامعہ میں کل وقتی مصروفیات کے ساتھ جامع مسجد صالح صدر میں بھی عوام کی اصلاح کے لیے رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا ہوا تھا امامت و خطابت کے ساتھ دروس کے ذریعے اور گرمیوں کی تعطیلات میں دینی کورسز کے ذریعے ہزار ہا خلق خدا نے آپ سے استفادہ کیا۔ آپ کی وفات کا حادثہ آپ کے اہل خاندان کے ساتھ ساتھ جامعہ سے وابستہ ہر فرد بالخصوص فضیلۃ الشیخ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم، مہتمم جامعہ کے لیے انتہائی المناک ہے ہم تمام پس ماندگان کے ساتھ اظہار تعزیت کرتے ہوئے دعاء گو ہیں کہ اللہ کریم حضرت کے درجات بلند فرمائے اور پیچھے رہ جانے والوں کو صبر جمیل اور اس پر اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔

ہمارے بزرگ دوست

مولانا زبیر احمد صدیقی
مدیر ماہنامہ صدائے فاروقیہ شجاع آباد



مؤرخہ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰/اپریل ۲۰۱۲ء کو کراچی سے اسلام آباد آتے ہوئے اسلام آباد انٹیرپورٹ کے قریب بھوجا انٹر لائن کا مسافر بردار طیارہ نامعلوم وجوہات کی بنا پر حادثہ کا شکار ہوا، اس حادثہ کے نتیجے میں طیارے پر سوار عملہ سمیت ۱۲ افراد جاں بحق ہو گئے۔
انا للہ و انا الیہ راجعون ان اللہ ما اخذو له ما اعطى و کل شئی عندہ اجل مسمی۔

اس طیارہ حادثہ میں جاں بحق ہونے والے جملہ مسلمان بلاشبہ شہید ہیں، حضور ﷺ نے جل جانے والے اور ڈوب جانے والے مسلمان کو شہید قرار دیا ہے، مزید برآں یہ لوگ جمعۃ المبارک جیسے افضل دن کو، جمعۃ المبارک کی افضل ترین ساعت بعد نماز عصر شہید ہوئے۔ حق تعالیٰ سے امید ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ان کے ساتھ اپنے فضل کا معاملہ فرمائیں گے۔ ادارہ صدائے فاروقیہ جملہ شہداء کے پس ماندگان کے ساتھ ان کے غم میں شریک اور شہداء کے لیے دعا گو ہے۔ جامعہ میں اس حادثہ کے فوراً بعد خصوصی معمولات شروع کر دیے گئے تھے اور دعاؤں کا اہتمام کیا گیا۔

ان شہداء میں ہمارے بزرگ دوست اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ، ان کے رفیق خاص مولانا محمد عرفان شہیدؒ، ان کی ہمشیرہ اور چند دیگر علماء کرام بھی تھے۔

حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ وہ میدان تدریس کے نامور شاہسوار، بے حد انتظامی صلاحیتوں کے حامل اور امت کا درد رکھنے والے ثقہ عالم دین تھے۔ لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے والے خندہ رو اس بزرگ نے پاکستان کے اسکولز اور کالجز کے طلباء کو دین سے روشناس کرانے کے لیے تعلیم و تربیت کورس مدون کرایا جو پاکستان بھر میں اسکولوں کی تعطیلات میں پڑھایا جاتا ہے، اس طرح ان کا فیض صرف علماء و مدارس کے طلباء تک محدود نہیں بلکہ ملک کے اسکولوں اور کالجوں کے طلباء میں بھی ان کا فیض جاری و ساری ہے۔ جامعہ فاروقیہ شجاع آباد نے مولانا کی شہادت پر جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے مہتمم و شیخ الحدیث، وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نائب صدر حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے بعض اساتذہ کرام کو کورج ذیل خط تحریر کیا:

بخدمت اقدس محترم و مکرم سیدی و سندی حضرت شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب، حضرت اقدس مولانا امداد اللہ صاحب زید شرف، حضرت اقدس مولانا مفتی محمد عامر زکی صاحب مدظلہ العالی، حضرت اقدس مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
خیریت کا طالب خیریت سے ہے!

مؤرخہ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰ اپریل کے جائگہ طیارہ حادثہ میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ناظم تعلیمات اور استاذ الحدیث، دینی تعلیم و تربیت کورس کے محرک و مدون، دنیا بھر کے ہزاروں علماء کے استاذ حضرت مولانا عطاء الرحمن رحمۃ اللہ علیہ، انکے معاون و خادم حضرت مولانا محمد عرفان نور اللہ مرقدہ، انکی ہمشیرہ محترمہ رحمہما اللہ و دیگر علماء کرام اور اہل اسلام کی المناک وفات پر جامعہ فاروقیہ شجاع آباد کی انتظامیہ، اساتذہ اور طلباء سب ہی دل گرفتہ اور غم ناک ہیں۔

انا للہ و انا الیہ راجعون، ان اللہ ما اخذو له ما اعطى و کل شئی عندہ لا اجل مسمی اللہم لا تحرمنا اجرہم ولا تفتننا بعدہم
یہ اندوہنا کہ حادثہ ملک و ملت کے لیے تو نقصان عظیم ہے ہی تاہم ان علماء کرام کی شہادت عالم اسلام اور امت مسلمہ کے لیے بھی سانحہ عظیمی ہے، جامعہ بنوری ٹاؤن کے عظیم سپوتوں کا یکے بعد دیگرے عالم بقاء کو کوچ کرنا رفع علم بھی ہے اور امت کی محرومی بھی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا اور انکے رفقاء، ہمشیرہ محترمہ اور جہاز کے حادثہ کے دیگر شہداء کو اجر عظیم نصیب فرمائیں اور آپ حضرات اور ہم جیسے آپکے تبعین کو صبر جمیل نصیب فرمائیں، آمین۔

حادثہ کی اطلاع ملتے ہی جمعۃ المبارک کی شب کو جامعہ کے طلباء و اساتذہ تلاوت قرآن کریم اور نوافل میں مشغول ہو گئے اور ایصال ثواب کرتے رہے، ہم بھی دعا گو ہیں اور ان شاء اللہ رہیں گے، جامعہ بنوری ٹاؤن دنیا بھر کے اہل مدارس، علماء کی طرح ہم سب بھی اس حادثہ کے متاثر اور غم میں برابر کے شریک و ہمیں ہیں۔

اللہم اغفر لہم وارفع درجاتہم فی المہدیین واخلفہم فی عقبہم فی الغابین واغفر لنا ولہم یا رب العالمین وافسح لہم فی قبورہم ونور لہم فیہم۔

والسلام

(مولانا) زبیر احمد صدیقی، مدیر جامعہ

محمد طیب معاویہ، نائب مدیر جامعہ

چند یادیں

مولانا محمد اشفاق جلالپوری

ناظم مدرسہ امام ابو یوسف شادمان ٹاؤن نارنگھ کراچی



کل شیء ہالک الا وجہہ. وکل نفس ذائقة الموت

موت ایک مسلمہ حقیقت ہے دنیا کا کوئی ذی شعور انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اللہ نے مؤمن کے لیے موت کو ایک تحفہ بنایا اور ایک پل بنایا جس کے ذریعے مؤمن اس دنیا کو عبور کرتا ہے اور اللہ کے حضور پیش ہوتا ہے اور رب کے دیدار سے فیض یاب ہوتا ہے۔

ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید رحمۃ اللہ علیہ نے دار فناء سے دار بقاء کی طرف رخت باندھا ہے، حضرتؒ کو اللہ نے بہت سارے اوصاف حمیدہ عطا فرمائے تھے جن کی بنیاد پر اپنے ہم عصر علماء سے ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، آپ کی چال ڈھال، نشست و برخاست، کردار و گفتار، سے ذہانت و متانت اور سنجیدگی و سمجھ داری عیاں تھی، بندہ نے جس سال جامعہ بنوری ٹاؤن میں درجہ اولیٰ میں داخلہ لیا آپ جامعہ میں نہیں تھے پرانے طلبہ کی زبانی سننے کو ملا کہ جب تک مولانا عطاء الرحمن صاحب تشریف نہیں لاتے اس وقت تک طلباء کے لیے نرمی کا معاملہ رہے گا، ان کی شخصیت سے متعلق دلی جستجو پیدا ہو گئی کہ کیسی شخصیت کے مالک ہوں گے اور آپ کے کیا کیا کمالات ہوں گے، تو آپ کی تشریف آوری اور آپ کی زیارت کا شدت سے احساس ہونے لگا بقرہ عید کے دنوں میں حضرت جامعہ از ہر مصر سے پاکستان پہنچ گئے اس کے بعد کو جامعہ کا ماحول تبدیل ہو گیا، مختلف کتابیں حضرتؒ سے پڑھیں ان کی تدریس کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ خود بھی وجد میں آ جاتے اور تمام طلبہ کتاب کے حل کرنے میں منہمک ہو جاتے آپ جیسا تدریس انداز کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملا، طلبہ کے ساتھ بے انتہاء شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، حضرت اس زمانے میں وسطانی دارالاقامہ کے ناظم ہوتے تھے اور رہائش بھی دارالاقامہ میں تھی آپ کے کمرہ کے بالمقابل ہمارا کمرہ تھا، ایک مرتبہ آپ کو پینے کے لیے پانی کی ضرورت تھی، جگ ہاتھ میں لیا ہمارے کمرہ میں تشریف لائے اس وقت بندہ کمرہ میں اکیلا تھا تو فرمایا آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ میں نے عرض کیا ٹھیک ہے، فرمایا تھکے ہوئے تو نہیں ہیں میں نے عرض کیا نہیں پھر فرمایا اس وقت کوئی کام تو درپیش نہیں ہے میں نے عرض کیا نہیں فرمایا یہ جگ لے لو اور نیچے سے ٹھنڈا پانی لے آؤ۔

حضرتؒ کی زیر نگرانی بندہ نے آٹھ سالہ تعلیمی دورانہ مکمل کیا، فراغت کے بعد جب بھی جامعہ میں حاضری ہوتی تو آپ سے ضرور ملاقات کا شرف حاصل ہوتا انتہائی محبت و شفقت سے پیش آتے، بعض اوقات تو بندہ کو شرمندگی محسوس ہوتی کہ استاذ محترم کچھ زیادہ ہی اکرام فرماتے ہیں، میرے شیخ و مربی شہید ناموس رسالت حضرت مولانا سعید احمد جلالپوریؒ جب تک حیات رہے چھوٹے بڑے تمام مسائل میں بندہ کے لیے ماویٰ و ملجاء رہے لیکن شیخ کی شہادت کے بعد جب مسائل و مشکلات کا سامنا ہوا تو بندہ نے حضرت استاذ محترم کی خدمت میں حاضری کا معمول بنایا، آپ ہمیشہ مفید مشوروں سے نوازتے، آخری مرتبہ جب صالح مسجد صدر میں ملاقات ہوئی بڑی محبت سے پیش آئے میں نے عرض کیا جب بھی میں پریشانی کے عالم میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا دل کو سکون ملا اور اشکالات حل ہو گئے آئندہ آپ اجازت دیں کہ باقاعدگی سے آپ کی خدمت میں حاضری دیا کروں؟ فرمایا اجازت ہے! لیکن آنے سے قبل فون ضرور کر لیا کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ آئیں اور میں نہ ہوں تو آپ کو تکلیف ہوگی پھر کافی نصیحتیں فرماتے رہے، آخر میں ایک جملہ ارشاد فرمایا:

پائے گدا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست

حضرت استاذ محترمؒ سے یہ آخری ملاقات تھی، چند ہی دنوں بعد آپ نے اس دنیا کو خیر باد کہا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و رپیدا

حضرتؒ نے اپنے سوگ واروں میں چار نسبی اور ہزاروں روحانی بیٹے چھوڑے ہیں، موت العالم موت العالم کے اصول کے تحت پورا عالم اسلام سوگ وار ہو گیا، آپ کے اس دنیا سے جانے کے بعد آپ کے تمام مشن جوں کے توں جاری ہیں، اللہ تعالیٰ حضرتؒ کے صدقات جاریہ کو تاقیامت قائم رکھے۔



ایک گوہر نایاب انسان

مولانا راشد الحق سمیع حقانی
مدیر ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک



گزشتہ ایک ماہ سے مسلسل علمی و دینی حلقے پے در پے حوادث کے جام پئے جا رہے ہیں، ایک کے بعد دوسرا حادثہ فاجعہ سر پر تیار کھڑا ہے۔ سمجھ نہیں آرہی کہ قیامت سے پہلے کیوں قیامت کی شروعات ہو گئیں ہیں؟ ۲۰۱۲ء اپریل ۲۰ء بھوجا ایئر لائن کے بدقسمت جہاز میں جہاں درجنوں بے گناہ پاکستانی شہید ہوئے وہیں ایک بہت قیمتی اور پیارے انسان حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ اپنی ہمیشہ اور اپنے وفادار رفیق سفر مولانا عرفان کے ہمراہ بھی شہادت کی اوج ثریا کو سر کر گئے۔

یوں تو حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ مادر علمی جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوریؒ ٹاؤن کے ایک استاد اور ناظم تعلیمات ہی تھے لیکن اس میں شک و شبہ نہیں کہ آپ کے اچانک پچھڑنے سے جامعہ بنوری ٹاؤن کی کمر اگر ٹوٹی نہیں تو جھکی ضرور ہے۔ حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ بنوری ٹاؤن کے مہتمم نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے روح رواں تھے۔ جامعہ کے ہر مہتمم اور ہر طالب علم اور استاد کیلئے مولانا کی سحر انگیز شخصیت فرض کی سی درجے کی حیثیت رکھتے تھے۔ بنوری ٹاؤن میں زمانہ طالب علمی کے دوران مولانا عطاء الرحمنؒ میرے استاد تو نہ تھے لیکن ایک مہربان مربی، بہترین مشفق دوست اور متعدد دور دراز غیر ملکی اسفار کے رفیق سفر رہے۔ پھر انسان کی باطنی خوبیوں اور صلاحیتوں سے اصل آگہی کسی سے معاملے اور سفر میں رفاقت سے مکمل آشکارا ہوتی ہے تو اس لحاظ سے یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان سے تقریباً ہر سال کچھ دنوں کی رفاقت سفر کے ذریعے حاصل ہو جاتی۔ وہ ایک بہترین انسان اور رفیق سفر اس معاملے میں بھی ثابت ہوئے۔ سفر میں ساتھی کی ایک چیز کا خیال رکھنا اور ہر ممکن سہولت فراہم کرنا ان کا خاصہ تھا۔ ان کی اچانک شہادت نے وہ ساری مجلسیں، محفلیں اور طویل ہوائی اسفار میں ان کی خوبصورت اور میٹھی میٹھی علمی، ادبی مجلسیں یاد کرادیں، آپ جہاز میں اکثر برادرم عتیق الرحمنؒ اور میرے ساتھ والی سیٹ پر تشریف رکھتے۔ حسین مسکراہٹ سے بھرپور پروقار خوبصورت چہرہ اور انکی لعل و گہر سے مرصع گفتگو کا ایک ایک لفظ یادداشت کے خانوں سے سینے میں اتر اتر کر قلب حزیں میں نشتر لگا رہا ہے۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں

اللہ نے ان کو علم کے ساتھ ادب کا ایک خاص ذوق بھی عطا فرمایا تھا۔ دورانِ درس بھی سینکڑوں عربی، اردو اشعار نوکِ زباں ہوتے اور پھر میرے ساتھ تو بات بات پر اشعار کا تبادلہ کرتے۔ راقم کی ”الحق“ کی خام تحریروں و مضامین پر تبصرہ فرماتے پھر خصوصاً میرے سفرنامہ یورپ ”ذوق پرواز“ کے اکثر اقتباسات اور اشعار بھی انہوں نے یاد رکھے تھے۔ اس حوالے سے بھی اکثر دلچسپ گفتگو فرماتے۔ افسوس ایک ایسا سدا بہار رخِ خندہ دوست ہم سے پچھڑ گیا جس کا نعم البدل اور اس کا ہم مثل ڈھونڈنے سے بھی اب ہم کو ملنے والا نہیں۔

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر اب نہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

آپ کی سادہ پروقار شخصیت میں بلا کی کشش اور جاذبیت و محبوبیت اللہ نے کوٹ کوٹ کر رکھی ہوئی تھی۔ زندگی بھر بنوری ٹاؤن کی تعمیر و ترقی اور اس کے انتظام و انصرام میں بسر کی۔ ادارہ الحق جامعہ بنوری ٹاؤن، حضرت کے جملہ پس ماندگان اور دوستوں سے دلی تعزیت کرتا ہے اور خود کو بھی تعزیت کا مستحق سمجھتا ہے۔ خصوصاً برادرم حضرت مولانا امداد اللہ مدظلہ جو اس تعزیت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے ایک ایسے دوست اور رفیق کو کھویا ہے جو صدیوں میں صدق و صفا کے خاص سانچوں میں ڈھل کر قدرت نے نکھارا تھا اور کسی خوشبو کے جھونکے کی طرح جمعہ کی شام ہواؤں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بکھر گیا۔

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا



ذہنوں میں ہمیشہ رہیں گے وہ

مولانا مفتی عبدالرحمن مدنی

مہتمم جامعہ محمودیہ مدنیہ بفرزوں



کون جانتا تھا کہ درجہ ثانیہ کے ایک نو عمر طالب علم کی حیثیت سے جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں داخل ہونے والا لڑکا ایک روز یہاں اتنا اہم قرار پائے گا کہ اس کے بغیر کارکنان جامعہ کی دھڑکنیں رُک جائیں گی، جب اُس نے ۸؍ ۱۹۷۷ء میں ۱۸ سال کی عمر میں جامعہ میں قدم رکھا تو خود اسے بھی معلوم نہ تھا کہ جامعہ کی محبت اس کے پاؤں کی زنجیر بن جائے گی۔

دو طرفہ محبت اور دو طرفہ تعلق کی یہ رومانوی بیل عطاء الرحمن نامی اس لڑکے کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ۱۹۸۵ء میں سند فراغت حاصل کی۔ جب میں نے انہیں دیکھا تو حیران سا رہ گیا۔ ۱۹۹۷ء میں جب میں بنوری ٹاؤن سے دورہ کر رہا تھا ایک کچم و شیم شخص ایک باوقار عالم دین، مگر پارے کی طرح متحرک، کس قدر ملاقاتیوں کا ہجوم، کہیں درس و تدریس کے حلقے، کہیں طلباء کے مسائل، تو کہیں چلتے پھرتے اور گزرتے گزرتے دائیں اور بائیں جانب کے ہمراہیوں سے سرگوشیاں اور آس پاس کے لوگوں کی جانب نگاہ سرگیں کی ہونٹوں تک واہوتی اچھلتی اچھلتی مسکراہٹیں، جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا، ایک پارہ، ایک سیارہ، ہر دم جہان لیے، ایک نیا جہان، عالمانہ وضع قطع، حسن سادگی اور وقار کا دل نشین امتزاج، لانا بقا بھاری مگر خوبصورت اور توانا جسم، موتیوں جیسے دانت اور حوروں سی مسکان، سرخ ہونٹ، باحیا آنکھیں، سرگیں اور دل نشین مسکراہٹ، آہنی عزم و ارادے کا حریر، اور دم محفل نو جوان، بزرگوں میں باادب جوان، اور جوانوں میں ہمزاد، طلباء میں دل پذیر معلم اور مشفق منتظم، ہمت ایسی کہ جوان دنگ، فکر ایسی کہ بزرگ ششدر، باتیں دل موہ لینے والی، گراں نہ گزرے تو وہ ایک جسم محبوب تھے، دلوں کو فتح اور دماغوں کو اسیر کر لینے والے، اپنانے اور اپنا بنالینے والے، نہ رکتے تھے نہ تھمتے تھے، ایک سیل موج بلاخیز، جدھر سے گزرے اخلاق و کردار کے زندہ نقوش چھوڑ گئے، زبان و بیان پر قدرت ایسی کہ عدیم النظیر، پٹھان پشتو پر سر دھنتے تھے تو اردو دانی کے ماہرین بے ساختہ دوزانو ہو جاتے تھے، ایک فرد نہ تھا انجمن تھی، تحریک تھی، تنظیم تھی، سمندر تھا اتہا سمندر، علم و عمل کا سمندر، عزم و ارادہ کا پہاڑ، مرد مجاہد، شاندار خطیب، جاندار انسان، بہترین معلم، کامیاب منتظم، یاروں کے یار، ہر وقت گلشن ہر وقت بہار، جہاں فکر رساں تھکتی ہے وہاں اُن کی موج رواں چلتی تھی، کراچی کے حالات کا جبر بھی اُن کی شجاعت کو زیر نہ کر سکا، دیوبندیت کا سچا سپوت، مفتی نظام الدین کو رونے والے خوب روئے مگر مولانا عطاء الرحمن کی شخصیت کی دل آویزی نے آخر کار زخم پر مرہم رکھ ہی دیا تھا پھر جو نظر کرم اٹھی عصری تعلیمی اداروں کے جوانوں اور بچوں کی جانب، تو تعلیم و تربیت کا ایسا نصاب مرتب کر دکھایا کہ جون جولائی کی تعطیلات میں ہر طرف دین کا ماحول بے دینوں کو بھی علم و عمل اور ماحول و فکر میں غوطے دے کر اصلاح کی راہ پر گامزن کر دیتا تھا۔ واللہ کان و کان!

ہر کام وہ پارے کی طرح کرتے، جانے کا بھی کچھ ایسا ہی کیا کہ کوئی جان نہ سکا کہ جانے والا لمحہ آنے والا ہے۔ جارہے تھے کہ یہ جا اور وہ جا، دین کی سلامتی کا غم و فکر تھا چنانچہ آگ کے سمندر اور لاوے میں تبدیل ہو جانے والے اڑن کھٹولے میں بھی رحمٰن نے عطاء الرحمن کی لاج رکھی، صحیح سلامت جسم کے ساتھ انہیں طلباء میں لے آئے، فانی دنیا سے جانے والے لیٹے ہوئے ہوتے ہیں وہ اس وقت بھی لیٹنے کو تیار نہ تھے، لیٹے ہی نہیں، متحرک سپاہی اور باادب مگر متحرک انسان کی طرح سینے پر ہاتھ باندھے بیٹھے تھے۔

لامحدود صفات والے تھے وہ

محدود الفاظ میں کہاں سمائیں گے وہ

ذہنوں میں ہمیشہ رہیں گے وہ

احساس بن کر زندہ رہیں گے وہ



شیخ عطاء شہیدؒ کی چند وہبی و کسبی نمایاں خوبیاں!

حضرت مولانا مفتی رفیع احمد بالا کوٹی

رہنما شعبہ تخصص فی الفقہ و استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن



یوں تو حق تعالیٰ شانہ نے ہر انسان کے اندر دو چار خوبیاں رکھی ہوتی ہیں جو اس انسان کی شخصیت اور مقام و مرتبہ کا پتہ دیتی ہیں، مگر بعض انسانوں میں عادت و معمول سے زیادہ کچھ ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو انسان کی اپنی شخصیت و منزلت کی عکاس ہونے کے علاوہ دوسروں کے لیے بہترین نمونہ اور راہ نما اصول کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ ایسے ہی منفرد اور یگانہ روزگار انسانوں میں سے ایک عظیم انسان، استاذ مکرم، شیخ معظم حضرت مولانا عطاء الرحمن نور اللہ مرقدہ بھی تھے، جن کی عملی زندگی کے بعض نمایاں پہلو، انسان کی شخصیت سازی اور کردار سازی کے لیے بہترین مثال اور مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند خوبیاں اور بعض نمایاں پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔ ع

اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ عطاء الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کو جن وہبی و کسبی خوبیوں سے آراستہ فرمایا تھا، ان میں اخلاص و للہیت، صورت و سیرت، ذہانت و فطانت، قابلیت و لیاقت، شفقت و رحمت، الفت و محبت، فدائیت و فنائیت، امانت و دیانت، تقویٰ و طہارت، مواسات و اخوت، ادب و عقیدت، غیرت و حمیت، حوصلہ و ہمت، خودی و خود ارادیت، بے تکلفی و بذات، شرافت و نجابت، اثر پذیری و جاہت، کشش و جاذبیت، رعب و حشمت، احترام و عظمت، اخلاق و مروت اور علیست و عملیت بطور خاص نمایاں تھیں۔

اس کے علاوہ جامعہ سے بے لوث تعلق اور ہمہ وقت فکر مندی، علمی رسوخ کے ساتھ تدریسی شغف، ریا و نمود سے دوری، جب جاہ سے نفرت، حسن معاملگی، اقرباء پروری اور استثنائی سوچ سے ماورائی، اکابر پر بے پناہ اعتماد اور ان کے مرتبہ احترام کی مکمل پاس داری، جادہ حق پر سختی سے کاربندی، افراط و تفریط سے اجتناب، مردم سازی اور مردم شناسی میں بے مثال، قوت فیصلہ اور دوراندیشی میں بے بدل، افادہ میں تخصیص کی بجائے تعمیم کے روادار، بلا امتیاز نصیح و خیر خواہی سے سرشار، چھوٹوں پر عنایات و نوازشات میں مجسمہ جود و سخا، دوسروں کی حوصلہ افزائی اور تشجیع میں سخاوت کی انتہاء، دوسروں کی حسن کاردگی کا فراخ دلی سے برملا اعتراف، چھوٹوں کی معمولی معمولی صلاحیتوں کے قدردان، کمزوروں کے بھی خواہ اور بے کسوں کے غم خوار، حد درجہ کفایت شعار اور خود دار، پیکر صدق و وفا، خود پیچھے رہ کر دوسروں کو نمایاں کرنے کے جذبے سے مالا مال، یہ آپ کی وہ چند نمایاں خوبیاں تھیں جو حضرت شیخ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی عملی زندگی میں واضح طور پر جھلکتی تھیں، جنہیں اپنی فہم کوتاہ کے مطابق، اس مختصر مجلس میں برجستہ قلم زد کر رہا ہوں، ورنہ کہاں میں اور کہاں اُن کی بلند و بالا شخصیت!

ما تماشا کنان کو تہ دست تو درخت بلند و بالائی

ممکن ہے کوئی قاری درج بالا سطروں کو بے جا تکلف یا محض لفاظی سمجھے، مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ الفاظ درحقیقت بندہ کے اس ذہنی خاکہ کے ذیلی عناوین ہیں جو حضرت استاذ محترم کے شخصی خاکے سے متعلق دل و دماغ میں موجزن ہیں، ان تمام عناوین کے مندرجات و محتویات کی تفصیلات تحریر میں لانے کا زبردست داعیہ اور محرک دل میں موجود ہے، آپ کی شہادت باسعادت سے تاحال اسی کوشش میں رہا کہ تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کروں، مگر تاخیر در تاخیر سے یہ خیال بار بار آنے لگا ہے کہ شدید قلبی تقاضے اور فراوان مواد کی موجودگی کے باوصف، کچھ لکھنے کی نوبت نہ آنا، ممکن ہے استاذ محترم کے خاص روحانی تصرف کا نتیجہ ہو، کیوں کہ وہ جس طرح زندگی میں اپنی ذات اور شخصیت کے بارے میں حقیقت کشائی کو ناگوار سمجھتے تھے، شاید اسی طرح بعد از مرگ ناگہاں بھی اس کے روادار نہیں ہیں۔

لیکن حضرت شیخ عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے جب کبھی بے تکلف روحانی ملاقات ہوگی تو بصد اصرار، اجازت طلبی کروں گا اور ان سے یہ عرض کروں گا کہ آپ نے اپنی ذات اور شخصیت کو انخفا کے دبیز پردوں میں زندگی بھر جس قدر چھپا رکھا تھا، آپ کی شہادت اور آپ کے جنازے کے ہجوم سے وہ پردے ہٹ چکے ہیں۔ دنیا پر آپ کی شخصیت اور آپ کا مقام رفیع آشکارا ہو چکا ہے اور آپ علامہ ابن السماک رحمہ اللہ کے اس جملے کا مصداق بن چکے ہیں جو انہوں نے داؤد الطائی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر ملال پران کے پیروکاروں کی حالت اور جنازے کے شرکاء کے ہجوم کو دیکھ کر ارشاد فرمائی تھی۔ ہم علامہ ابن السماک رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کے ساتھ اپنے شیخ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ: لو رأیت الیوم کثرة تبعک، لعرفت ان ربک قد اکرمک الغرض آپ نے زندگی بھر تواضع و خمول اور انخفا کا جو اہتمام فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کو یہ ادا شاید بہت پسند تھی، اس لیے آپ کی قدر و منزلت کا دنیا پر عیاں ہونا تکوینی معاملہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی کچھ کہنے اور لکھنے کی روحانی اجازت دیں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق کی استدعا بھی فرمائیں کیوں کہ۔

آہ! مشفق استاذؒ

مولانا محمد طیب لدھیانوی
نائب ناظم کتب خانہ جامعہ بنوری ٹاؤن



کراچی سے اڑنے والا طیارہ تیز و تند آندھی، کڑکتی آسمانی بجلی اور موسلا دھار طوفانی بارش میں اپنے مسافروں کو اس جہاں میں لے گیا جہاں سے کوئی بھی واپس پلٹ کر نہیں آتا، حادثہ کا شکار ہونے والے پائلٹ عملہ سمیت ۱۲ مسافر اپنے عزیز واقارب اور دوستوں رشتہ داروں کے لیے دل و جان سے عزیز اور پیارے تھے تمام ہی قابل عزت و احترام تھے۔

اس افسوس ناک حادثہ کا شکار ہونے والوں میں ملک کی عظیم دینی درسگاہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے وفادار، قابل فخر استاذ اور ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ بھی شامل ہیں۔

کلیوں کو میں خونِ جگر دے کے چلا ہوں صدیوں مجھے گلشن کی فضا یاد کرے گی

آہ!..... استاذ محترم کی دینی و علمی خدمات، آپ کا اخلاص واللہیت، آپ کی دیانت، امانت، ذہانت و فطانت، تصنع و تکلف اور شہرت و نمود سے آپ کی طبعی نفرت و کراہت کا آنکھوں دیکھا حال، ایسی جامع کمالات و صفات ہستی کا یکا یک نظروں سے اوجھل ہو کر تعلیم و تدریس کی محفل کے علاوہ ہزاروں شاگردوں، فضلاء جامعہ، اساتذہ کرام، رشتہ داروں کے دلوں کو ویران کر جانا جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔

استاذ محترم شہیدؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں مردان میں حاصل کرنے کے بعد بقیہ تعلیم بنوری ٹاؤن سے حاصل کی تعلیم کے بعد ۱۹۸۵ء میں جامعہ ہی میں استاذ مقرر ہوئے آپؒ ایک بارعب اور باکمال شخصیت کے مالک تھے، ہمیں درجہ اعدادیہ میں پڑھایا، اس وقت حساب/ریاضی پڑھاتے تھے، اکثر فرمایا کرتے تھے ”گھنٹہ حساب کا ہے، مگر حساب کتاب، اچار چٹنی، کھٹا میٹھا سب ہوگا“، واقعی آپؒ اپنے گھنٹے میں دین کی بہت اہم باتیں، حدیثوں کا خلاصہ، دیگر اہم اہم واقعات بیان فرماتے تھے، ابتداء ہی سے خوب باصلاحیت اور باکمال بنانے کی سعی فرماتے رہتے تھے۔ پھر ہمیں آپ سے اولیٰ میں نحو میر، ثانیہ میں ہدایۃ النحو، زاد الطالبین، ثالثہ میں تفسیر، ریاض الصالحین، رابعہ میں شرح جامی، خامسہ میں حسامی، سادسہ میں جلالین پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، جب کہ آخر میں آپ شہادت تک شرح جامی، مشکوٰۃ، صحیح مسلم اور صحیح بخاری وغیرہ کتب اپنے ایک مخصوص انداز سے پڑھاتے تھے۔

استاذ محترم شہیدؒ اپنی گرج دار، خوبصورت اور مترنم آواز کے ساتھ جب بنوری ٹاؤن کی بابرکت فضاؤں میں ”قال رسول اللہ ﷺ“ کی صدا بلند کرتے تو ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوتا..... کہ شاید وہاں موجود ہر چیز اپنے اپنے انداز سے آپؒ کے درس میں شرکت کی سعادت اور آپؒ کے دلکش انداز تدریس سے روحانی سکون پارہی ہے، آپؒ نے جامعہ سے نہ صرف فیض حاصل کیا، بلکہ جامعہ سے وفاداری، خدمت اور اس کا حق بھی ادا فرماتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ حضرت مفتی احمد الرحمنؒ کے زمانہ میں ۱۰/۹/۱۴۰۰ محرم الحرام کو اہل تشیع کے جلوس کے موقع پر جب کہ ہر طرف ناکہ بندی، فائرنگ، پولیس والوں کی طرف سے شدید شیلنگ جامعہ کے اطراف میں ہو رہی تھی، بڑے بڑے افسران، ڈی آئی جی، ڈی ایس پی، رینجرز، پولیس کا چاروں طرف پہرا تھا، اس موقع پر حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ کے ہمراہ دیگر علماء کے ساتھ جلوس کو روکنے کے لئے اپنے سینہ میں گولی کھانے کے لئے یا جیل جانے کے لئے جو حضرات قدم بڑھاتے ہیں، ان میں ایک ہمارے استاذ بھی تھے۔ ان ناعاقبت اندیش افسران کے حکم پر مفتی صاحبؒ کے ساتھ استاذ شہیدؒ کے علاوہ دیگر علماء کرام کو کئی روز تک جیل کی سلاخوں میں بند رکھا۔

آج اسے محامدانہ کردار، نئے اور پرانے فتنوں کی سرکوبی میں پیش پیش ہونے کی وجہ سے ہمیشہ دین دشمنوں کی نظروں میں کھٹکتے رہے

آپؒ نے مختلف شخصیات کو جدوجہد کے لیے تیار فرمایا بلاشبہ اس دور میں حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم و دیگر علماء اکابرین کے ساتھ ساتھ مفتی محمد ولی درویشؒ، مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اور مولانا امداد اللہ مدظلہ کو یہ سعادت حاصل رہی کہ جب بھی جامعہ کی طرف کسی غنڈے بد معاش نے میلی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی یہ حضرات اپنی مادر علمی کی حفاظت کے لیے صف اول میں دکھائی دیے۔

آپؒ گونا گوں صفات کے مالک تھے، بہترین اعلیٰ منتظم، قابل مدرس اور ایک اچھے عمدہ خطیب تھے، عرصہ دراز سے صالح مسجد صدر کراچی کے امام خطیب رہے۔ وہ ہر فن کے ماہر تھے، سادہ زندگی کے حامل تھے، شفیق و مہربان تھے اور دوستانہ تعلق رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اچانک حادثہ کی خبر سن کر کئی ہمارے ساتھی، آپؒ کے قریبی شاگرد غم کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گئے، آپؒ تقریباً ۲۷ سال سے متواتر جامعہ میں تدریس فرما رہے تھے، گذشتہ دس سال سے ناظم تعلیمات تھے، آپؒ سے قبل استاذ محترم حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ تھے، جن کے مستقل صاحب فراش ہو جانے کے بعد آپؒ گونا گوں تعلیمات بنادیا گیا۔

استاذؒ سے دوستی، تعلق نبھانے والے شاگرد اور فضلاء ایسے کہ ایک بار کسی سے تعلق پیدا ہو جاتا تو تمام تکلفات، فرق مراتب، شاگردی اور استاذی کے رشتے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تعلق نبھاتے، وہ دوستی میں تکلف کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

ہمارے گہرے ساتھی مولانا محمد عرفان حمید مبین شہیدؒ جو اس سفر میں بھی مولاناؒ کے فریق تھے، اس کی واضح مثال ہیں کہ وہ مولانا کے شاگرد تھے، لیکن جس نے بھی دونوں کو ساتھ دیکھا، یہی تبصرہ کیا کہ کیا بے تکلف دوستی ہے؟! الحمد للہ! حضرت بنوریؒ کے اخلاص کی بدولت جامعہ علوم اسلامیہ کی مٹی انتہائی زرخیز ہے، اس سے اخلاص، سچے دل سے وفا کرنے والوں سے اللہ پاک نے ضرور دین کا کام لیا، کام بھی ایسا کہ جس کی معاشرے کو سخت ضرورت ہو۔ آپؒ اس فکر میں رہتے کہ اسکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ، طالبات سالانہ چھٹیوں کو ضائع نہ کر دیں، عصری اداروں میں زیر تعلیم لڑکوں/لڑکیوں کے لئے سالانہ چھٹیوں میں ابتدائی دینی تربیت کے چالیس روزہ تربیتی پروگرام کی بنیاد اسی صالح مسجد صدر میں رکھی، اور اس کے لئے متفرق کتابیں ترتیب دیں، یہ سلسلہ بہت جلد مقبول ہوا، کراچی کی طرح ملک بھر میں علماء اور جامعہ کے فضلاء اسی انداز سے تعلیم و تربیت کے پروگرام ترتیب دے رہے ہیں، بلاشبہ اس کا خیر کا سہرا استاذؒ کے سر ہے، یہ صدقہ جاریہ ان شاء اللہ! درجات کی بلندی کا باعث بنے گا۔ آپؒ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نصاب کمیٹی کے ممبر بھی تھے، آپؒ اصول ضوابط کے انتہائی پابند تھے، اصول کی خلاف ورزی پر اگرچہ آپؒ کا قریبی عزیز رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، نرمی کا معاملہ ہرگز نہ فرماتے تھے۔

حضرت شہیدؒ کے جہاں اندرون ملک ہزاروں شاگرد ہیں، وہیں بیرون ممالک میں بھی آپ کے ہزاروں شاگرد ہیں، جن کی دعوت پر کئی ممالک کا دورہ فرما کر وہاں کے دینی پروگرام میں شرکت اور کئی مدارس و مساجد کا افتتاح فرمایا تھا، آپؒ نے بے انتہاء امانت داری اور دیانت داری کا ثبوت دیا، بارہا جامعہ کے کتب خانہ سے کوئی کتاب یا شرح مطالعہ کے لئے لیتے، فراغت کے فوراً بعد خود آ کر اپنے نام سے کٹواتے، اکثر پوچھتے رہتے کہ میرے نام کوئی کتاب یا شرح تو نہیں؟ حادثہ سے ایک روز قبل معمول کے خلاف مغرب کی نماز کے بعد کتب خانہ تشریف لائے، علیک سلیک کے بعد فرمانے لگے: میرے نام کتاب/شرح ہو تو کل بتا دینا، کیا معلوم تھا کہ زندگی کی آخری باتیں اور ملاقات ہے؟ آپؒ کی ہمیشہ صاحبہ اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ اپنے شوہر کے کسی عزیز کی وفات پر کراچی آئیں، ان کا یہ پہلا کراچی کا سفر تھا، واپسی بذریعہ بس سفر کا ارادہ کر چکی تھیں، مگر بھائی جان شہیدؒ نے روک لیا کہ میرے ساتھ جہاز سے سفر کرنا، مگر کسے معلوم تھا کہ بھائی جان صرف چند گھنٹوں کی رفاقت پر راضی نہیں ہوں گے، یہ جہاز کا ٹکٹ کسی لمبے سفر کا ہے، نیز بہن نے بھی بھائی کا ساتھ نبھا کر ثابت کر دیا کہ خون کے رشتوں میں کتنی وفا ہے؟ دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس فضائی حادثہ میں شہید ہونے والے تمام مسلمانوں خصوصاً استاذ شہیدؒ اور دیگر علمائے کرام کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ سب کے لواحقین، عزیز واقارب، رشتہ داروں کو صبر جمیل عطا فرمائے، مولانا عطاء الرحمنؒ کی اہلیہ، صاحبزادوں، خصوصاً آپؒ کے والدین کو حوصلہ نصیب فرمائے، آمین۔

عجب قیامت کا حادثہ ہے!

مولانا محمد شفیع چترالی

مدیر روزنامہ اسلام واستاذ شاخ جامعہ بنوری ٹاؤن



جمعہ کی شام اسلام آباد ایئر پورٹ کے قریب نجی طیارے کے گر کر تباہ ہونے کا سانحہ شاید بہت سے لوگوں کے لئے معمول کا ایک حادثہ ہی ہو، جس پر وقتی طور پر اظہارِ افسوس کر لیا جائے گا اور دو چار روز گزر جانے کے بعد میڈیا کی جانب سے اُٹھائے جانے والے کسی نئے طوفان کی لہروں کے نیچے بہت سے دیگر حادثات کی طرح اُسے بھی دبا دیا جائے گا، مگر میرے لئے اور ان تمام ان لوگوں کے لئے جن کے رشتہ دار، بزرگ اور دوست احباب اس سانحہ کی نذر ہو گئے، یہ قیامت سے پہلے قیامت سے کم نہیں ہے۔

ویسے تو اس سانحے میں جتنے بھی افراد، خواتین، بچے شہید ہوئے ہیں، سب کی جانیں قیمتی تھیں اور ان سب کے اہل خانہ ہمدردی و تعزیت کے مستحق ہیں لیکن یہ سانحہ بالخصوص اہل دین کیلئے اس لحاظ سے سوہان روح اور جانکاہ ثابت ہوا ہے کہ اس میں ۶ علماء کرام بھی شہید ہو گئے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ دین کا ایک ستون تھا۔ ان میں سے نمایاں نام عالم اسلام کے ممتاز دینی ادارے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات و استاذ حدیث، میرے محسن و مربی استاذ محترم مولانا عطاء الرحمنؒ کا ہے جو اس حادثے میں اپنی ہمیشہ اور دیرینہ خادم و محب مفتی عرفان حمید میمنؒ سمیت شہید ہو گئے اور یوں ہم ایک بہت بڑی خیر سے محروم کر دیے گئے۔ اُن کی شہادت پر دینی حلقوں میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔

ہمارے دکھ کا وہ لوگ شاید صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے جو نہیں جانتے کہ مولانا عطاء الرحمنؒ ہمارے لئے کیا تھے اور ان کی شخصیت عقیدت و محبت کے کتنے پروانوں کے لئے شمع فروزاں کی حیثیت رکھتی تھی۔ مادرِ علمی جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کو ویسے تو پہلے بھی کئی جانکاہ حادثات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے، لیکن حضرت ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئیؒ کی شہادت کے بعد سے یہ سب سے بڑا سانحہ ہے، جس سے جامعہ کو دو چار ہونا پڑا۔ جمعہ کی شام حادثے کی اطلاع ملنے پر شہر بھر سے علماء کرام، طلبہ اور عوام کی ایک بڑی تعداد جامعہ پہنچی، اس موقع پر ہر آنکھ اشک بارتھی اور ہر فرد دوسرے سے گلے لگ کر رو رہا تھا، صبر و ضبط کے بندھن برقرار رکھنا کسی کے لئے آسان نہ تھا، جامعہ کے بڑے اساتذہ و مشائخ دارالحدیث میں جمع تھے اور طلبہ و اصاغر کوتلی دیتے ہوئے کبھی کبھار خود بھی حرفِ تسلی کے محتاج دکھائی دے رہے تھے۔ صرف ایک روز قبل اسی دارالحدیث میں حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ نے ششماہی امتحان کے نتائج سنائے تھے اور اساتذہ سے خطاب فرمایا تھا، وہ منظر کسی کے ذہن سے ہٹ نہیں پارہا تھا، عشاء کی نماز میں جامع مسجد بنوری ٹاؤن کے امام مولانا سید یوسف حسن طاہر نے صبر والی آیات پڑھنے کی کوشش کی، لیکن لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گئے اور پوری جماعت پر رقت طاری ہو گئی۔ حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کی شخصیت کو کھونے کا احساس کسی کو برداشت نہیں ہو پارہا تھا، جامعہ کے رئیس و شیخ الحدیث حضرت علامہ ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم کو یہ خبر دیر سے اور تدریجی انداز میں دی گئی، کیونکہ سب کو اندازہ تھا کہ اپنے قابلِ فخر شاگرد، دستِ راست اور جامعہ کی متاعِ عزیز کے اس طرح اچانک کھوجانے پر ان کے دل پر جو پہلے کئی بار اس طرح کے حادثات سے چھلنی ہو چکا ہے، کیا گزر سکتی ہے۔ استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن رحمہ اللہ جن کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ لکھتے ہوئے قلم کپکپا رہا ہے، کے تعارف کے لئے تو اتنی بات ہی کافی ہے کہ وہ عالم اسلام کی عظیم درس گاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی نظامت تعلیمات کے مسند نشین تھے اور دنیا بھر سے آئے ہوئے ۱۲ ہزار سے زائد طلبہ و طالبات کے تعلیمی امور کے نگران تھے، تاہم ان کی شخصیت کے چند پہلو ایسے تھے جن میں ان کو اللہ تعالیٰ نے امتیازی شرف سے نوازا تھا، ان کی ذہانت و فطانت دینی حلقوں میں ضرب المثل تھی، وہ ملک کے قابل ترین مدرسین میں شمار ہوتے تھے، جنہیں بہت سے علوم و فنون میں مہارت کا ملہ حاصل تھی۔

حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ مردان کے علاقے بابوزئی سے تعلق رکھتے تھے، ان کی سن پیدائش ۱۹۶۰ء بنتی ہے، انہوں نے اپنے علاقے میں میٹرک اور دارالعلوم شیرگڑھ میں کچھ ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد ۱۹۷۵ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا اور ۱۹۸۳ء میں جامعہ سے سند فراغت حاصل کر لی اور پھر جامعہ ہی سے تخصص کرنے کے بعد حضرت مفتی احمد الرحمنؒ کی عقابانی نگاہ انتخاب کو بھاگئے اور جامعہ ہی میں مدرس بنے۔ حضرت مفتی عبدالسمیع سندھی شہیدؒ کی معیت میں دارالافتاء (ہاسٹل) کی نگرانی اور دیگر انتظامی ذمہ داریوں پر بھی مامور کیے جاتے رہے، اپنے حسن انتظام، اخلاص، اور مادرِ علمی کے ساتھ جذبہ وفاداری کی بدولت ترقی کرتے رہے۔ حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ کے دور میں ان کے بھی معتمد خاص اور معاون رہے۔ انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ مولانا نے فنون کی مشکل کتابوں کی تدریس بھی جاری رکھی۔ انہوں نے جس محنت سے پڑھا تھا، اسی محنت سے پڑھانا

بھی ان کا خاص وصف تھا۔ مولانا کا شمار ملک کے قابل ترین مدرسین اور ذہین ترین علماء میں ہوتا تھا۔ وہ عالم اسلام کا ایک بڑا اثاثہ تھے۔ ان کی ہمہ جہت خدمات کا دائرہ دنیا کے بیسیوں ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔ ملک کے اندر ہزاروں علماء کے استاذ اور سینکڑوں دینی اداروں اور مکاتب کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے ان کی ایک پہچان تھی تو ملک سے باہر بھی ہزاروں شاگردوں کے دینی و علمی خدمات کی شکل میں ان کا فیض جاری تھا۔ وہ تقویٰ و طہارت، اخلاص و للہیت، استغناء و توکل اور اخلاق حسنہ کی اسلاف کی اعلیٰ روایات کے امین تھے۔

علاوہ ازیں تدریس کے ساتھ انہیں جہانگیر پارک کراچی صدر کی جامع مسجد صالح کی امامت و خطابت کی ذمہ داری بھی دی گئی، جسے وہ آخر دم تک بحسن و خوبی نبھاتے رہے۔

۲۰۰۲ء میں حضرت مولانا عبدالقیوم چترالیؒ کی علالت و معذوری کے بعد حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کو جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کی نظامت تعلیمات کے منصب کے لئے منتخب کیا گیا جو ان کی انتظامی قابلیت، دیانت، اور اخلاص و للہیت پر جامعہ کے اعتماد کا بہترین مظہر تھا اور اپنے دس سالہ دور نظامت میں انہوں نے اس پر پورا اتر کر دکھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت سے جامعہ بنوری ٹاؤن کو ایک ایسا نقصان پہنچا ہے، جس کی تلافی شاید آسانی سے نہیں ہو سکے گی۔ حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کی خدمات کا دائرہ صرف جامعہ بنوری ٹاؤن تک محدود نہیں تھا۔ انہوں نے صالح مسجد صدر سے اسکول و کالج کے طلبہ کے لئے سالانہ چھٹیوں کے ”تعلیم و تربیت کورس“ کا آغاز کیا، اس کے لئے ایک نصاب بنایا اور ٹیم تشکیل دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک بھر میں اور بیرون پاکستان کئی ممالک میں اس کورس کا آغاز کروایا اور لاکھوں بچوں کو ابتدائی دینی تربیت فراہم کرنے کا انتظام کیا۔ علاوہ ازیں مولانا ملک کے اندر اور بیرون ملک سینکڑوں دینی اداروں کے سرپرست اور نگران بھی تھے اور دنیا کے مختلف حصوں میں دینی و علمی خدمات سرانجام دینے والے اپنے شاگردوں سے مسلسل رابطے میں رہنے کے علاوہ ان کی سرپرستی بھی فرمایا کرتے تھے۔ اپنے ہزاروں شاگردوں کی طرح راقم پر بھی مولانا کی بہت شفقتیں تھیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے زبردست شخصی و جاہت، ژرف نگاہی اور نکتہ سنجی سے نوازا تھا، اس لئے ہمیشہ ان کی شخصیت کا رعب و دبدبہ ہم جیسے نالائق طالب علموں پر طاری رہتا تھا، ان سے نظر ملا کر بات کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ میری تحریروں پر ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے اور کبھی غیر محتاط جملے لکھنے پر گرفت اور اصلاح بھی فرماتے جو میرے لئے سرمایہ حیات ہے۔ مولانا جس منصب پر تھے اور جو خدمات انہوں نے سرانجام دیں، اس کے پیش نظر ان کے نام کی بڑی شہرت ہونی چاہئے تھی، لیکن یہ ان کے مزاج میں ہی نہیں تھا، وہ شہرت سے بہت دور بھاگتے تھے، مجھے خاص طور پر تاکید کی ہوئی تھی کہ جامعہ کے پروگراموں کے حوالے سے میرے نام کی تشہیر بالکل نہ کی جائے۔ ایک آدھ دفعہ ان کا نام غلطی سے آیا تو ناراض ہو گئے۔ وہ جامعہ کے ناظم تعلیمات ہونے کی حیثیت سے بہت سی مراعات کے مستحق تھے، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ جامعہ کی کسی شاخ کا معائنہ کرنے جاتے تو کسی طالب علم کے ساتھ بایک پر بیٹھ کر چلے جاتے، نماز پڑھانے کے لئے بھی اکثر بسوں میں گر و مند ر سے صدر جاتے رہے۔ تصنع، تکلف، بناوٹ اور شہرت و نمود سے ان کو طبعی کراہت رہتی تھی۔ جامعہ کی تقریبات کی نظامت بھی اکثر مولانا ہی کرتے، سیدھے سادے الفاظ میں مطلب کی بات کرنا ان کا کمال تھا، حالانکہ ان کا ادبی ذوق بھی پورے جامعہ میں سب سے ممتاز تھا۔ انہیں عربی، فارسی، اردو، اور پشتو کے ہزاروں اشعار از بر تھے اور ان کا ایسا بر محل استعمال کرتے جیسے وہ اشعار اسی محل کے لئے وارد ہوئے ہوں۔ ہمیں ان سے درجہ موقوف علیہ میں تفسیر بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھنے کا اعزاز حاصل رہا، ایک جانب علامہ بیضاوی کی علمی و ادبی مویشگافیاں اور دوسری جانب مولانا عطاء الرحمنؒ کا ذوق لطیف سونے پر سہاگہ اور عربی جاننے والوں کے لئے ”علی التمرۃ مثلھا زبداً“ کا مصداق بن جاتا، جس کا ذائقہ آج بھی ہماری زبانوں پر ہے۔ آج استاذ جی ہم میں نہیں رہے تو مجھے وہ اشعار یاد آ رہے ہیں جو وہ جامعہ کے اکابر کی شہادتوں کے موقع پر پڑھا کرتے تھے:

عجب قیامت کا حادثہ ہے، اشک ہیں آستین نہیں ہے
زمین کی رونق چلی گئی ہے، افق پہ مہر مبین نہیں ہے
تری جدائی میں مرنے والے! وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تیری مرگ ناگہاں کا، مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے۔

مولانا کی شہادت سے پورے عالم اسلام کو بالعموم اور متوسلین جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کو بالخصوص بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی اور اس سانچے میں شہید ہونے والے تمام مسلمانوں کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔



ایک سانحہ ایک المیہ

مولانا محمد اسماعیل ریحان

کالم نگار روزنامہ اسلام



ویسے تو جہانگیر پارک صدر کی صالح مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے کا لطف الگ ہی محسوس ہوتا تھا مگر اس دن نجانے میرا دل کیوں کچھ بے کل سا ہو گیا کہ مولانا عطاء الرحمن صاحب نماز کے بعد دعا کراتے ہوئے بہت زیادہ روئے تھے: ”یا اللہ ہم تیرے گناہ گار بندے ہیں، تیری رحمت بڑی وسیع ہے، یا اللہ ہمیں معاف فرما دے۔ اس حال میں تیرے سامنے حاضر ہوں کہ تو ہمیں معاف کر چکا ہو، تم ہم سے راضی ہو، ہم تجھ سے راضی ہوں۔“ صرف مولانا ہی نہیں رو رہے تھے۔ مقتدی بھی آب دیدہ تھے۔

میں اسلام آباد پہنچ گیا، پھر گردونواح کے شہروں میں آنا جانا رہا، کئی مدارس اور دینی مراکز میں حاضری دی، مگر اپنے آبائی گاؤں کے قریب ترین شہر حسن ابدال ایک دن بھی نہ جاسکا، حالانکہ ہمارے سب سے زیادہ رشتہ دار وہیں رہتے ہیں۔ آخر جمعہ ۲۰/ اپریل کا دن نکال کروہاں رشتہ داروں اور دوست احباب سے ملا۔ عصر کے قریب معلوم ہوا کہ ادارہ علوم القرآن کے ناظم صاحب کے ایک دوست نے فتح اللہ گاؤں میں ضیافت پر مدعو کیا ہے۔ ناظم صاحب مجھے ساتھ لے کر وہاں روانہ ہوئے۔ یہ عصر مغرب کا درمیانی وقت تھا۔ ابر جو پہلے ہی چھایا ہوا تھا اچانک بہت گہرا ہو گیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ شام پر رات کا گمان ہونے لگا۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج سے ایسا لگتا تھا جیسے آسمان ٹوٹ کر گرنے کو ہے۔ ہم فتح اللہ گاؤں پہنچ کر نماز مغرب سے فارغ ہوئے تھے کہ اچانک ناظم صاحب کے موبائل پر ایک پیغام آیا: ”اسلام آباد کے قریب ایک طیارہ تباہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا، میں حیران سا ہوا کہ یا اللہ یہ کیا ہو گیا۔ دو سال پہلے کے فضائی حادثے کا خیال آ کر گزر گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے بھی ایک میسج آچکا تھا۔ پڑھا تو صدمے سے ساکت و جامد رہ گیا: ”بھوجا ایرلائن کا طیارہ تباہ۔ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب سمیت کئی علماء شہید۔“ خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر جلد ہی مختلف ذرائع نے اس سانحے کی تصدیق کر دی۔

اگلے دن ہم اسلام آباد میں تھے، جہاں مولانا کی نماز جنازہ ادا کی جا رہی تھی۔ لوگوں کا ایک جم غفیر جمع تھا۔ سب کی حالت غم و اندوہ سے غیر تھی۔ بڑی تعداد میں علماء تشریف لائے تھے۔ ان کے علاوہ عوام بھی کم نہیں تھے۔ ہر ایک اس رنج و غم میں شریک تھا۔ بلاشبہ یہ ایک قومی سانحہ تھا۔ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جاتا کم تھا۔ نماز جنازہ کے لیے قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب تشریف لا رہے تھے۔ اس سے پہلے خطیب ملت حضرت مولانا عبد المجید شاہ ندیم نے حاضرین سے ایک پرتاثیر خطاب کرتے ہوئے کہا: ”بعض حادثے ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر اظہارِ افسوس کے لیے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ یہ بھی ایسا ہی ایک سانحہ ہے۔“ انہوں نے حاضرین کو یاد دلایا کہ موت اپنے وقت سے ایک لمحہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ موت کا وقت ان چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ لقمان میں پانچ خصوصی غیبی چیزوں میں شمار کیا ہے..... ”کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں (کس حال میں اور کب) مرے گا“.....

شاہ صاحب کے خطاب نے حاضرین پر رقت بھی طاری کی اور صدمے سے چھلنی دلوں پر تسلی کا چھایا بھی رکھا۔ پونے بارہ بجے قائد جمعیت تشریف لے آئے۔ بلاتاخیر نماز جنازہ ادا کی گئی۔ میت کو ایسولنس میں آبائی علاقے لے جایا گیا۔ کچھ لوگ ساتھ گئے اور اکثر دعائے مغفرت کرتے اور اس صدمے کو دل میں دباتے ہوئے اپنی منزلوں کو لوٹے۔ بندہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے، جو کراچی واپس آ کر اس کرب کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہا ہے۔

مولانا ایسے لوگوں میں سے تھے جن کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان کی عمر ۵۳ سال کے لگ بھگ تھی مگر بڑے عمر رسیدہ علماء و مشائخ بھی ان کی بزرگی کا اعتراف کرتے تھے اور ایسے القابات سے ان کا ذکر کرتے جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا کہ یہ حضرات مولانا مرحوم کی للہیت سے خود بہت متاثر ہیں۔ ان کی زندگی میں بھی چھوٹے بڑے سب ان کی خوبیوں کے معترف تھے اور آج ان کی جدائی پر یہی تاثرات زبان و قلم سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اخلاص، بے لوثی، علمی صلاحیت، انتظامی قابلیت اور اخلاق و تواضع کی وجہ سے محبوبیت کا مقام پالیا تھا۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ ان کے اچانک وصال سے سوگوار ہے۔ ان کی مسندِ درس ماتم کنناں ہے۔ واقعی طلبہ ان کے منفرد اندازِ تدریس کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔ جب حدیث پڑھاتے تو جگہ جگہ آپ پر اس قدر سوز و گداز کی کیفیات طاری ہو جاتیں کہ طلبہ بھی اشک بار ہوئے بغیر نہ رہتے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے ٹرپ پر ٹرپ جاتے، آپ کی صعوبتوں کے ذکر پر آب دیدہ ہو جاتے۔ طلبہ کو اکثر عمل پر ابھارتے اور اصلاحِ نفس کی طرف متوجہ فرماتے۔

اُن کی تقاریر و خطبات میں بھی یہی رنگ نمایاں تھا۔ جمعے کے دن صالح مسجد میں ان کا خطاب سننے لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے۔ راقم بھی کبھی کبھار حاضر ہوتا اور علم کے اس بحرِ خار سے کچھ قطرے چننے میں کامیاب ہو جاتا۔ ان کی تلاوت کا ایک الگ انداز تھا، لہجے سے اندازہ ہوتا کہ قاری معانی کی گہرائی میں غرق ہے۔

اللہ سے ڈر رہا ہے (مشکوٰۃ، کتاب فضائل القرآن) حضرت کی تلاوت سے بالکل یہی تاثر مرتب ہوتا تھا اور بسا اوقات سننے والوں پر بھی خشیت طاری ہو جاتی تھی۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ جیسی عظیم درس گاہ کی نظامت تعلیم کی بھاری ذمہ داریاں انہیں سر نہیں اٹھانے دیتی تھیں مگر اس کے باوجود عوام خصوصاً عصری تعلیمی اداروں کے بچوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف متفکر رہتے بلکہ عملی طور پر بھی بہت کچھ کرتے تھے۔ ان کے لیے موسم گرما کی تعطیلات کا ایک بہت معیاری نصاب مرتب کر کے طبع کروایا جسے آج کئی ہی مساجد و مدارس میں پڑھایا جا رہا ہے۔ نوجوان طبقے اور عصری تعلیمی اداروں کے طلبہ کو اس طرح دینی ماحول سے مانوس کرنے اور ضروری دینی تعلیم سے آشنا کرنے کا سلسلہ مولانا کی خیرات میں ایک بہت بڑا اضافہ اور قابل رشک صدقہ جاریہ ہے۔

بہر کیف دعا ہے کہ حضرت کی وفات پر ہونے والے صدمے سے ہمارے دل و دماغ پر جو زخم لگا ہے، اللہ تعالیٰ اسے صبر اور رضا بالقضا کے ساتھ مندل فرمادے اور ہمیں ایسے بندوں کے نقش قدم پر چل کر اپنی زندگی کے ہر لمحے کو قیمتی بنانے کی ہمت و توفیق عطا کرے، آمین۔



آہ استاد گرامی!

مولانا سید عدنان کا کاخیل

استاذ جامعۃ الرشید، کراچی



استاذ گرامی قدر حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب کی اچانک اور اندوہناک رحلت نے نہ صرف پورے ملک کا ماحول سوگوار کر دیا بلکہ بیرون ملک جہاں جہاں بنوری فضلا موجود ہیں، وہاں بھی اس غم کو یوں محسوس کیا گیا جیسے ایک ہی خاندان کا حادثہ ہو۔ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے عظیم بانی کے اخلاص کا ثمر ہے یا خدا جانے کیا بات ہے کہ جامعہ کے حادثے کو ہمیشہ پورے ملک کا سانحہ سمجھا گیا اور جامعہ کو پیش آنے والی آزمائشوں پر پورے عالم میں پھیلے ہوئے اس کے ہزاروں فرزند اور ان کے متعلقین اپنے آپ کو یوں ہی تعزیت و پُر سے کام مستحق سمجھتے ہیں جیسا کہ اہل بیت.....

حضرت مولانا عطاء الرحمن رحمہ اللہ کے سانحہ ارتحال پر بھی یہی مناظر تھے۔ ہر شاگرد یوں غم سے نڈھال اور دل گرفتہ تھا کہ امتیاز دشوار تھا کہ یہ حقیقی بھائی ہے، بیٹا ہے یا شاگرد ہے۔ آج مولانا پر لکھا جا رہا ہے اور کافی دنوں تک لکھا جاتا رہے گا۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی، مگر مجھے تو مولانا کی تین خصوصیات ہمیشہ امتیازی محسوس ہوئیں اور ان خصوصیات میں مولانا کو ان کے اقران و معاصرین بڑا ممتاز پایا۔ پہلی خصوصیت تو اکابر کے مسلک و مشرب سے ان کی والہانہ و عاشقانہ اور عالمانہ و عارفانہ وابستگی تھی۔ سبق کے دوران جب کبھی اس طرف بات نکل جاتی، بس پھر مولانا کی ورافنگی قابل دید ہوتی۔ آج بھی کانوں میں مسلم شریف کے سبق کے دوران حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ایک قیل و قال کرنے والی خاتون کو تنبیہی کلمات ”أحور وریۃ انت؟؟“ مولانا کے مخصوص لہجے میں گونج رہے ہیں۔ بار بار یہ جملہ ارشاد فرماتے: ”أحور وریۃ انت؟؟“..... ”أحور وریۃ انت؟؟“ اور پھر دین میں خود رائی و خود نمائی اور اکابر کی تنقیص و تحقیق پر اس موثر و دلنشین انداز میں تنبیہ فرماتے کہ طلبہ ساکت و جامد رہ جاتے۔ آج تک کبھی یاد نہیں کہ مولانا نے کسی قول، کسی تشریح، کسی تعبیر، کسی توجیہ کو اپنی جانب منسوب کیا ہو۔ ہمیشہ اپنے اساتذہ یا ان کے اساتذہ یا اکابر کے حوالے دیا کرتے اور چونکہ حافظہ غضب کا تھا، اس لیے روایت کے الفاظ خوب یاد سے دہرایا کرتے۔ اپنے اساتذہ خصوصاً مفتی اعظم پاکستان مفتی ولی حسن خان ٹوکی، مولانا محمد ادریس میرٹھی، شہید مظلوم مولانا محمد امین اور کزنٹی، مفتی احمد الرحمن صاحب اور مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید کا تذکرہ کرتے ہوئے ان پر ایک عجیب سرشاری کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی اور ان کے قصے بہت جھوم جھوم کر مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ اس ذوق سلیم نے مولانا کے شاگردوں اور وابستگان کو کتنے فتنوں سے محفوظ رکھا اور اکابر حقہ سے کس لازوال وابستگی نصیب فرمائی؟ اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا کی دوسری خصوصیت ان کی حد درجہ خود داری، استغناء اور عالمانہ وقار کے تحفظ کا احساس تھا۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی سے وہ کوئی ایسا بے ادبی، بے توقیری یا بد لحاظی کا لفظ سن لیتے تو معاملہ ان کی برداشت سے باہر ہو جاتا۔ اس لیے مولانا کے مزاج آشنائے کی مجلس میں حد درجہ محتاط رہتے تھے کہ اگر کوئی تعبیر غلط ہوگئی یا موجودہ یا گزرے ہوئے بزرگوں کے متعلق کوئی ہلکی بات منہ سے نکل گئی تو مولانا فوراً، تنبیہ کریں گے۔ خوشامد و تملق کا لفظ ان کی لغت میں ناپید اور بلا ضرورت مدح سرائی ان کے تصور سے دور تھی۔ اہل علم کے آگے تو عقیدت سے بچ جاتے، مگر اہل دنیا کے آگے وقار و تمکنت کے کوہ گراں محسوس ہوتے۔ مولانا کی تیسری خصوصیت مالی معاملات میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط اور حتی الوسع دوسروں کے اموال کی ذمہ داری اٹھانے سے گریز کی عادت تھی۔ ان کی مسجد ”جامع مسجد صالح“..... کراچی صدر کی مرکزی مسجد اور خوشحال تاجروں کی آماجگاہ تھی۔ مولانا کو لوگ مختلف مقاصد کے لیے بڑی بڑی رقوم پیش کرتے، مگر ہمیشہ دیکھا کہ مولانا اس رقم کو ہاتھ لگانے سے بھی گریز کرتے۔ کبھی اپنے خادم خاص و رفیق مزار مولانا عرفان مرحوم کو یا کسی دوسرے کو کہتے: ”بھئی ایہ لے جاؤ اور مولانا امداد اللہ صاحب کے حوالے کر دیا جامعہ میں جمع کر دیا فلاں کے حوالے کر آؤ۔ حتی الامکان اپنے پاس رہنے یا جمع ہونے نہیں

دیتے تھے۔ اس حوالے سے مولانا کی حساسیت بہت بڑھی ہوئی تھی اور اس اچانک رحلت پر بھی ان شاء اللہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کا ذمہ امانتوں کے حساب کتاب سے مکمل آزاد ہوگا۔ یہ صفت آج کل کتنی غنقا ہے، اہل علم کو خوب اندازہ ہے۔

مولانا کو جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے عجیب عاشقانہ تعلق تھا۔ سبق کے دروان جامعہ سے اپنے تعلق کی نسبت پر کلمات تشکر ادا کرتے کرتے نہ تھکتے تھے۔ آج بھی یاد آتا ہے کہ جب وہ دارالحدیث میں پہلی دفعہ مسلم شریف کا سبق پڑھانے تشریف لائے تو مسند حدیث پر تشریف رکھتے ہی اتنا پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ ساری جماعت آبدیدہ ہو گئی۔ پھر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی اس فقید المثال عظیم الشان مسند حدیث کے گزشتہ مسند نشینوں کو یاد کر کے روئے اور اپنی بے بضاعتی و کم علمی کا بڑی بے بسی سے اظہار کیا۔ اپنی تدریس کے پہلے دن کو یاد کیا اور درس حدیث تک پہنچنے کی سعادت پر سراپا شکرو نیاز عجیب گفتگو فرمائی۔ ان کی رگ رگ میں جامعہ بنوری ٹاؤن کا مشرب (جو جمہور اہل حق کے مسلک و مشرب سے ہٹ کر کوئی الگ چیز نہیں ہے) سرایت کر گیا تھا اور اس سے ہٹ کر کوئی بات برداشت کرنا ان کے بس سے باہر ہو چلا تھا۔

اس عاجز کو ان سے تلمذ اور آبائی علاقے کی نسبت کے علاوہ اور حیثیتوں سے خصوصی تعلق تھا۔ ایک حضرت والد محترم کے ساتھ ان کا تعلق جو میرے تلمذ سے بہت پہلے کا قصہ تھا اور دوسرا میرے مربی و محسن و میرے آقا و مولیٰ استاذ العلماء، رئیس الحمد ثین حضرت مولانا محمد امین اور کرنی شہید کے دربار عالیہ کے واسطے سے کہ مولانا ان کے تلمیذ رشید تھے اور یہ عاجزان کا غلام۔ جامعہ میں تعلیم کے آخری سالوں میں دونوں کے سلام و پیغام ایک دوسرے کو پہنچایا کرتا تھا اور مولانا اس تعلق کے ناتے سے بھی خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات بلند فرمائے اور استاذ مکرم مولانا مدام اللہ صاحب، مولانا انعام اللہ، برادر م مولانا حفظ الرحمن، برادر م مولانا مسیح الرحمن و دیگر برادران کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ان کے سن رسیدہ والدین کو بھی صبر کے عوض میں شایان شان اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین بجاہ سید المرسلین۔

(ضرب مؤمن، ۱۰ تا ۱۱ مئی ۲۰۱۲ء) ❀

تیاری

مولانا طلحہ السیف

کالم نگار وفت روزہ القلم



اُف کتنا المناک حادثہ ہوا! کتنے انسان پلک جھپکتے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے! آہ موت! کوئی فرق نہ کرنے والی! ہر شے کو مٹا دینے والی! اور نہیں جانتا کوئی ذی روح کہ کس زمین پر مرے گا (القرآن)! کوئی کہیں کا رہنے والا اور کوئی کہیں کا! زبانیں بھی الگ الگ اور قومیتیں بھی! اکثر کیلئے اسلام آباد منزل نہیں راستہ تھا! مگر وہ موت کے اس ڈبے سے باہر نہ نکل سکے جس کا ٹکٹ خود انہوں نے اپنا مال خرچ کر کے خریدا تھا! جی ہاں! موت کی حقیقت بھوجا ایرلائن کیاس طیارے سے خود آشکار ہے اگر کوئی سمجھے اور اس کیلئے تیاری کر کے رکھے! عمر کے قیمتی حصوں میں تو بہ اور اچھے اعمال کو اگلے حصے پر ٹال رکھنے والے بھی اور عمر کے آخری حصے کو غفلت اور حرص میں گزارنے والے بھی! دنیا کی ہر خواہش پر گرنے والے بھی اور دنیا کے پیچھے بھاگنے والے بھی! کہ! موت عمر کے ہر لمحے میں ہر جگہ، ہیر مکان میں، ہر وقت انسان کے تعاقب میں ہے! ادھر حکم ملا اور ادھر اچک لے جائے گی! اور ایک لمحہ مہلت بھی نہ دے گی! آگے کیا کام آنے والا ہے؟! نہ قومی شناخت اور اور نہ مال و دولت! نہ منصب اور نہ حسن! صرف اعمال! صرف اعمال! حضور اکرم ﷺ کے فرمان کا مفہوم ہے: اعمال میں سبقت کرلو سات چیزوں سے پہلے۔ اور ان میں سے ایک مہلت نہ دینے والی موت ہے۔ حادثے میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہونے والے حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے چند گھنٹے قبل جمعہ کی نماز پڑھائی اور خطبے میں فرمایا: نوجوانوں! توبہ قبول کرلو۔ موت کا کوئی پتہ نہیں۔ دنیا میں آنے کی ترتیب ہے جانے کی نہیں۔ دادا پہلے آتا ہے پوتا بعد میں، مگر جانے کا علم نہیں دادا پہلے جائے یا پوتا... اور خود بھی طویل عرصے کی دینی خدمات، ہزاروں تلامذہ اور متعلقین کو رنجیدہ چھوڑ کر اس ترتیب کے برعکس چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو بڑھادے اور سینات مٹا دے اور بلند درجات عطاء فرمادے آمین۔

مؤمن کو پہنچنے والی ہر تکلیف اس کے گناہوں کا کفارہ اور نیکیوں میں اضافے کا ذریعہ ہے۔ جتنے اہل ایمان اس تکلیف دہ گھڑی سے گزرے اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمادے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطاء فرمادے۔ اور ہم سب سبق حاصل کر لیں! موت کی تیاری کر لیں! توبہ کر لیں اور اپنے رب کو راضی کر لیں! ہمیں علم نہیں کہ ہماری موت کس وقت، کس جگہ اور کس حال میں لکھ دی گئی ہے! اور جب وہ آجائے گی تو کوئی ذی نفس نہ ایک گھڑی آگے کر پائے گا اور نہ پیچھے! طیارہ ٹھیک تھا یا خراب؟! موسم کیسا تھا؟! پائلٹ کی غلطی تھی یا کنٹرول ٹاور کی؟ حکومت کی غلطی تھی یا CAA کی؟ خبروں کی اس بحث میں حادثے کا اصل سبق نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان اللہ ما اعطی ولہ ما اخذ و کل شئی عنہ باجل مسمیٰ

اللهم اغفر لهم وارحمهم وعافهم واکرم نزلهم ووسع مدخلهم واغسلهم بالماء والثلج والبرد ونقهم من الذنوب

والخطایا کما ینقئ الثوب الابيض من الدنس۔ آمین۔
(فت روزہ القلم، ۲۷ اپریل ۲۰۱۲ء) ❀

طیارہ حادثہ اور اہل علم کی رحلت

مولانا عبدالقدوس محمدی

ترجمان وفاق المدارس

ہم ابھی اسلام آباد کے مسخوڑکن موسم بہار کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ رنگ برنگے پھول، سرسبز و شادابی، خوش گوار موسم اور نظروں سے گزرنے والے مناظر کے ساتھ ساتھ دینی، علمی اور روحانی بہاروں نے ایک سماں باندھ رکھا تھا کہ اچانک بھوجا اتر لائن کے طیارے کے حادثے کی خبر ملی۔ دل اداس ہو گیا۔ فوراً امداد ڈسٹ کے امدادی قافلے کے ساتھ جائے حادثہ کی طرف روانہ ہوئے۔ واہموں کا ہجوم ہو گیا، فکر مندی اور پریشانی کے سائے پھیلتے چلے گئے اور پھر موبائل فون پر برقی پیغامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن کی شہادت کی اطلاع ملی، پھر اوپر تلے دل دہلا دینے والی اطلاعات..... وفاق المدارس العربیہ کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری سے، کراچی میں جامعہ بنوریہ کے مولانا مفتی محمد نعیم سے، اسلام آباد میں مولانا عبدالغفور سے، روزنامہ اسلام کراچی کے بردارم عنایت الرحمن شمس اور اسلام آباد کے حفیظ اللہ عثمانی سے راستے میں مسلسل رابطہ رہا، ایک دوسرے سے تعزیت کرتے، احوال معلوم کرتے رہے۔ ہر کوئی سوگ وار، ہر کوئی اداس۔ جائے حادثہ پر پہنچے تو وہاں کا ماحول مزید سوگوار تھا۔ کچھ دوست پولیس اور فوج کے آنے اور رش بڑھنے سے پہلے اصل جائے وقوع تک پہنچ چکے تھے لیکن جب رش بہت بڑھ گیا اور امدادی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی تو فوج اور پولیس نے راستے بند کر دیے اور عین جائے حادثہ پر جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ اپنے رشتہ داروں کی تلاش میں دیوانہ وار پریشان اور سرگرداں لواحقین کو دیکھ کر یکجہ منہ کو آنے لگتا اور ان کی حالت دیکھ کر پریشانی دوچند ہوئے جاتی تھی۔ اگر اپنا کوئی پیارا آخرت کے سفر پر روانہ بھی ہو جائے اس کی میت سامنے پڑی ہو، یہ یقین ہو کہ ہمارا یہ عزیز اللہ کو پیارا ہو چکا تو پھر بھی کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔ انسان رو دھو کر چپ ہو جاتا ہے لیکن اگر خدا نخواستہ ایسی کیفیت ہو کہ اپنے پیاروں کی موت و حیات کی ہی خبر نہ ہو، متنبہی ملنے اور چہرے دیکھنے کے امکان کا سورج بھی ڈوبتا دکھائی دے تو انسان کس کرب سے دوچار ہوتا ہے اس کا اندازہ اس حادثے میں جاں بحق ہونے والے لوگوں کے غم سے نڈھال لواحقین کی بے تابی، اضطراب اور بے بسی دیکھ کر ہوا۔ ہم جائے حادثہ کے قریب موجود تھے، آنکھوں میں اداسی کے ڈیرے تھے، بکھرے لاشے، کٹے پھٹے اعضاء، طیارے کے ٹکڑے، مسافروں کا ساز و سامان۔ لوگوں نے ایئر پورٹ پر کچھ دیر پہلے اپنے عزیزوں کے انتظار میں جو دیکھتے چہرے اور بے تاب آنکھیں دیکھی تھیں، اب جب انہیں جائے حادثہ پر روتے پٹیتے دیکھا تو ان پر کیا گزری ہوگی وہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

وہ شب اسلام آباد کے باسیوں کے لیے بہت سوگ وار، المناک اور پریشان کن شب تھی۔ جائے حادثہ اور ہسپتالوں کے درمیان بھاگتے دوڑتے، اپنی جانیں ہار جانے والوں کے ورثاء سے تعزیت کرتے اور ان کو تسلی دیتے ہوئے اور حادثے کی جزئیات و تفصیلات کریدتے ہوئے بیت گئی اور رہ گئے وہ لوگ جنہیں اپنے پیاروں کی شناخت کے کٹھن مرحلے سے گزرنا پڑا اس کا تصور ہی رو نگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی ہے۔ خدا خدا کر کے رات بیتی اور اگلادن پھر جنازوں کو کندھے دیتے گزر گیا۔ مولانا عطاء الرحمن کی نماز جنازہ مولانا مفتی ابراہیم مسجد فاروق اعظم میں ادا کی جانی تھی۔ ایک ایسی عظیم علمی شخصیت جن کے جانے سے پیدا ہونے والا خلا شاید کبھی پر نہ ہو سکے۔ ان کی زندگی پر بردارم مولانا شفیق چترالی نے جو کچھ لکھ دیا شاید اس پر کوئی اضافہ ممکن نہ ہو۔ مولانا عطاء الرحمن کا نام تو بہت سنا تھا، ان کے کام کی تفصیل بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی لیکن انہیں بہت قریب سے لیبیا کے ایک سفر کے دوران دیکھنے کا موقع ملا۔ سفر میں ہی کسی کی شخصیت اور عظمت کھل کر سامنے آتی ہے یا پھر اس کی حقیقت اور اصلیت بے نقاب ہوتی ہے۔ لیبیا کے اس سفر میں مولانا عطاء الرحمن کی سنجیدہ مگر دل کش شخصیت دھیرے دھیرے دل میں اترتی چلی گئی۔ طرابلس اور بن غازی کے وہ مناظر، وہ مجالس، وہ محافل اور مولانا کی مسکراہٹیں اور عظمتیں کبھی فراموش نہ کی جاسکیں گی۔

مسجد فاروق اعظم کے باہر اتنی بڑی تعداد میں اہل علم و عمل کا ہجوم اور ان میں بڑی تعداد ان جوان سال علماء و فضلاء کی جنہوں نے جامعہ بنوری ٹاؤن سے کسب فیض کیا۔ انہیں دیکھ کر مولانا عطاء الرحمن کی موت پر بھی رشک آنے لگا۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن عجیب دینی درس گاہ ہے، جس کا فیض بھی بہت عام اور جس کے ابناء کی قربانیوں اور دکھوں کی ایک طویل داستان ہے۔ جنازے میں یوں تو بہت سے چہرے دیکھ کر مولانا عطاء الرحمن یاد آئے لیکن مولانا امداد اللہ اور مولانا انعام اللہ کے دکھی چہروں کو دیکھ کر زندہ و تابندہ مولانا عطاء الرحمن بھی نگاہوں کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ گزشتہ دنوں مولانا ولی خان المظفر نے اپنے ایک مضمون میں ”امداد و عطاء“ کا جو ذمہ معنی عنوان باندھا تھا ان دونوں نام و رملے کرام کی طویل باہمی رفاقت کی اس سے اچھی اور کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟ دن کو مولانا عطاء الرحمن کی نماز جنازہ ادا کرنے جانا ہوا تو غم و درد سوا ہو گیا۔ جید عالم دین، ہنستا مسکراتا چہرہ۔

یہ حادثہ پاکستان کی تاریخ کا ایک افسوس ناک اور الم ناک حادثہ ہے، جس کا دکھ اور غم مدتوں رہے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا عطاء الرحمنؒ، مولانا عرفان مبینؒ اور دیگر اہل علم سمیت اس جہاز کے تمام مسافروں کو غریق رحمت فرمائیں اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائیں، آمین۔ (روزنامہ اسلام ۱۲ اپریل ۲۰۱۲ء)

اے موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

مولانا مفتی عبدالمنعم فائز

کالم نگار روزنامہ اسلام وفت روزہ ضرب مؤمن

مفتی نظام الدین شامزئی رحمہ اللہ کی بھی نرالی شان تھی۔ گھر سے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن تشریف لاتے تو سیدہ دورہ حدیث شریف کی درس گاہ میں چلے جاتے۔ سبق ختم ہوتا تو تخصص فی الفقہ کی درس گاہ میں تشریف فرما ہوتے۔ ان کے درس گاہ آتے ہی ملاقاتیوں کا تانتا بندھ جاتا۔ وزیر ہوں یا تاجر، کسی تنظیم کے سربراہ ہوں یا ترجمان..... سب کے سب یہیں پر ملاقاتیں کرتے۔ سبق شروع ہونے سے پہلے کا وقت ملاقاتوں میں گزرتا۔ مفتی صاحب بھی ہر آنے والے مہمان کو چائے پیے بغیر نہ جانے دیتے۔ جوں ہی سبق کا وقت شروع ہوتا، سب ملاقاتی رخصت ہوتے اور پھر خرد کی گتھیاں سلجھائی جانے لگتیں۔ روزانہ کی اس محفل میں ایک شخصیت باقاعدگی سے تشریف لاتی۔ یہ تھے جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن شہید۔ ان کو دیکھتے ہی مفتی نظام الدین شامزئی کا چہرہ کھل اٹھتا۔ دوستانہ گپ شب اور چائے کا دور چل نکلتا۔

ہم کراچی میں نو وارد تھے۔ شہر اجنتی اور لوگوں کا مزاج و مذاق بھی انجانا۔ گریز پائی اور گوشہ نشینی۔ مولانا عطاء الرحمن جب تشریف لاتے تو ہمارے بالکل سامنے تشریف رکھتے۔ ایک روز انہوں نے یک لخت پوچھا: ”آپ کہاں سے آئے ہیں؟ مختصر سا تعلق کرایا مگر اس دن کے بعد سے وہ نہیں بھولے۔ ان کے انداز میں بے پناہ اپنائیت تھی۔ طلبہ کو ان سے اس قدر عقیدت تھی کہ جامعہ میں تو ان کے گرد جھگھڑا رہتا ہی تھا مگر ان کی مسجد میں بھی طلبہ پینچے ہوتے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ایک مشورے کے لیے ان کی مسجد میں عصر کے وقت حاضری ہوئی۔ نمازیوں کے رش کی وجہ سے فوری ملاقات نہ ہو سکی۔ جب تک رش چھٹا۔ آپ مسجد سے تشریف لے جا چکے تھے۔ اگلے روز جامعہ میں ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے: ”مولانا آپ میرے گھر کا دروازہ بجا دیتے۔ فون کر دیتے مجھے بہت خوشی ہوتی۔“

آپ نے اسکول اور کالجز کے طلبہ کے لیے ”تعلیم و تربیت کورس“ بھی ترتیب دیا۔ یہ کورس ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں پاکستان بھر بلکہ بیرون ملک میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ ان دونوں اسی کورس کے اگلے لیول کے لیے کتاب لکھی جا رہی تھی۔ اس کے لیے مولانا عطاء الرحمن خود بنوری ٹاؤن کے دارالحقیق میں تشریف رکھتے اور ہم دو چار شاگرد بھی حاضر خدمت ہوتے۔ مولانا ہر موضوع سے متعلق احادیث کا انتخاب کرتے۔ پھر حدیث کی مختصر ترین تشریح لکھتے۔ ہم جیسے طفل مکتب ان کی عمدہ عبارت پر سر دھنتے۔ اسی سال موسم گرما کی تعطیلات میں آپ نے دیگر طلبہ کے ساتھ پڑھانے کے لیے ہماری بھی ڈیوٹی لگائی۔ کورس کا آغاز ہوا تو پہلے دن خود تشریف لائے۔ آپ نے کہا میں اسکول کے ان بچوں سے بیان کروں گا۔ اسکول کے چھوٹے چھوٹے اونٹ کھٹ بچوں کو ان کے خطاب کے دوران قابو کرنے کا سوچ کر ہی ہمیں دانتوں پسینہ آ گیا مگر مولانا عطاء الرحمن نے ان شرارتی بچوں سے گفتگو شروع کی تو بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر سوالات شروع کر دیے۔ عجیب پر لطف بیان تھا۔ وہ بچوں سے سوال کرتے۔ ایک آدھ بچہ جواب دینے کی کوشش کرتا۔ اس کے بعد مولانا خود اس سوال کا جواب دیتے۔ آدھے گھنٹے کا اس بیان میں بچوں کی توجہ ایک لمحے کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں ہونے پائی۔ خود نمائی اور ذاتی تشہیر سے کوسوں دور تھے۔ تعلیم و تربیت کورس کے تنہا سب کچھ تھے۔ اس سب کے باوجود کورس کے تشہیری سلسلے میں آپ کسی بھی جگہ اپنا نام نہیں آنے دیتے۔ ان کا مزاج ہی نہیں تھا۔ تعلیم و تربیت کورس کا نصاب شروع سے آخر تک آپ ہی کا تیار کردہ تھا مگر کسی بھی جگہ اپنا نام نہیں آنے دیا، بلکہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن ہی کی طرف اپنی کوشش کو منسوب کیا۔ اخبار میں تعلیم و تربیت کورس کا تعارف چھپتا تو اپنا نام ہرگز نہیں آنے دیتے۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ جیسی عالمی درس گاہ کا نام تعلیمات ہونے کے باوجود آپ کسی بھی قسم کے تکلفات کے عادی نہیں تھے۔ جامعہ سے جب صدر جانا ہوتا تو کبھی کسی طالب علم کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ جاتے، کبھی بس پر چلے جاتے۔ یہ ایک دوبار نہیں، روزانہ کا معمول تھا۔

تخصص فی الفقہ کے بعد جب بھی ان سے فون پر رابطہ ہوتا تو گفتگو کر کے جی خوش ہو جاتا۔ ان کی دعائیں اور حوصلہ افزائی آج بھی لمحہ لمحہ ساتھ ہوتی ہے۔ ایک بار انہوں نے استفتاء دیا کہ اس کو حل کر کے لاؤ۔ جب جواب لکھ کر ان کو دکھایا تو بہت خوش ہوئے۔ شفقت اور محبت سے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اس لمس کی سرسراہٹ آج بھی جسم میں گردش کرتی ہے۔ ۲۰ اپریل کو ان کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ مدراس کے طلبہ نے موبائل پیغامات کی بھرمار کر دی۔ دھڑ دھڑ آتے پیغامات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنے دلوں کو غمگین کر گئے۔ بلاشبہ ان کی شہادت جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ملک و بیرون ملک پھیلے ان کے ہزاروں شاگرد اب ان کے تذکرے سے ہی دل بہلا سکتے ہیں۔ مفتی نظام الدین شامزئی کی شہادت کے بعد وہ طلبہ کو دلا سہ دیتے تھے، مگر ان

کے لئے ان کے لئے کس ساکنہ کا تعلق ہے؟

مولانا عطاء الرحمنؒ کی حادثاتی رحلت

مولانا مفتی ٹکیل احمد



ان کے والد صاحب چونکہ محکمہ تعلیم میں ملازم تھے، اس لیے ہونہار بیٹا جونہی سند فراغت پا کر آیا تو ڈائریکٹر آف ایجوکیشن گھر آ موجود ہوئے کہ بچے کو ابھی اٹھارویں گریڈ میں بھرتی کرتا ہوں اور ساتھ چار ہزار روپے ماہوار تنخواہ کی پیش کش کی۔ آج سے تیس سال قبل چار ہزار روپے آج کل کے اعتبار سے ایک انتہائی معقول رقم تھی اور بالی عمر میں ہی اٹھارویں گریڈ کی افسری کی پیش کش بھی بہت پرکشش تھی اور محکمہ بھی چونکہ آپ کا پسندیدہ محکمہ تھا، اس لیے چھوٹی عمر میں اٹھارویں گریڈ میں بھرتی کا مطلب یقیناً یہ تھا کہ آگے چل کر یہ ہونہار کسی بڑی پوسٹ اور وزارت کا قلمدان سنبھال سکتا ہے۔ اسی اثناء میں اس کے اپنے مادر علمی سے مع الاؤنس ۶۰۰ روپے مشاہرہ کی بھی آفر ہوئی، جو سرکاری تنخواہ سے تقریباً سات گنا کم تھی۔ اب طالب علم کے سامنے دو آپشن تھے، مگر اس کے فیصلے سے پہلے ہی دادا مرحوم نے اپنی ”بالادستی“ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ صادر فرمادیا ”ہمیں ۶۰۰ روپے منظور ہیں، ہم ۴۰۰۰ روپے کو ترجیح دیتے ہیں۔“

یہ ہونہار طالب علم عطاء الرحمن تھا، جس کو آج ہم مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ سابق ناظم تعلیمات جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی کے نام سے جانتے ہیں۔ جو اگست ۱۹۶۰ء میں مردان میں پیدا ہوئے اور درس نظامی کی تکمیل جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی سے کی۔ مولانا محمد ادریس میرٹھی، مولانا سید مصباح اللہ شاہ، مفتی ولی حسن خان ٹوکی، مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار، مولانا محمد سواتی، مولانا محمد امین اور کرنی رحیم اللہ تعالیٰ اور دیگر وقت کے نابغہ روزگار اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فراغت کے بعد اپنی مادر علمی کی ۶۰۰ روپے مشاہرہ کی پیش کش کو قبول کیا اور تادم مرگ تیس سال تک اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ آپ کے والد مشفق الرحمن صاحب محکمہ تعلیم سے منسلک تھے اور مولانا کے دادا حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے فاضل تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے تلمیذ رشید اور فیض یافتہ تھے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب کو بھی اپنے زمانہ تدریس میں اس طرح کی معقول رقم اور مراعات کی پیش کش ہوئی تو حضرت نے جواب میں صرف یہ مصرع لکھ بھیجا ع

پھر ان کے تلمیذ رشید کے فیصلہ میں بھی یہی جھلک نظر آئی۔

مولانا عطاء الرحمنؒ نے تیس سال تک جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی میں مسلسل تدریس کی۔ گزشتہ دس سال سے جامعہ کے ناظم تعلیمات تھے، آپ سے پہلے ناظم تعلیمات حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ تھے، جن کے مستقل صاحب فراش ہو جانے کے بعد آپ کو ناظم تعلیمات بنادیا گیا۔ اپنے منفرد انداز تدریس کی وجہ سے آپ طلبہ کرام کے محبوب استاذ تھے۔ گزشتہ ۱۵ سال سے درس نظامی کی مشکل کتاب شرح جامی آپ کے پاس تھی، مسلم اور بخاری ثانی بھی ایک عرصہ سے پڑھا رہے تھے۔ اسباق کی پابندی اور ناغہ نہ کرنا آپ کا خصوصی وصف تھا۔

آپ کے صرف چار بیٹے ہی ہیں، آپ نے ان کے بارے میں بھی وہی فیصلہ کیا جو آپ کے بارے میں آپ کے دادا جان نے کیا تھا۔ آپ کے دو بڑے بیٹے مولوی مسیح الرحمن اور مولوی فصیح الرحمن عالم دین ہیں۔ دوسرے بیٹے فصیح الرحمن نے گزشتہ سال وفاق المدارس کے سالانہ امتحان میں دورہ حدیث میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اب مفتی کا کورس کر رہے ہیں۔ دیگر دو بیٹے بھی زیر تعلیم ہیں۔

آپ کی چالیس سالہ چھوٹی ہمیشہ اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ اپنے خاوند کے کسی عزیز کی وفات پر کراچی گئی تھیں، اس سے پہلے حج کے لیے جب براستہ کراچی سفر کیا تو جاتے ہوئے صرف دو گھنٹہ کے لیے اپنے بھائی کے گھر رکیں۔ جبکہ اس مرتبہ یہ کراچی کا ان کا پہلا سفر تھا۔ وہ دیگر رشتہ داروں کے ہمراہ بس کے ذریعے واپسی کا فیصلہ کر چکی تھیں، مگر بھائی جان نے روک لیا کہ میرے ساتھ جہاز سے سفر کرنا، مگر کسے معلوم تھا کہ بھائی جان صرف چند گھنٹوں کی رفاقت پر راضی نہیں ہوں گے اور یہ ٹکٹ کسی لمبے سفر کا ہے اور بہن نے بھی بھائی کا ساتھ نبھا کر ثابت کر دیا کہ خون کے رشتوں میں کتنی وفا ہے۔ اللھم اغفر لھا وارحمھا۔ غم و اندوہ کے اس موقع پر ان کے تمام اعزہ و اقارب اور بالخصوص ان کے والدین، تین چھوٹے بھائی مولانا لطف الرحمن، احمد الرحمن اور مولانا حفظ الرحمن، تینوں ہمیشہ گان اور چاروں صاحبزادگان تعزیت کے مستحق ہیں۔ مولانا انعام اللہ صاحب جو جامعہ بنوری ٹاؤن کے فاضل اور جامعہ محمدیہ اسلام آباد کے استاذ حدیث اور ناظم تعلیمات ہیں، مولانا عطاء الرحمن کے ماموں زاد بھائی ہیں، اس اعتبار سے مولانا انعام اللہ بھی صدے سے دو چار ہوئے، مگر بایں ہمہ صبر و شکر کی تصویر بنے رہے، اللہ تعالیٰ مولانا کو یہ صد مسہنہ کی توفیق دے۔ اللھم اغفرہ۔ اللہ تعالیٰ اس حادثے کے جملہ مرحومین کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحومین کو اپنی جوار رحمت میں جگہ نصیب فرمائے، آمین۔



مولانا عطاء الرحمنؒ، ایک روشن ستارہ

مولانا مفتی شاہ فیصل برکی

مختص جامعہ بنوری ٹاؤن

موت ایک اہل حقیقت ہے جس سے اس دنیا میں کسی کو بھی راہ فرار حاصل نہیں، ویسے تو اس دنیا میں روزانہ ہزاروں اور لاکھوں انسان مرتے ہیں لیکن ہر کسی کے مرنے کا اندازہ اور اس کا اثر الگ الگ ہوتا ہے، بے شمار انسانوں کے مرنے کے بے شمار انداز ہوتے ہیں۔ من جملہ ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے پیچھے انمٹ یادیں چھوڑ جاتے ہیں وہ صرف اپنی نسبی پس ماندگان کو داغ فراق نہیں دیتے بلکہ ہزاروں اور لاکھوں عقیدت مندوں کو بھی یتیم کر دیتے ہیں ان کی یادیں ہی کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ موت کی چادر اوڑھنے کے باوجود وہ دلوں کی دنیا میں زندہ اور تابندہ رہتے ہیں ایسے ہی لوگوں میں ہمارے اور ہم جیسے ہزاروں کے استاذ محترم مولانا عطاء الرحمنؒ بھی تھے جن کے ساتھ آج مرحوم لکھتے ہوئے بھی قلم و قسط کو تذبذب کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک روشن ستارہ تھے جو نہ رہے۔ مولانا عطاء الرحمنؒ مرحوم عظیم اور بین الاقوامی دینی درسگاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے استاذ الحدیث اور ناظم تعلیمات تھے جو گزشتہ روز اسلام آباد میں حسین آباد کے مقام پر بھوجا ایر لائن طیارے کے حادثے میں ہم سب کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا عطاء الرحمنؒ مرحوم کی عظیم شخصیت سے پردہ چاک کرنا شاید کہ راقم کی قلم کپس میں نہ ہو کیونکہ ایسے عظیم لوگوں کو سمجھنے کے لیے اتنے ہی عظیم لوگ اور اعلیٰ عقل و دماغ درکار ہوتے ہیں تاہم ایک شاگرد اور عقیدت مند کی حیثیت سے راقم بھی یہ ایک اخلاقی فریضہ سمجھتا ہے کہ ان کی شخصیت اور عظمت کو جہاں تک میں نے دیکھا اور سمجھا ہے اس کو سپرد قسط کردوں تاکہ اور کچھ نہ سہی اپنے رنجیدہ دل کو کسی حد تک اطمینان تو دلا سکوں، ویسے تو مجمع الکملات شخصیت کے مالک تھے ان کی ذات میں اتنی ہی خوبیاں اور صفات تھیں جتنی ان کو بیان کرنے والوں کی زبانیں ہیں ہزاروں شاگردوں اور عقیدت مندوں نے انہیں ہزاروں کمالات کا ادراک کیا ہوگا علمیت اور تقویٰ، عاجزی اور خاکساری، بہترین انداز تدریس اور افہام و تفہیم کا ملکہ دانائی اور زیرکی یہ وہ اوصاف ہیں جو ان کی ذات میں سب سے زیادہ نمایاں تھے لیکن ان سب سمیت راقم کو ان کی ذات میں جن کمالات اور خوبیوں نے متاثر کیا ہوا ہے وہ یہ کہ اللہ نے ان کو بہترین انتظامی صلاحیتوں کی دولت سے نوازا تھا اور شاید یہی انتظامی صلاحیتیں ان کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کر دیتی تھیں وہ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن جیسے عظیم ادارہ کے ناظم تعلیمات تھے جہاں بارہ ہزار کے لگ بھگ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ہم نے دیکھا ہے کہ عموماً کسی بھی شعبے کے منتظمین ہوں وہ بڑے بے قرار اور بے تاب اور اضطرابی کیفیت کے شکار ہوتے ہیں لیکن مولانا مرحوم جس قدر بڑے ادارے کے تعلیمی امور کے ناظم تھے اور جس قدر خوبی سے وہ تعلیمی امور کو نبھاتے تھے اس قدر ہی وہ پرسکون اور قرار کی حالت میں بھی ہوتے تھے میں نے دو سال کا عرصہ ان کی زیر سایہ گزارا اس طویل دورانیے میں میں نے کبھی ان میں عجلت بے قراری اور پریشانی کا احسان تک نہیں کیا بلکہ سرے سے یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس پورے تعلیمی نظام کا کرتا دھرتا یہ صاحب ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی انتظامی صلاحیتوں کا کمال اور حسن تدبیر اور سلیقہ کار کا معجزہ تھا اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے ان کو قوی حافظہ، قوت یادداشت اور پھر اپنی یادداشت پر اعتماد کی جس دولت سے ان کو نوازا تھا اس میں وہ اپنی مثال آپ تھے یہ راقم الحروف کی آنکھوں کا دیدہ اور کانوں کا شنیدہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ تعلیمی سال کی ابتداء میں جہاں مدارس میں نئے داخلوں کے موقع پر ہزاروں نئے طلبہ کی آمد و رفت رہتی ہے۔ کسی موقع پر طلبہ کی حاضری لے رہے تھے کہ کسی طالب علم کا نام پکارا اور اس طالب علم کی چہرے پر جوں ہی نظر پڑی تو پوچھا کہ کیا آپ اسلام آباد کے فلانے مدرسے میں زیر تعلیم نہیں تھے؟ طالب علم نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا کہ ہاں آپ کو آج سے آٹھ سال پہلے میں نے وہاں اس وقت دیکھا تھا جب وہاں کچھ دیر کے لیے مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا اور آپ کو وہاں پر مرکزی دروازے کے سامنے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دیکھا تھا اندازہ لگائیے کہ کیا غضب کا حافظہ تھا کہ آٹھ سال پہلے سیٹکڑوں طلبہ کے درمیان ایک طالب علم کو صرف ایک نظر دیکھنا نہ کوئی علیک ہوئی نہ سلیک لیکن پھر بھی صورت کی تصویر حافظے میں من و عن موجود ہے، جامعہ کے طلبہ کے معاملے میں ان کی جلال پر عموماً، جمال کے رنگ غالب ہوتے ہی تھے لیکن اس سے بھی بڑھ کر عوام الناس کے ساتھ وہ نہایت ہی خندہ پیشانی، شفقت و محبت خلوص اور مہربانی کے ساتھ پیش آنا ان کا شیوہ تھا، اس کا اندازہ آپ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں کہ یہ آج سے کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے جب راقم الحروف جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں التخصّص فی الفقہ الاسلامی کا طالب علم تھا جمعے کا دن تھا اس دوران راقم کے پاس ایک سرسری پہچان اور تعارف والا ایک صاحب آیا اور کہا کہ ہمارے محلے کی مسجد کے معاملات کے حوالے سے مشاورت کرنے کے لیے مولانا عطاء الرحمن صاحب سے ملنا ہے آپ ان سے میری ملاقات کروادیں وہ شاید اپنے ذہن میں بڑے کروفر اور تکلفات کا نقشہ لے کر آیا تھا لیکن وہاں تو ایسا کچھ تھا ہی نہیں چنانچہ ان صاحب کو لے کر جامعہ بنوری ٹاؤن کے مغربی گیٹ سے نکل رہا تھا حضرت کی دولت کدے پر حاضری دینے کا ارادہ تھا جوں ہی ہم گیٹ سے باہر نکلے سامنے سے مولانا عطاء الرحمن رحمۃ اللہ علیہ تشریف لارہے تھے ہم آگے بڑھے مصافحہ کیا اور میں نے پوچھا کہ حضرت یہ صاحب ملنا چاہتے ہیں! کب اور کہاں حاضر ہوں! تو حضرت نے فرمایا کہ ”بھائی! میرے کیا اوقات ہیں ملنے کے؟“ فرمائیے کیا خدمت کر سکتا ہوں“ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ حضرت یہ جگہ اور وقت مناسب نہیں پھر کبھی حاضر ہوں گے لیکن حضرت نے ان دوسرے صاحب کے اوقات کا خیال فرماتے ہوئے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں آپ بے تکلف اپنا مسئلہ پیش کر سکتے ہو پھر کہا تھا کہ ان صاحب کی زبان کھل گئی ایران توران کی باتیں شروع کیں بات کا بتنگڑ بنانے لگے اور طویل لیکن بے معنی کارگزاراں بان کرنا

شروع کر دیں حتیٰ کہ کھڑے کھڑے تقریباً ایک گھنٹہ باتوں باتوں میں لے لیا جون یا جولائی کا مہینہ تھا اور دن کے بارہ بج رہے تھے چپتی ہوئی دھوپ میں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر حضرت پر جب میں نے بہتا ہوا پسینہ دیکھ لیا میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین ہی نکلنے لگی لیکن حضرت نہایت ہی پرسکون انداز میں ان کی گفتگو سنتے رہیں بالآخر جب حضرت نے میرا اضطراب محسوس کیا تو میرے ہاتھیں کندے پر دایاں ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ کوئی بات نہیں یہ عوام الناس ہمارے مخلص اور ہم ان کے خادم ہیں اور پھر اس کے بعد بھی پوری تسلی سے ان کی باتوں کو سنتے رہیں اور نہایت ہی اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ ان کو مسجد کے معاملات کے حوالے سے کئی مفید مشوروں سے نوازا اور ہمیں رخصت فرمایا صرف یہ چند نہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی حضرت میں درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں خصوصیات اور خوبیاں تھیں جو ہم جیسے ان کے روحانی پسماندگان کے لیے مشعل راہ ہیں اور وہ ہمارے لیے اک روشن ستارہ۔



حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت

جناب الحاج عبداللطیف طاہر صاحب

معاون مدبریت روزہ ختم نبوت



۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعۃ المبارک شام کے وقت بھوجا ایئر لائن کا مسافر طیارہ اسلام آباد کے قریب گر کر تباہ ہو گیا۔ اس بد قسمت طیارے میں سفر کرنے والے ۱۲ افراد میں دیگر علماء کرام کے علاوہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ناظم تعلیمات استاذ الحدیث حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ، اُن کی ہمیشہ اور معاون خاص مولانا عرفان میمن بھی سوار تھے جو اس حادثے میں شہید ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ روزنامہ امت کراچی میں اس حادثہ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

”اسلام آباد (نمائندہ خصوصی/مانیٹرنگ ڈیسک/خبر ایجنسیاں) نجی فضائی کمپنی بھوجا ایئر کی کراچی سے اسلام آباد کے لئے روانہ ہونے والی پہلی پرواز ہی دارالحکومت کے نواح میں آبادی پر گر کر تباہ ہو گئی، جس کے نتیجے میں اس میں سوار تمام ۱۲ افراد جاں بحق ہو گئے، جن میں عملے کے ۱۶ ارکان شامل ہیں۔ پرواز میں ۶ بچے، ۵ شیرخوار اور ۵۰ خواتین بھی سوار تھیں۔ وزارت دفاع نے تصدیق کی ہے کہ حادثے میں کوئی شخص زندہ نہیں بچا۔ تفصیلات کے مطابق بھوجا ایئر لائن کی کراچی سے شام ۵ بجکر ۵ منٹ پر روانہ ہونے والی پرواز پی فور ۱۲۱ اسلام آباد کے نواح میں لوئی بھیر کے قریب واقع علاقے کورال کے حسین آباد گاؤں میں گر کر تباہ ہوئی اور طیارے میں شدید آگ بھڑک اٹھی۔ پرانے بونگ ۳۷ طیارے کا ایئر ٹریفک کنٹرول سے رابطہ ۶ بجکر ۳۹ منٹ پر منقطع ہوا اور سول ایوی ایشن ترجمان کے مطابق اس کے ۷ منٹ بعد ہی جہاز کریش کر گیا، جس سے مجموعی طور پر ۴۰ سے زائد گھروں کو بھی نقصان پہنچا اور ان میں طیارے کا ملبہ اور لاشیں پھیل گئیں۔ طیارے کو کیکڑن نور اللہ آفریدی اور کوپائلٹ جاوید ملک اڑا رہے تھے اور اسے ۶ بجکر ۵۰ منٹ پر اسلام آباد کے بے نظیر انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر لینڈ کرنا تھا، جس وقت طیارہ گرا، علاقے میں موسم انتہائی خراب تھا اور شدید بارش کے ساتھ آندھی چل رہی تھی۔ سول ایوی ایشن حکام اور بعض عینی شاہدین نے بتایا کہ جب طیارہ لینڈنگ کے لئے فضا میں کم بلندی پر آ رہا تھا تو اس میں اچانک آگ بھڑک اٹھی، جس کے بعد دھماکے سے پھٹ گیا اور اس کا ملبہ ۵ سے ۷ کلومیٹر علاقے میں بکھر گیا۔ جائے حادثہ کے آس پاس کے کھیتوں، مکانات اور سڑکوں پر انسانی اعضا اور سامان پھیلا ہوا تھا۔ بعض عینی شاہدین نے بتایا کہ طیارہ اچانک زمین کی طرف آیا اور گرتے ہی اس میں آگ لگ گئی، جس جگہ طیارہ گرا وہ رہائشی علاقے کا میدانی حصہ بتایا جاتا ہے۔ شہری ہوا بازی کے ادارے نے فوری طور پر حادثے کی وجہ خراب موسم کو قرار دیا۔ واقعہ کی اطلاع ملتے ہی پاک فوج کے دستے اور دیگر امدادی ادارے فوری طور پر متاثرہ علاقے میں پہنچ گئے، جائے وقوعہ سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق حادثے کے کئی گھنٹے بعد بھی لاشیں اٹھانے کا کام شروع نہ ہو سکا، تاہم ۹ بجے کے لگ بھگ امدادی کارکنوں نے لاشیں اور جسمانی اعضاء سفید چادروں میں جمع کرنا شروع کر دیئے تھے، جنہیں پولیو کی شکل میں اسپتال منتقل کیا گیا۔ اندھیرے، بارش اور کچھڑکی وجہ سے امدادی کاموں میں دشواری کا سامنا رہا۔ اس سے پہلے اسلام آباد اور راولپنڈی کے تمام اسپتالوں میں ایمر جنسی نافذ کر دی گئی تھی۔ قریبی دیہات کے رہائشیوں نے بھی امدادی کاموں میں حصہ لیا اور انسانی اعضاء و سامان اکٹھا کرنے میں سیکورٹی اہل کاروں اور ریسکیو عملے کی مدد کی، طیارہ گرنے سے جن گھروں کو شدید نقصان پہنچا فوری طور پر ان میں کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی، تاہم ہلاکتوں میں اضافے کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔ جائے حادثہ پر موجود فوج کی امدادی ٹیم کے افسر نے صحافیوں سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ امدادی آپریشن میں فوج کے علاوہ ریسکیو ۱۱۲۲، ریجنل پولیس، سول انتظامیہ کے اہلکار حصہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اب تک ۱۱۰ افراد کے اعضاء جمع کر لئے گئے، ریسکیو ون ون ٹو ٹو کے ایک اہلکار نے بتایا کہ صرف ۱۲ لاشیں سلامت حالت میں ملیں اور باقیوں کے اعضاء اکٹھے کئے۔ رات گئے تک جائے حادثہ پر امدادی کام مکمل کر لیا گیا تھا....“ (روزنامہ امت کراچی، ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء)

حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ ۶ اگست ۱۹۶۰ء کو مردان کے علاقے بابوزئی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم شیرگڑھ میں حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد ملک کی ممتاز دینی درس گاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا اور ۱۹۸۳ء میں دورہ حدیث پڑھ کر فراغت پائی۔ ۱۹۸۵ء میں تخصص فی الفقہ کے بعد اپنی اس مادر علمی میں تدریسی خدمات انجام دینا شروع کیں۔ آپ کا شمار جامعہ کے قابل اور ذہین ترین فضلا میں ہوتا تھا۔ گزشتہ دس سال سے آپ جامعہ کے ناظم تعلیمات تھے۔ حدیث، فقہ، صرف و نحو اور عربی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر بھی کامل دسترس رکھتے

تھے۔ ہزاروں عربی اور اردو اشعار آپ کے نوکِ زباں رہتے تھے۔ جن کا استعمال بروقت کرتے تھے۔ اپنے مخصوص تذریسی انداز کے باعث شاگردوں میں بے حد مقبول تھے۔ ایک عرصہ سے صحیح مسلم شریف زیرِ درس تھی۔ مسلم شریف کے درس کے دوران عبارت خوانی کا ان کا مخصوص ترنم اور پرجوش لہجہ امتیازی شان رکھتا تھا جسے طلباء بہت پسند کرتے تھے۔ آپ عشقِ رسول کے جذبے سے سرشار تھے۔ مسلم شریف میں مروی طویل قصیدہ حسان بن ثابتؓ کی عبارت خوانی کے دوران سینکڑوں طلباء کے اجتماع پر عجیب روحانی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔

مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ جہانگیر پارک صدر کراچی کی جامع مسجد صالح کے امام و خطیب اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نصابی کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ انہوں نے عصری تعلیمی اداروں کے طلباء کی تعلیم و تربیت کے لئے ۴۰ روزہ کورس کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا، جس کے نگران آپ کے چہیتے شاگرد مولانا عبدالغفار تھے۔ اس مقبول عام سلسلہ سے سینکڑوں طلباء نے استفادہ کیا اور عالمی سطح پر اس کورس کو سراہا گیا، مولانا شہیدؒ نے دنیا بھر کے مختلف ممالک کے کئی اسفار کئے۔ حج و عمرہ کی بھی بارہا سعادت حاصل ہوئی۔ بیرونی دنیا میں آپ کے ہزاروں شاگرد اور لاکھوں عقیدت مند موجود ہیں۔

حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کے طیارہ حادثہ میں شہادت کی اطلاع ملتے ہی درجنوں علماء کرام، سینکڑوں طلباء اور ان کے عقیدت مند جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن پہنچ گئے۔ بنوری ٹاؤن میں سوگ کا عالم تھا، جامعہ کے طلباء اپنے استاذِ محترم کی جدائی پر زار و قطار رو رہے تھے۔ دارالحدیث میں جامعہ کے مہتمم و شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہ، مولانا امداد اللہ کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ اور طلباء بڑی تعداد میں جمع تھے۔ جمعیت علماء اسلام کراچی کے امیر قاری محمد عثمان، جامعہ احسن العلوم کے مہتمم مولانا محمد زرولی خان، جامعہ بنوریہ عالمیہ سائٹ کے مہتمم مفتی محمد نعیم، مولانا فضل محمد یوسف زئی، مولانا سید سلیمان بنوری، مولانا محمد انور بدخشانی، مولانا مفتی عبدالرؤف خان غزنوی، مولانا محمد زبیب منجور، مولانا پیر عزیز الرحمن رحمانی، اقرأ روضۃ الاطفال کے مولانا مفتی خالد محمود، مولانا قاری فیض اللہ چترالی، مولانا امان اللہ خالدي، مولانا حماد اللہ شاہ، مولانا عبدالحق عثمانی اور دیگر علماء کرام کی بڑی تعداد جمع ہو گئی۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان، جمعیت علماء اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمن، جامعہ بنوریہ عالمیہ سائٹ کے مہتمم مفتی محمد نعیم اور دیگر علماء و سماجی سیاسی شخصیات نے مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت کو قومی سانحہ قرار دیتے ہوئے لواحقین اور متعلقین سے اظہارِ تعزیت کیا۔

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر مرکز یہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالجبار لدھیانوی مدظلہ، نائب امیر مرکز یہ مولانا صاحبزادہ خواجہ عزیز احمد، مرکزی ناظم اعلیٰ مولانا عزیز الرحمن جالندھری، مولانا اللہ وسایا، مولانا محمد اکرم طوفانی، مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی، مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ، مولانا محمد علی صدیقی، مولانا قاضی احسان احمد، مفتی حبیب الرحمن لدھیانوی، مفتی محمد عبداللہ حسن زئی، مفتی محمد زکریا جالندھری، محمد انور رانا، محمد وسیم غزالی اور دیگر کارکنان ختم نبوت اور اراقم الحروف نے اس المناک سانحہ پر رنج و غم کا اظہار کیا۔

مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اور ان کی ہمیشہ اور مولانا عرفان مبین کی نماز جنازہ ہفتہ کو صبح اسلام آباد میں قائد جمعیت مولانا فضل الرحمنؒ نے اور شام کو مولانا امداد اللہ کے اپنے آبائی گاؤں میں قائم کردہ جامعہ خلفاء راشدین بابوزئی میں شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ نے پڑھائی، جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ کراچی سے مولانا امداد اللہ، قاری محمد عثمان، مولانا سید سلیمان بنوری، مولانا سید حماد اللہ شاہ، مفتی محمد عاصم ذکی، مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ، مفتی رفیق احمد بالا کوٹی، مفتی تقی الدین شامزی، مولانا سعید خان، مولانا عبدالغفار اور دیگر علماء کرام اہل خاندان کے ساتھ نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوئے۔

مولانا فضل الرحمنؒ نے کہا کہ طیارہ حادثے پر آج پوری قوم سو گوار ہے۔ استاذ الحدیث مولانا عطاء الرحمنؒ اور دیگر علماء کرام سمیت ۱۱۷ افراد کی قیمتی جانوں کا ضیاع قومی سانحہ ہے۔ ایسے حادثات بھلائے نہیں جاسکتے۔ انہوں نے کہا کہ متاثرہ خاندانوں کے غم میں پوری قوم شریک ہے۔ مولانا عطاء الرحمنؒ کی دینی، ملی اور قومی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے اپنی زندگی علومِ قرآن اور علومِ نبوت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

مولانا شہیدؒ نے سو گواروں میں بیوہ، چار بیٹے، ہزاروں شاگرد اور لاکھوں عقیدت مند چھوڑے ہیں۔ آپ کے معاون خاص مولانا عرفان مبین کو بھی آپ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مرحومین کی کامل مغفرت فرمائیں، ان کے درجات بلند فرمائیں، جنت الفردوس عطا فرمائیں اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔ آمین۔

مولانا عطاء الرحمنؒ، مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

جناب پروفیسر خباب احمد خان صاحب

کالم نگار روزنامہ اسلام



مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام میں انہیں امتیازی مقام حاصل تھا۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی درس گاہ میں جس شخص کو اپنے شاگرد ہونے کے باوصف تدریس کے لیے منتخب کیا ہو، اُن کی صلاحیتوں کا اندازہ اسی انتخاب سے لگایا جاسکتا ہے۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے جانشین بنے اور درس حدیث کا سلسلہ جاری رکھا۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات (بھارت) کو دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار (سندھ پاکستان) کے ارباب حل و عقد کے شدید اصرار پر خیر باد کہا اور ٹنڈوالہ یار آ کر تین سال تک بحیثیت شیخ الحدیث خدمات سرانجام دیں، پھر حجاز مقدس کا سفر اختیار کیا۔ حج سے واپسی پر مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی کی متوکلا نہ انداز میں بنیاد رکھی۔ اس سے قبل مولانا بنوریؒ نے ۱۹۳۷ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مجلس علمی کی طرف سے حجاز، مصر، یونان اور ترکی کا سفر کیا جس کے دوران بڑی بڑی علمی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں اور اُن سے استفادہ کیا۔ مؤثر عالم اسلامی قاہرہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ جیسے اداروں کی دعوت پر بارہا مصر اور سعودی عرب تشریف لے جاتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں مکہ مکرمہ کے ایک سفر کے دوران حاجی امداد اللہ مہاجر کیؒ کے خلیفہ مولانا شفیع الدین نیکوئیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت سے نوازے گئے۔ علامہ بنوریؒ عربی زبان کے صاحب طرز ادیب تھے۔ عربی میں کہی گئی ان کی نعتیں اور قصیدے مصر کے علمی جریدے ”الاسلام“ میں شائع ہوتے رہے۔ عربی کے علاوہ آپ کو اردو، فارسی اور پشتو زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان زبانوں میں بھی مشق سخن جاری رہتی۔ ۱۹۷۴ء میں تحریک ختم نبوت چلی تو اس میں آپ نے قائدانہ کردار ادا کیا اور قادیانی غیر مسلم اقلیت قرار پائے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو آپ نے وفات پائی۔ علامہ بنوریؒ کے اخلاص کو اللہ نے ایسا قبول فرمایا کہ آپ کا ادارہ دن گئی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ممالک کے ہزار ہا طلبہ آپ کے ادارے سے فیض یاب ہوئے اور آپ کے ادارے کی پھیلائی ہوئی روشنی اکناف عالم میں پھیلنے لگی، اب ”نیوٹاؤن“ کوئی نہیں کہتا بلکہ اس علاقے کو ”بنوری ٹاؤن“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

استاذ کے عادات و خصائل شاگردوں کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور قابلیت و صلاحیت بھی۔ مولانا بنوریؒ نے جس طرح اپنے استاذ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ وفا کی اور استاذ کے سایہ عاطفت میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا، وہ اتنا پر خلوص تھا کہ وہی روایت جامعہ علوم اسلامیہ ”بنوری ٹاؤن“ کا حصہ بن گئی۔ آپ کے ہونہار شاگردوں نے آپ کے ادارے سے فیض یابی کے بعد اسی ادارے میں تدریسی اور تبلیغی خدمات انجام دیں۔ نسبی شرافت کی طرح روحانی شرافت بھی منتقل ہوتی ہے، سو جامعہ کے اساتذہ میں علامہ بنوریؒ کی روحانی شرافت یوں درآئی کہ ان میں سے ہر ایک تقویٰ اور ورع سے لب ریز ہوا۔ آپ کی قابلیت و صلاحیت تلامذہ کے حصے میں اس انداز میں آئی جیسے وراثت۔ ان میں سے ہر ایک اپنے استاذ مکرم کی طرح عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ شعری ذوق میں بھی انہیں وافر حصہ ملا تھا۔ ان جبال علم میں اپنے شیخ کے اخلاص و للہیت، دیانت و امانت، ذہانت و فطانت کی جھلک دکھائی دیتی رہی۔ تصنع و تکلف، نمود و نمائش اور شوق شہرت ان کے قریب بھی نہیں پھٹکا۔ دین سے والہانہ عشق ان کا طرہ امتیاز تھا۔ دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کی سرکوبی ان کی زندگی کا مشن رہا۔ ان کی تحریریں دلائل و براہین کے ہتھیاروں سے لیس رہیں۔ کسی فتنے نے سراٹھایا تو انہوں نے اپنے شیخ کی طرح دینی حمیت کا ثبوت دیتے ہوئے دینی تحریکوں میں مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ اس ادارے سے وابستہ علماء اور شیوخ کی طبعی موت ہو یا شہادت! دین کی جدوجہد کرتے ہوئے آئی۔ علامہ بنوریؒ کا ضعیف العمری میں ”فتنہ قادیانیت“ کے خاتمے کے لیے تحریک ختم نبوت میں قائدانہ کردار ان کے تلامذہ کے لیے مشعل راہ بنا۔ حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ سے مولانا مفتی ولی درویشؒ تک، مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ، مولانا مفتی عبدالمسیحؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئیؒ، مولانا مفتی محمد جمیل خانؒ اور مولانا سعید احمد جلال پوریؒ سمیت علماء کی ایک ایک طویل فہرست ہے، جنہوں نے اپنے خون کی آبیاری سے نہ صرف اپنے ادارے کی بنیادوں کو مضبوط کیا، بلکہ دین اسلام کی سر بلندی میں اپنا وافر حصہ ڈالا۔

گزشتہ سال جولائی میں برادران عزیز مولانا محمد شفیع چترالی اور عنایت الرحمن سٹمشی کی دعوت پر روزنامہ اسلام کراچی کے مرکزی دفتر ناظم آباد میں جانا ہوا تو جامعہ دارالعلوم کراچی، جامعہ فاروقیہ، جامعہ الرشید اور دوسرے اداروں کے ساتھ جامعہ بنوری ٹاؤن میں بھی حاضری ہوئی، جہاں محترم و مکرم مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر زید مجاہد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس دوران مولانا عطاء الرحمنؒ پر نظر پڑی، وہ طلبہ کو پڑھا رہے تھے۔ ان کی گرج دار آواز گونج رہی تھی اور طلبہ ہمہ تن گوش تھے۔ ہم دفتر میں چائے پی رہے تھے کہ مولانا عطاء الرحمنؒ دفتر میں داخل ہوئے تو ان سے معاف کرنے کا شرف

حاصل ہوا۔ مولانا محمد شفیع نے میرا تعارف کرایا تو انہوں نے مجھ سے انتہائی بے تکلفانہ انداز میں حال احوال پوچھا۔ وہ سفید لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر کالی اور سفید داڑھی انتہائی خوبصورت لگ رہی تھی۔ ان کی وجاہت اور نفاست نے انتہائی متاثر کیا۔ ان کی گفتگو تصنع سے پاک تھی۔ بے لوثی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کے دست راست اور جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات تھے، مگر انہوں نے اپنے لب و لہجے سے آج کے ماحول کے مطابق ایسا محسوس کرانے کی کوشش نہیں کی، نہ وہ زعم برتری میں مبتلا دکھائی دیے، جس کی وجہ سے ان کی شخصیت نے اس مختصر سی ملاقات میں جو نقوش چھوڑے، اس کی وجہ سے ارادہ تھا کہ کراچی جانے کا جب بھی موقع ملا، ان سے ضرور ملوں گا کیا معلوم تھا کہ یہ خواہش حسرت بن کر میری زندگی کا حصہ بن جائے گی اور مجھے ان کے جنازے میں شریک ہونا پڑے گا۔

اسلام آباد میں ان کے جنازے میں شیوخ و علماء کی کثیر تعداد میں شرکت ان کی مقبولیت کی دلیل اور ان سے کسب فیض کرنے والوں کے چہروں سے عیاں حزن و ملال ان سے محبت کا مظہر تھی۔ مولانا محمد شفیع چترالی نے اپنے محسن و مربی کی زندگی کا جو نقشہ کھینچا اس نے میرے محسوسات کی تصدیق کر دی۔ مولانا عطاء الرحمنؒ کا تعلق بابوزئی مردان صوبہ خیبر پختونخوا سے اور ان کی مادری زبان پشتو تھی، آپ کو معقولات اور منقولات پر مکمل عبور تھا اور آپ میں سادگی تھی جو بعد میں آپ کی مقبولیت کا سبب بنی، آپ شہرت سے دور بھاگتے تھے اور اس سے طبعی کراہت رکھتے تھے، نکتہ آفرینی میں، تدریس و تقریر میں انہیں کمال حاصل تھا، آپ طلبہ کے ساتھ بس اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر جانے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے، سیدھے سادھے الفاظ میں مطلب کی بات کرنے کے وصف سے آپ مالا مال تھے، آپ کراچی صدر کی مرکزی مسجد صالح کے خطیب تھے، آپ آخری وقت تک مسند تدریس کو آراستہ کیے رہے۔ ان مشترکات نے بے اختیار مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ مولانا محمد شفیع چترالی اور راقم الحروف نے ایک دوسرے سے بھی فون پر تعزیت کر کے اپنا غم ہلکا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے تلامذہ، معاصرین، محبین اور متعلقین کو یہ جانکاہ صدمہ حوصلے سے برداشت کرنے کی توفیق عطاء فرمائے، آمین۔

مدتوں رو دیا کریں گے جام و پیمانہ ”تجھے“

دل بہت اداس ہے!

جناب محمد فاروق قریشی صاحب

مینجنگ ڈائریکٹر مفتی محمود اکیڈمی



اللہ رحم فرمائے کہ مصائب و آلام نے وطن عزیز کا رخ کیا ہوا ہے ایک سانحہ سے سنبھل نہیں پاتے کہ دوسرا رونما ہوتا ہے اور ابھی دم لینے بھی نہیں پاتے کہ تیسرا منتظر، حوادث ہیں کہ قطار اندر قطار چلے آرہے ہیں۔

بھوجا نیر لائن کا حادثہ قومی المیہ ہے لیکن ماہ رواں میں چند شخصیات کی رحلت دینی حلقوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ جمعہ ۲۰ اپریل کی شام بھوجا نیر کا طیارہ کراچی سے اسلام آباد جاتے ہوئے موسم کی خرابی کی بناء پر کریش ہو گیا جس میں ۱۲ قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں اس قومی المیہ پر ہر آنکھ اشک بار اور ہر دل دکھی ہے ہر شخص اپنی جگہ اہم اور متعلقہ خاندان ہمدردی کے مستحق ہیں اس حادثہ میں چھ علماء کرام بھی شہید ہو گئے۔ جس میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے استاذ الحدیث اور ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن صاحبؒ بھی اپنی ہمشیرہ اور شاگرد کے ہمراہ شہید ہو گئے۔ مولانا کی شہادت خاندان کے علاوہ جامعہ بنوری ٹاؤن اور تمام اہل علم کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کے بعد مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت دوسرا بڑا سانحہ ہے، جس کی تلافی مستقبل قریب میں ممکن نظر نہیں آرہی، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب، مولانا امداد اللہ اور دیگر اساطین جامعہ بنوری ٹاؤن کو صبر و ہمت سے نوازے کہ وہ اپنے حسن انتظام سے اس صدمے کو برداشت کرتے ہوئے بہتر صورت پیدا کر سکیں۔

مولانا موصوف مجموعہ محاسن تھے، تدریس میں یکتا تو حسن انتظام میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، عربی، فارسی اور اردو ادب کا اعلیٰ ذوق اور تقریر کا ملکہ حاصل تھا۔ راقم صدر میں دفتر ہونے کی بناء پر عموماً نماز جمعہ جامع مسجد صالح میں اُن کی اقتداء میں ادا کرتا خطابت میں بے مثال طرز اور قرأت میں لازوال لحن کے حامل تھے جی چاہتا کہ ”وہ کہیں اور سنا کرے کوئی“، تصنع اور بناوٹ سے بے نیاز اپنی ہی دھن میں مگن ایک ایک لمحہ کا بہترین مصرف رکھتے، وقت ضائع کرنے کے لیے اُن کے پاس کوئی دقیقہ نہ تھا، ہمشیرہ کو گھر پہنچانے کے لیے جہاز کا سفر کیا اور واپسی پر کمپنی کے لیے اپنے عزیز شاگرد کو لیا کہ صبح آکر وہی معمولات پورے کر لیں۔ مولانا کا تمام کام بہت کم عمر میں مکمل کر چکے تھے اور اُن کے حلقہٴ حوالہ حلقہٴ حوالہ سے کوئی نہیں ملے گا۔

رحمتوں کے اٹھتے سائے

جناب حسین الرحمن صاحب



دین کے اہم ستون کا گر جانا، اہم چراغ کا بجھ جانا، اس سے زیادہ افسوس ناک واقعہ علماء کرام اور صلحاء عظام سے محبت کرنے والوں کے لیے نہیں ہو سکتا، حضرتؒ وہ نادر موتی تھے جن کا مقام ارباب علم و دانش سے مخفی نہیں، ان کا شمار ماہر فنون میں ہوتا تھا انہوں نے اپنی پوری زندگی دین اسلام کے لیے وقف کر دی تھی اور مرتے دم تک اپنی زندگی دین اسلام کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی، حضرتؒ کی شہادت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، خطابت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنی فصاحت دی تھی کہ جہاں بھی ایک بار جاتے لوگ دوبارہ ملنے کا اشتیاق رکھتے تھے، اُن کی خدمات کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، اور نہ ہی ہمارے پاس ایسے الفاظ ہیں کہ جن سے حضرتؒ کی پیش کردہ خدمات کو خراج تحسین پیش کی جاسکے۔

یہ شخصیت جامعہ بنوری ٹاؤن کے استاذ الحدیث اور ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ تھے، مردان کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، ۱۹۶۰ء میں مولاناؒ کی پیدائش ہوئی اور ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کرنے کے بعد بقیہ تعلیم بنوری ٹاؤن سے حاصل کی، اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہیں پر ۱۹۸۵ء میں استاد مقرر ہوئے، مولاناؒ ایک بارعب اور باکمال شخصیت کے مالک تھے، جامعہ بنوری ٹاؤن میں حضرتؒ مسلم شریف، مشکوٰۃ اور شرح جامی وغیرہ کتب اپنے مخصوص انداز میں پڑھاتے تھے، درس و تدریس کے ساتھ ساتھ وہ صالح مسجد کے امام بھی تھے، وہ ہر فن کے ماہر تھے، مگر سادگی کی زندگی گزارتے تھے، شفیق اتنے تھے کہ درس گاہ میں طالب علموں کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھتے تھے، ان کے شاگردوں کی ان کے دنیا سے جانے کے بعد جو حالت تھی اس کو بیان کرنے سے الفاظ قاصر ہیں، جس طرف دیکھو چہرے غم کی وجہ سے مرجھائے ہوئے تھے، ان کی اس حالت کو بھی الفاظ کی صورت دینا ممکن نہیں، جامعہ کی شاخ کے ایک استاد حضرت مولانا عبدالغفار صاحب جو ان کے قریبی شاگردوں میں سے تھے، جب حادثے کا سنا تو غم کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گئے، جامعہ کے دورہ حدیث کے طلباء کرام نے ان کے شہید ہونے کے بعد انہی سے سنا ہوا ایک شعر مولانا عطاء الرحمنؒ کے نام کیا ہے جس سے ان کے دلی جذبے کا پتہ چلتا ہے۔

مجھے اپنی زندگانی میں کسی اور چیز کی تمنا نہیں یارب

میری زندگی سے جڑے، ہر شخص کا دامن خوشیوں سے بھرا ہے

مولانا عطاء الرحمن صاحبؒ بھی ان ۱۲۶ افراد میں شامل تھے جو جہاز کے گرنے کی وجہ سے شہید ہوئے ہیں، مولاناؒ تقریباً تیس سال تک جامعہ کی ذمہ داریاں سنبھالے رہے، وہ بڑے ماہر فن تھے، سبق پڑھانے کا انداز اتنا سادہ اور دل موہ لینے والا تھا کہ آسانی سے ایک عام آدمی بھی سمجھ سکے، دین کی خدمت اور سر بلندی کے لیے انہوں نے صوبہ خیبر پختونخوا کو چھوڑ کر کراچی میں سکونت اختیار کر لی تھی، اور زندگی بھر لوگوں کو کراچی سمیت پاکستان بھر میں دین اسلام کی تعلیمات سے روشناس کراتے رہے، کراچی میں کیمٹری، سلطان آباد اور دوسرے علاقوں میں انہوں نے تقریریں بھی کی ہیں جو آج تک ان علاقوں میں رہنے والوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے زبان میں اتنی مٹھاس و تاثیر رکھی تھی کہ کراچی کے ہر کونے سے عوام اور علماء کرام کی بڑی تعداد ان کی تقریر سننے کے لیے تشریف لاتی تھی، مگر افسوس کہ وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، ایک عالم کی موت سارے عالم کی موت کہلاتی ہے، حضرتؒ کے جانے کے بعد جو خلا ان کی وجہ سے پیدا ہو گیا اس کے لیے رجال کا ملنا بہت مشکل ہے، جو کام حضرتؒ اکیلے کرتے رہے اب کئی حضرات بھی ان کے امور نہیں چلا سکتے، آج حضرتؒ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کے تلامذہ جو سینکڑوں کی تعداد سے تجاوز کر چکے ہیں ان کو دیکھ کر ہم حضرتؒ کی یاد کو تازہ کر سکتے ہیں، علماء کرام کے پے در پے چلے جانے سے جو علم کے چراغ انہوں نے روشن کیے تھے وہ تو بجھ گئے لیکن جن لوگوں نے اُن کے علم کے چراغ سے روشنی لی تھی وہ باقی ہیں لیکن آج حضرتؒ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں اور ہمارے سامنے جو دین کی دشواریاں تھیں انہیں آسان کر کے گئے ہیں اور ہمیں یہ سکھا گئے ہیں کہ جہاں تک ہم نے دین کے سلسلے میں خدمت کی اس کو رکنے نہ دینا اور ہمارے بعد اس کو آگے بڑھاتے رہنا، ایک شعر حضرتؒ کے نام کرتا ہوں۔

موت اس کی جس کا زمانہ افسوس کرے یوں تو آئے ہیں دنیا میں سب ہی مرنے کے لیے



آنسو ہیں کہ آنکھ سے اب تک ٹوٹ رہے ہیں

جناب سید حسن اللہ ہماء صاحب

اقراء روضۃ الاطفال



جمعۃ المبارک کا دن..... جہاز میں سوار ہر فرد خوش باش..... ہر چہرہ روشن.. ہر آنکھ پر نور..... عزیزوں سے ملنے کی خواہش..... چاہتیں سمیٹنے کی آرزو..... سفر کا پروانہ ہاتھ میں اور سامان سفر ساتھ میں..... مگر کسے معلوم تھا یہ پروانہ موت ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ سفر آخرت کا سفر ہے۔ جہاز نے پانچ بج کر پانچ منٹ پر اپنے وقت کے مطابق پرواز کی اور ہوا کے دوش پر اپنی منزل کی طرف محو پرواز تھا لیکن کسے معلوم تھا کہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر مسافروں کے عزیزوں سے پہلے موت اُن کے استقبال کے لئے منتظر کھڑی ہے۔ اسلام آباد کا موسم فضائی سفر کے لئے خطرناک..... بادلوں کی گرج..... بجلی کی چمک..... موسلا دھار بارش..... ابھی بھوجا ایئر لائن کا بوئنگ ۷۳۷/۷۳۸ اسلام آباد کی فضاؤں میں بے نظیر انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے دس پندرہ کلومیٹر دور تھا کہ موت نے لپک کر اُسے دبوچ لیا۔ اُس کا رابطہ کنٹرول روم سے کٹ چکا تھا اور وہ قریب کے گاؤں میں گر کر تباہ ہو گیا۔ موت برحق..... موت سے کسی کو مفر نہیں..... موت کا وقت اور جگہ مقرر..... اور حادثاتی موت تو شہادت ہے۔ اس حادثے میں شہید ہونے والے ایک سوستائیکس افراد کی موت یقیناً ایک تکلیف دہ اور روح فرسا حادثہ ہے کہ اس حادثے میں معصوم بچے بھی تھے اور نوبیا ہوتا جوڑا بھی جنہیں موت نے ہم سے اس طرح چھپا لیا کہ اب انہیں دیکھنا کسی طور بھی ممکن نہیں، ہاں ان کی یادیں دل کو تڑپاتی اور باتیں آنکھوں کو رلاتی رہیں گی اور اپنے عزیزوں کے پیارے، ماں باپ کے دلارے اُنہیں تڑپتا چھوڑ کر موت کی آغوش میں سو گئے۔ جہاز کا گرنا حادثاتی امر ہے یا تخریب کاری، مختلف باتیں سننے میں آرہی ہیں۔ عینی شاہدین نے جہاز میں آگ لگتے اور اُسے زمین کی طرف آتے دیکھا ہے۔ خیال ہے کہ جہاز پر بجلی گری لیکن انٹیلی جنس اداروں کی رپورٹ کے مطابق تخریب کاری کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔

اس حادثے کا سب سے بڑا المیہ علماء کرام کی شہادت ہے، جن میں جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمنؒ، مولانا عرفانؒ اور مولانا عطاء الرحمنؒ کی ہمیشہ بھی شامل ہیں۔ مولانا عطاء الرحمنؒ کا انداز تدریس انتہائی حسین، دلکش، پُر اثر اور مترنم تھا۔ انہیں عربی کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے بھی گہرا شغف تھا۔ اُن کے ہزاروں شاگرد تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کی شہادت کی اطلاع جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ اور طلباء پر بجلی بن کر گری۔ اُن کے لئے یہ سانحہ بہت بڑا ناقابل تلافی نقصان تھا۔ اقراء روضۃ الاطفال کے مدارس اور اقراء نظام تعلیم کے تعلیمی اداروں میں بھی اُن کے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد ہے یہی وجہ تھی کہ جب میں ہفتہ کی صبح اپنے تعلیمی ادارے اقرأ حفاظ بوائز سیکنڈری اسکول ٹی بلاک ناتھ ناظم آباد پہنچا تو ادارے کے اکثر اساتذہ کی آنکھیں اشکبار اور آوازیں رندھی ہوئی تھیں۔ ہمارے اسکول میں مولانا فراز علی، مولانا وسیم احسن، مفتی رفیع احمد خان، مفتی طلحہ منیر اور شہید ختم نبوت مفتی محمد جمیل خانؒ کے صاحبزادے مفتی محمد ثانی بن جمیل خانؒ مولانا عطاء الرحمنؒ کی روحانی اولاد ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔

اس حادثے میں قیمتی جانوں کا ضیاع یقیناً قومی سانحہ ہے جو ایک طویل عرصے تک ہمیں تڑپاتا رہے گا خصوصاً علماء کا نقصان اور ان علماء کی شہادت سے پیدا ہونے والا خلا بڑی مشکل سے پُر ہوگا لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ سیاسی جماعتیں اس حادثے سے اپنی سیاسی دکانیں چکانے میں مصروف ہیں۔ ہمارے وزیر داخلہ بجائے اس کے کہ لواحقین سے تعزیت کرتے، اُن کے غم میں شریک ہوتے بلکہ وہ اپنی لن ترانی میں لگے ہیں کہ بھوجا ایئر لائن کو لائسنس نواز شریف نے دیا تھا۔

طیاروں کے حادثے اس سے پہلے بھی ہوتے رہے ہیں لیکن آج تک کسی کی تحقیق مکمل نہیں ہو سکی۔ ضیاء الحق کا طیارہ ہو کہ میر مصحف علی کے طیارے کی تباہی یا ایئر بلو کا طیارہ ہو، آج تک عوام کسی بھی تحقیق کے بارے میں قطعی نہیں جان سکے۔ اُن کے لئے بھی کمیٹیاں اور کمیشن بنے لیکن اُن کی کارروائی زبانی اور تحریری حد تک محدود رہی۔ اب اس حادثے کی تحقیق کے لئے بھی کمیشن بنایا گیا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کا شور و غوغا کب تک رہتا ہے اور کب اس کی فائل سرد خانے میں پھینک دی جاتی ہے۔ ایم کیو ایم اور ن لیگ سینٹ اور قومی اسمبلی میں کتنی ہی تحریک جمع کرادیں، ہونا وہی ہے جو حکومت چاہے گی اور موجودہ حکومت سے کسی خیر کی توقع رکھنا عبث ہے کہ حکومت اس سے بھی سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اور ہم صرف آہیں بھر کر رہ جائیں گے، ایسے ہی ستاروں کو کھوتے رہیں گے، چاندز میں میں دباتے رہیں گے اور عظیم لوگ زمین کا لقمہ بنتے رہیں گے۔

سورج، چاند، ستارے سب ہی خاک ہوئے

آنسو ہیں کہ آنکھ سے اب تک ٹوٹ رہے ہیں

جامعہ بنوری ٹاؤن کا وفادار فرزند!

جناب محمد خالد شریف صاحب



کراچی سے اڑنے والا بھوجا نیر لائن کا طیارہ تیز و تند آندھی، کڑکتی آسمانی بجلی اور موسلا دھار طوفانی بارش میں اسلام آباد کے بے نظیر انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر بخیر و عافیت لینڈ کرنے کی بجائے اپنے مسافروں کو اس جہاں میں لے گیا، جہاں سے کوئی بھی واپس نہیں آتا۔ حادثے کا شکار ہونے والے ۱۲۷ مسافر اپنے عزیز واقارب اور دوستوں کے لیے دل و جان سے پیارے تھے۔ سب ہی قابل عزت و احترام تھے۔ اس افسوس ناک حادثے کا شکار ہونے والوں میں ملک کی عظیم دینی درس گاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے وفادار اور قابل فخر فرزند مولانا عطاء الرحمنؒ بھی شامل ہیں۔ مولانا اپنی گرج دار، خوبصورت اور مترنم آواز کے ساتھ جب بنوری ٹاؤن کی بابرکت فضاؤں میں ”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ کی صدا بلند کرتے تو ایک لمحہ کے لیے ایسا معلوم ہوتا کہ شاید وہاں موجود ہر چیز اپنے اپنے انداز سے مولانا کے درس میں شرکت کی سعادت اور مولانا کے دلکش انداز تدریس سے روحانی سکون حاصل کر رہی ہے۔

مولانا شہیدؒ جامعہ بنوری ٹاؤن کے ان فرزندوں میں سے تھے جنہوں نے جامعہ بنوری ٹاؤن سے صرف فیض حاصل کرنے پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ فیض حاصل کرنے کے بعد جامعہ بنوری ٹاؤن سے وفاداری، خدمت اور اس کا حق تک بھی ادا کرتے رہے۔ بالکل اس فرمان بردار بچے کی طرح جسے والدین اپنے خون پسینے کی کمائی سے پال پوس کر اس قابل بناتے ہیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے، جب وہ بچہ اس قابل بنتا ہے تب وہ والدین کا سہارا بھی بنتا ہے، دکھ درد کا ساتھی بھی۔ ایسے والدین کی طرف گلی محلے کا کوئی غنڈہ میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ مولانا شہیدؒ بھی فراغت کے بعد جامعہ بنوری ٹاؤن سے وابستہ ہو گئے اور یہ وابستگی روایتی نہیں بلکہ والہانہ اور عاشقانہ تھی۔ جامعہ بنوری ٹاؤن اپنے مجاہدانہ کردار اور نئے اور پرانے فتنوں کی سرکوبی میں پیش پیش ہونے کی وجہ سے ہمیشہ دین دشمنوں کی نظروں میں کھلتا رہا ہے لیکن ہر دور میں اللہ پاک نے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے مختلف شخصیات کو جدوجہد کی توفیق دی۔ بلاشبہ اس دور میں مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہ اور دیگر اکابر کے ساتھ ساتھ مولانا عطاء الرحمنؒ اور مولانا امداد اللہ کو یہ سعادت حاصل رہی کہ جب بھی جامعہ بنوری ٹاؤن کی طرف کسی ”غنڈے“ نے میلی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی، یہ حضرات اپنی مادر علمی کے حفاظت کے لیے صف اول میں دکھائی دیے۔

مولانا عطاء الرحمنؒ گونا گوں صفات کے مالک تھے۔ بہترین منتظم، قابل مدرس اور ایک اچھے خطیب تھے۔ دوستی اور تعلق نبھانے والے ایسے کہ ایک بار کسی سے تعلق پیدا ہو جاتا تو تمام تکلفات، فرق مراتب، شاگردی اور استادی کے رشتے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تعلق نبھاتے۔ وہ دوستی میں تکلف کو جائز نہیں سمجھتے تھے، مولانا عرفان میمنؒ جو اس سفر میں بھی مولانا کے رفیق تھے، اس کی واضح مثال ہیں کہ وہ مولانا کے شاگرد تھے لیکن جس نے بھی دونوں کو ساتھ دیکھا یہی تبصرہ کیا کہ کیا بے تکلف دوستی ہے۔

جامعہ بنوری ٹاؤن کی مٹی بہت زرخیز ہے، اس سے اخلاص اور سچے دل سے وفا کرنے والوں سے اللہ نے ضرور دین کا کام لیا ہے اور کام بھی ایسا کہ جس کی معاشرے کو سخت ضرورت ہو، جیسے حضرت مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کے اقراء روضۃ الاطفال کے نام سے ملک بھر میں پھیلا وسیع نیٹ ورک، اس کی اہمیت و ضرورت سے ہر شخص واقف ہے، مولانا عطاء الرحمنؒ نے بھی عصری اداروں میں زیر تعلیم طلباء کے لیے سالانہ چھٹیوں میں ابتدائی دینی تربیت کے چالیس روزہ تربیتی پروگرام کی بنیاد رکھی اور اس کے لیے مختلف کتب ترتیب دیں۔ یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا اور کراچی کی طرح اب ملک بھر میں علماء اور خطباء حضرات اس قسم کے پروگرام ترتیب دیتے ہیں، جس سے نوجوان نسل کو دینی لحاظ سے فائدہ ہو رہا ہے۔ بلاشبہ اس کا رخیہ کا سہرا مولانا کے سر ہے۔ یہ صدقہ جاریہ ان شاء اللہ العزیز مولانا کی بلندی درجات کا باعث بنے گا۔ مولانا عطاء الرحمنؒ کی رخصتی سے مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر اور مولانا امداد اللہ کو بے اختیار روتا ہوا دیکھا گیا۔ جے یو آئی کے سربراہ مولانا فضل الرحمنؒ نے اس سانحے کے بعد اپنا اہم بیرونی دورہ منسوخ کر دیا، اسلام آباد میں مولانا عطاء الرحمنؒ کی نماز جنازہ کی امامت کی۔ اسی روز رات کو مولانا فضل الرحمنؒ سے ملاقات ہوئی تو ان کے چہرے پر غم و کرب کے آثار نمایاں تھے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سربراہ شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان، جامعہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ، طلبہ اور پورے ملک کے دینی حلقوں کو افسردہ دیکھا گیا اور کیوں نہ ہوتے کہ وہ اس جامعہ بنوری ٹاؤن کے مخلص اور وفادار فرزند تھے جس سے پاکستان سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

معاملات کی صفائی

حضرت مولانا امداد اللہ صاحب

استاذ حدیث جامعہ بنوری ٹاؤن



میرے مشفق و مربی، ہمدرد و غم خوار، بچپن جوانی اور کہولت کے جلیس و ہم نشین اخلاص و اخلاق کے پیکر، اخوت و محبت کے سرچشمے برادرِ م حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب شہید رحمہ اللہ کے بارے میں کیا لکھا جائے اور کیا کیا جائے سمجھ میں نہیں آ رہا اب تک اہل علم اور اصحاب قلم ان سے اپنے تعلق کا اظہار تسلسل کے ساتھ فرما رہے ہیں جن میں سے بعض اہل علم کی تحریریں یکجا بھی ہو رہی ہیں۔ میں محدود وقت اور محدود صفحات میں اخوت و محبت کے اس طویل دورانیہ سے کیا اور کیسے منتخب کروں جو ۱۹۷۷ء سے لے کر ۲۰۱۲ء تک کے طویل عرصے پر مشتمل ہے، البتہ شیخ عطاء رحمہ اللہ کی عملی زندگی کے ایک نمایاں پہلو یعنی معاملات کے حوالے سے بطور نصیحت کے عرض کروں گا کہ ہماری عملی زندگی میں مجھے آپ کے معاملات کی صفائی اور شفافیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، ہماری اس طویل تعلیمی و عملی زندگی میں میری یادداشت کے مطابق کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے ایک دوسرے سے قرض لیا ہو جب کہ اکٹھے بے شمار اسفار بھی ہوئے اس سلسلے میں مولانا مرحوم کا اصول یہ تھا کہ آپ (امداد اللہ) اپنی صواب دید پر خرچ کرتے رہیں سفر ختم ہونے سے قبل سارا خرچہ دونوں پر برابر تقسیم کر لیا جائے گا اور ایسے ہی ہوتا رہا میں اپنی ساری برادری (علماء و طلباء) سے یہ گزارش کرتے ہوئے بلکہ سب سے پہلے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ ہماری تمام تر امانت و دیانت کا مدار معاملات پر ہے اس لیے ہمیں معاملات کے بارے میں انتہائی احتیاط کا طریقہ اپنانا چاہیے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے معاملات صاف شفاف رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔



کچھ یادیں، کچھ باتیں

مولانا محمد عمران ولی

استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن



بروز جمعرات بتاریخ ۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ بمطابق ۱۹ اگست ۱۹۹۹ء صبح ۹ بجے کے لگ بھگ آج سے ۱۳ سال قبل مجو بن الفقیہ، شیخنا الکریم، استاذنا المکرم حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید نور اللہ مرقدہ نے راقم الحروف کو حضرت شہید اسلام، استاذنا المکرم فقیہ العصر شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہید رحمہ اللہ (۱۹۵۲ء-۲۰۰۴ء) کے مہمان خانہ میں بلا کر فرمایا کہ: ”آپ کے گاؤں میں کچھ مسئلہ درپیش ہوا ہے، غالباً آپ کے دادا جان کی طبیعت ناساز ہے (جو واقعی ناساز تھی) لہذا آپ یہیں (کراچی) سے وطن جائیں گے اور حضرت مفتی صاحب قندھار افغانستان سے وطن جائیں گے۔“

چونکہ حضرت والد رحمہ اللہ نے جامعہ کے ششماہی امتحانات کے اختتام پر (۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ بمطابق ۱۷ اگست ۱۹۹۹ء بعد نماز عصر بروز منگل) قندھار افغانستان کے لئے رخصت سفر باندھا اور اگلے دن بروز بدھ بخیر و عافیت پہنچ کر حضرت مفتی شامزئی شہید کے ٹیلی فون پر اطلاع بھی دی تھی، ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم پر کیا افتاد آنے والی ہے اور کیا عظیم قیامت ٹوٹنے والی ہے؟۔

حضرت مولانا عطاء الرحمن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: آپ سب گاؤں جانے کی تیاری کریں اور تقریباً ظہر پونے تین بجے کی فلائٹ ہے، چنانچہ ہم سب استاذ محترم مولانا عطاء الرحمن رحمہ اللہ کی معیت میں ”بھوجا ایئر لائن“ میں غالباً ۲ بج کر ۴۰ منٹ پر کراچی سے اسلام آباد کے لئے روانہ ہوئے۔

جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرتا چلوں کہ جہاز میں جس سیٹ پر استاذنا المکرم تشریف فرما ہوئے تو چند لمحوں بعد جہاز کے میزبانوں نے آ کر استاذ محترم سے عرض کیا کہ آپ فلاں سیٹ پر آ جائیں، آپ وہاں بیٹھنے ہی لگے کہ انہوں نے فوراً کسی دوسری سیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہاں تشریف رکھیں تو استاذ محترم ذرا سا جلال میں آ گئے، اپنے مخصوص اور رعب دار انداز میں ان کا جملہ آج بھی کانوں میں گونجتا ہے کہ: ”تم لوگوں کو یہ بھی پتا نہیں کہ دو جمع دو چار ہوتا ہے۔“ بہر حال جہاز تقریباً ۶ بجے کے قریب اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترا، وہاں مفتی ابراہیم صاحب پہلے ہی سے موجود تھے، اور انہوں نے آسمانی کلر بکار اور اورینٹل سفر لیش تجربہ کار ڈرائیور کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ استاذ محترم کی معیت میں ساڑھے ۶ بجے اسلام آباد سے گاؤں کے لئے روانہ ہوئے

اور رات تقریباً ۱۲ بجے گاؤں پہنچے، جب بٹ خیلہ شہر آبائی گاؤں کی طرف گاڑی مڑی تو بندہ نے استاذ محترم سے پوچھا کہ: استاذ جی! ہمارے والد صاحب پہنچ گئے ہوں گے؟ اس اچانک سوال پر استاذ محترم کچھ متحیر اور مضطرب ہوئے اور بڑی مشکل سے ان کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا کہ: ”شاید پہنچ گئے ہوں گے“۔ مگر جب گھر میں داخل ہوئے اور لوگوں کا ہمیں دیکھ کر زار و قطار رونادیکھا تو تب پتہ چلا کہ ہمارے سروں سے وہ عظیم سائبان ہمیشہ کے لئے اٹھ چکا ہے، اور ہمارے والد ہمیں خدا حافظ کہہ کر ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آج بھی ان کے نام کے ساتھ ”رحمہ اللہ“ اور انہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کا جگر شق ہو رہا ہے، کاش! وہ کچھ دن اور زندہ رہتے۔

ہائے اوموت! تجھے موت ہی آئی ہوتی لیکن اللہ کی رضا کے آگے کون ٹھہرا ہے اور کون ٹھہر سکتا ہے؟ یفعل ما یشاء۔

غالباً استاذ محترم کا بھوجا ایر لائن میں یہ پہلا سفر تھا اور وہ بھی غم و افسوس اور حسرتوں بھرا حادثاتی سفر، جس کی یہ بو جھل اور غمگین یادیں آج بھی دل و دماغ پر نقش کا لجر ہیں۔

جمعہ کے دن بتاریخ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء استاذنا المکرم حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ نے اپنی ہمیشہ اور مخلص، محبت، خادم خاص مولانا عرفان مین کے ساتھ ”بھوجا ایر لائن“ ہی سے کراچی سے اسلام آباد کے لئے رخت سفر باندھا اور استاذ جی کا یہ سفر غالباً بھوجا ایر لائن میں دوسرا اور آخری سفر تھا اور ”بھوجا ایر لائن“ کا یہ سفر بھی حسرتوں اور غموں بھرا ہی ثابت ہوا کہ اسلام آباد کے قریب حسین آباد کورال کے قریب بمع تمام رفقائے سفر جام شہادت نوش فرما گئے اور قیامت تک کے لئے ہم سے بچھڑ چکے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

آغا شورش کاشمیریؒ کا مشہور مقولہ ہے: ”بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اٹھ جانے سے محفلیں سونی یا ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخصیت ایسا خلاء پیدا کر دی جاتی ہے کہ پُر ہی نہیں ہوتا اور اگر پُر ہوتا ہے تو بڑی مشکل سے ہوتا ہے“۔

سب ہی جانتے ہیں کہ استاذنا المکرم حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ نور اللہ مرقدہ (جن کے نام گرامی کے ساتھ ”رحمہ اللہ“ لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ اٹھتا ہے) کے اس انحطاطی اور فکری ارتداد کے مشکل ترین اور مایوس ترین دور میں اس طرح اچانک جانے سے کیا، کیسا اور کتنا عظیم خلاء پیدا ہوا ہے، شاید مدتوں میں بھی کبھی پُر ہو سکے۔ استاذ جی ہی فرمایا کرتے تھے کہ: ”کوئی کسی کے خلاء کو پُر نہیں کر سکتا“۔ استاذنا المکرم جیسے جامع الکملات اور ربطۃ فی العلم والجسم کے صحیح مصداق کا یوں اٹھ جانا موت العالم موت العالم کی صحیح منظر کشی کرتا ہے:

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے

پیدا کیا فلک نے جنہیں خاک چھان کر

ششماہی امتحانات اور سانحات:

غالباً جامعہ علوم اسلامیہ کا یہ تیسرا عجیب و غریب ششماہی امتحان ہے کہ اس کے متصل بعد عظیم سانحہ سے گلشن بنوری دوچار ہوا، جس طرح اس سے قبل بھی ششماہی امتحان کے بعد عظیم حادثات رونما ہوئے تھے۔

۱۹۹۹ء بمطابق ۱۴۲۰ھ کے ششماہی امتحان کے متصل ہی جامعہ کے قدیم استاذ حضرت مفتی محمد ولی درویش نور اللہ مرقدہ (نگران تخصص فی الدعوة والارشاد) نے اچانک رخت سفر باندھا اور ہمیں اسی طرح حیران و پریشان چھوڑ کر داغ مفارقت دے گئے تھے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو بتاریخ سات شوال المکرم ۱۳۸۹ھ بمطابق ۱۹۶۹ء حضرت شیخ الحدیث مولانا نور الہدی صاحب مدظلہ (مہتمم مدرسہ ربانیہ قصبہ کالونی) محدث العصر حضرت اقدس علامہ بنوری رحمہ اللہ کی خدمت میں لائے تھے اور حضرت علامہ بدیع الزمان نور اللہ مرقدہ متوفی ۱۹۹۹ء سے درجہ ثانیہ کے لئے جائزہ دلوا کر داخل فرمایا تھا، اس وقت حضرت درویش کی عمر مبارک چھپیس سال تھی، حضرت بنوری علیہ الرحمۃ کی حیات ہی میں ۱۳۹۶ء بمطابق ۱۹۷۶ء کو جامعہ ہذا سے سند فراغت حاصل کی، دو سال تخصص فی الفقہ میں گزارے اور ۱۹۷۹ء سے ہی جامعہ میں تدریسی اور انتظامی امور کی خدمات سرانجام دینی شروع فرمائیں اور یہ سلسلہ تقریباً بیس سال جاری و ساری رہا، جب انتقال ہوا تو عمر مبارک چھپن برس تھی، گویا عمر کا اکثر حصہ جامعہ ہی میں گزارا۔ ۱۹ اگست ۱۹۹۹ء کو یہ عظیم سلسلہ ذہبیہ اختتام پذیر ہوا اور اس وقت جامعہ میں تعطیلات ششماہی تھیں۔

دوسرا عظیم سانحہ جو جامعہ میں ششماہی امتحان سے پہلے پیش آیا، وہ جامعہ کے سابق استاذ اور ماہنامہ بینات کے مدیر حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری شہیدؒ کی شہادت کا سانحہ تھا حضرت کو ۲۵ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ بمطابق ۱۱ مارچ ۲۰۱۰ء شب جمعہ کورات دس بجے بمع صاحبزادہ کے شہید کر دیا گیا تھا۔

تیسرا عظیم سانحہ جو جامعہ میں امتحان ششماہی کے بعد پیش آیا، وہ فاضل نوجوان، داعی مسجد کے امام و خطیب اور جامعہ کے لائق استاذ حضرت مولانا ارشاد اللہ العباسی شہید رحمہ اللہ کی شہادت کا سانحہ تھا۔

حضرت موصوف رحمہ اللہ نے ۱۹۹۰ء میں جامعہ سے فاتحہ فراغ پڑھا، داعی مسجد سولجر بازار میں امام و خطیب مقرر ہوئے، جامعہ میں بھی تدریسی خدمات پر مامور تھے، صبح کو نماز فجر سے قبل مسجد کے لئے نکلے کہ ذریت ابن سباء اور منافقین و فجار کے ہاتھوں شہادت جیسی نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہو چلے اور یوں ان کی دینی خدمات جلیلہ کا سنہرے باب جمعۃ المبارک ۲۵ جمادی الاولیٰ بمطابق ۲۹ اپریل ۲۰۱۱ء کو بند ہو چکا۔ شہادت سے دو دن قبل بروز بدھ درجہ ثالثہ کی درسگاہ میں آپ رحمہ اللہ نے یہ دو اشعار طلبہ کرام کو سنائے:

جب انہی کو جان دینی ہے تو پرواہ نہ کر

موت تجھ پہ آپڑے یا موت پہ تو جا پڑے

فنا فی اللہ کی تہہ میں بقا کا راز مضمحل ہے

جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

چوتھا عظیم حادثہ اور سانحہ جو نہایت ہی افسوسناک، اندوھناک اور دہشت ناک ثابت ہوا، جس سے دل و دماغ ہل گئے، جس کی شدت سے آج تک دماغ سُن، قلب بے چین و مضطرب ہے۔ بروز جمعۃ المبارک بتاریخ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ء بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بوقت سواسات بجے بعد از نماز مغرب یہ خبر پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں جنگل کے آگ کی طرح پھیل گئی کہ اسلام آباد کے قریب حسین آباد کورال کے علاقہ میں ”بھوجا ایئر لائن“ کو حادثہ پیش آیا اور اس میں سوار حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ بمع رفقاء سفر اور تمام مسافروں کے دنیا کی قید و نفس سے آزاد ہو کر رب رحیم و کریم کے ہاں حاضر ہو گئے، اس عظیم حادثہ سے ایک قیامت تھی کہ برپا ہو گئی، جامعہ کے دروہام سوگوار ہو گئے، اساتذہ کرام کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں ان کے قلبی حزن و ملال کی غمازی اور نشان دہی کر رہا تھا۔ طلبہ کرام اپنے محبوب و مشفق استاذ کی اس اچانک جدائی پر حیران و مبہوت تھے، خصوصاً دورہ حدیث کے طلبہ کرام کہ کل تک انہیں مسند حدیث پر بیٹھ کر جس محبوبیت و دل لگی سے ”قال اللہ و قال الرسول“ کے مبارک الفاظ اپنے مخصوص و مترنم انداز میں پڑھا رہے تھے، آج اچانک کس دور دراز سفر پر روانہ ہو گئے اور جدائی بھی ایسی کہ آخری زیارت کو بھی نگاہیں ترس گئیں۔ بقول شاعر:

وقت رخصت پہ طلب کی جو نشانی تو کہا

داغ کافی ہے جدائی کا اگر یاد رہے

مری بے تاب آنکھیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں گلشن میں

صبا تو نے کہاں لے جا کے خاکِ آشتیاں رکھ دی

تاوے نن زم سبابہ راشم

میاشتی شوے تیرے ستاسبا کلمہ رازینہ

آخری ششماہی امتحان:

جامعہ اور شاخہائے جامعہ میں بروز منگل بتاریخ ۲۰ مارچ ۲۰۱۲ء ۲۶ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ کو ششماہی امتحان کا آغاز ہوا، ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمن نور اللہ مرقدہ آخری پرچہ تک بنفس نفیس موجود رہے، کیا معلوم تھا کہ استاذ جی کی امتحان ہال میں یہ آخری موجودگی ہے اور اس کے بعد قیامت تک نگاہیں انہیں یہاں نہ دیکھ پائیں گی۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ امتحان گاہ میں متعین کئے گئے حلقات میں وقتاً فوقتاً چکر لگاتے اور وہاں موجود کسی بھی کرسی پر کچھ دیر تشریف فرما ہو کر کسی دوسرے حلقے کی طرف رواں ہو جاتے (کأنی أنظر إلیہ)

امتحان کے تیسرے دن بروز جمعرات بتاریخ ۲۸ ربیع الآخر ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۲ مارچ ۲۰۱۲ء تقریباً سو اگیارہ بجے استاذ محترم نے راقم الحروف سے فرمایا کہ یہ بیس صفحات لے لیں اور ان کی تصحیح کر کے کل مجھے واپس کر دیں، پھر اچانک فرمایا کہ کل تو جمعہ ہے، بیس صفحات اور لے لو اور چالیس صفحات ہفتہ کے دن واپس کر دیں۔

یہ صفحات ”باقۃ الازہار“ (عربی) کے تھے جو دوبارہ طباعت کے لئے تیار ہو رہی تھی اور استاذ جی کے زیر نگرانی اس کی تصحیح و ترتیب کا کام ہو رہا

تھا۔ ہفتہ کے دن بندہ نے چالیس صفحات لا کر اسی جگہ تپائیوں پر رکھ دیئے، جہاں کبار اساتذہ کرام کی مخصوص نشست ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمانے کے بعد خوشی کا اظہار فرمایا اور دعاؤں سے نوازا، جبکہ بذریعہ مولانا اشرف صاحب استاذ محترم تک یہ بات پہنچائی (کیونکہ استاذ جی کے رعب و جلال کے آگے لب کشائی کی ہمت کہاں؟) کہ اس نام سے پہلے ایک چھوٹا سا کتا بچہ چھپا ہے جو کہ حضرت بنوری علیہ الرحمۃ کی مدح میں کہے گئے اشعار پر مشتمل ہے، یہ سننا تھا کہ استاذ محترم اسی وقت امتحان ہال سے باہر صحن کی طرف ہمارے حلقہ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ: آپ اس باقۃ الازہار کی بات کر رہے ہیں جو کہ مولانا عبدالحنان دہلوی کی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: جی استاذ جی! وہی مراد ہے، تبسم فرما کر تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اچھا کیا، تم نے بتا دیا۔ صاحب کتاب کے سامنے یہ بات رکھ دیں گے (اور پھر اس پر بات ہو بھی گئی تھی) امتحان کے آخری دن حضرت مولانا نور الرحمن صاحب مدظلہ سفر عمرہ پر روانہ ہو رہے تھے اور استاذ جی رحمہ اللہ کے ساتھ امتحان ہال میں موجود تھے، استاذ جی رحمہ اللہ نے مولانا نور الرحمن سے دونوں ہاتھ کھول کر معاف فرمایا اور سینے سے لگا کر رخصت فرمایا۔ (کأنی أنظر إليهما يتكلمان ويتبسما)

عمرہ سے واپسی پر استاذ جی نے حضرت رحمہ اللہ کو اس طرح کا سفید دھاری دار رومال پیش فرمایا تھا جو ہمیشہ سے استاذ جی رحمہ اللہ اپنے کندھے پر رکھتے، کبھی بائیں بازو پر رکھ کر چلتے، اور کبھی گول کر کے مٹھی میں لے کر چلتے، تو آخری سفر میں وہی مولانا نور الرحمن مدظلہ والا رومال ساتھ لیا تھا جو اس حادثہ میں دیگر اشیاء کی طرح نہ جانے کہاں رہ گیا؟ دوران امتحان اگر سوالیہ پرچہ کے متعلق کچھ عرض کرنا ہوتا تو استاذ محترم ہی اپنی مخصوص صاف شفاف آواز میں لاؤڈ اسپیکر پر طلبہ کرام سے بیان فرماتے۔ افسوس! کہ اس پیاری آواز کے لئے کان ترس جائیں گے۔

آخری اعلان نتائج ششماہی اور اساتذہ کرام کو مختصر نصائح:

بروز جمعرات بتاریخ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۱۹ اپریل ۲۰۱۲ء بوقت صبح ۱۰ بجے کے قریب حضرت الاستاذ نے دورہ حدیث کی کلاس میں اساتذہ جامعہ وشانہائے جامعہ کے سامنے نتائج ششماہی کا اعلان فرمایا، دوران اعلان مختلف باتوں کی طرف مختصر اشارے فرمائے: مثلاً جب درجہ سابعہ کے نتائج کا اعلان فرمانے لگے تو جب درجہ سابعہ ملیں اور سابعہ گشت عمر کے طلبہ کرام کی تعداد ذکر فرمائی اور پھر جامعہ کے درجہ سابعہ کے طلبہ کی تعداد ذکر فرمائی تو فرمایا کہ: تینوں جگہ اتنی تعداد ہے تو اگلے سال دورہ حدیث کے داخلے کے لئے بڑا المیہ ہوگا (شاید اس المیہ میں ایک دوسرے عظیم المیہ کی طرف اشارہ تھا) اسی طرح فرمایا کہ: جو اساتذہ کرام وفاق المدارس کے امتحانات میں نگرانی کے فرائض انجام دیتے ہیں، وہ بحسن و خوبی اس کام کو ادا کریں۔

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ: بعض ساتھی پرچوں کی چیکنگ کے لئے جاتے ہیں، وہ بھی بھرپور طریقے سے اس کام کو شوق و محنت سے سرانجام دیں۔ نتائج کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب کا بیان ہوا اور اکثر حضرات نے محسوس کیا کہ استاذ جی اکثر اساتذہ کرام سے گلے ملے، شاید کہ یہ آخری اور الوداعی پروگرام اور نشست تھی، بقول شاعر:

وصل کے دن بہت اداس تھا میں
آنے والی جدائی کا غم تھا

بقول فانی:

وصال ودید پر فانی نہ اترا
یہ عرصہ مختصر ہے سوچ لینا

اسی طرح یہ استاذ محترم کی اساتذہ کرام کی محفل و مجلس میں آخری گفتگو اور باتیں تھیں اور پھر اس سے اگلے دن وہ جانب ملک عدم روانہ ہو گئے:

ساری عمران آنکھوں کو وہ پینا درہا
صدیاں بیت گئیں وہ لمحہ یاد رہا
نہ جانے کونسی ایسی بات تھی اس میں
ساری محفول بھول گئے وہ چہرہ یاد رہا

یہ چند اشعار استاذ محترم رحمہ اللہ کی نذر کرتا ہوں:

مجھڑے ہوئے لوگوں کی صدا کیوں نہیں آتی

اے موسمِ خوشبو کی طرح روٹھنے والے!
پیغام تیرا لے کے صبا کیوں نہیں آتی
سجا لیا اسے دل کے نگار خانے میں
وہ ایک زخم جو کافی ہے عمر بھر کے لئے

حضرت الاستاذ سے شرفِ تلمذ:

حضرت الاستاذ سے ہمیں درجہ رابعہ ۲۰۰۰ء میں نحو کی مایہ ناز مشہور کتاب ”شرح جامی“ پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی، اگرچہ قدوری حصہ اول کے بھی کچھ ابواب ان سے پڑھے، لیکن باقاعدہ کتاب جو ان سے پڑھی وہ شرح جامی تھی۔ دارالتصنیف کے سامنے والی درسگاہ درجہ رابعہ کی تھی، دس بجے وقفہ کے بعد متصل حضرت الاستاذ کا گھنٹہ شروع ہو جاتا، شرح جامی کی عبارات، دخل مقدر اور اس کے جوابات اور علماء نحو کے مسالک آپ کو فاتحہ کی طرح ازبر تھے، دورانِ سبق عربی، فارسی، اردو، پشتو کے بہترین اشعار بطور استنبہاد پیش فرماتے۔

۲۳/شوال المکرم ۱۴۲۰ھ بمطابق جنوری ۲۰۰۰ء بروز پیر سبق کا پہلا دن تھا اور تعلیمی سال کی ابتدا تھی، استاذ محترم تشریف لائے تو پہلے ہی دن کچھ طلبہ ذرا تاخیر سے پہنچے جو شاید وضوء وغیرہ بنانے گئے تھے، حضرت الاستاذ نے ان کو نصیحت فرمائی اور یہ شعر سنایا:

نہشت	اول	چوں	نہد	معمار	کج
تا	ثریا	ے	رود	دیوار	کج

اسی طرح حضرت الاستاذ سے درجہ سادسہ ۲۰۰۲ء میں جلالین حصہ اول، تیسرے سپارے کا ابتدائی پاؤ پارہ پڑھنے کی سعادت ملی، چونکہ حضرت الاستاذ مولانا فضل محمد یوسف زئی مدظلہ پاؤں کے ناخن کی تکلیف کے سبب آرام فرما رہے تھے تو شیخ عطاء شہید رحمہ اللہ نے چند دن تک آکر درس جلالین دیا، اسی طرح درجہ سابعہ ۲۰۰۳ء میں باقاعدہ حضرت شیخ عطاء علیہ الرحمۃ سے علم حدیث کی مشہور زمانہ کتاب مشکوٰۃ المصابیح حصہ اول پڑھنے کی توفیق نصیب ہوئی، اور یہ استاذ محترم سے آخری کتاب تھی جو ہم نے پڑھی، اللہ تعالیٰ حضرت الشیخ کے درجات بلند فرمائے، اور ان کے جانے سے جو خلاء پیدا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ غیب کے خزانے سے پُر فرمادے، آج ان کی شہادت کو ایک مہینہ مکمل ہوا:

آتی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا۔

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)



استاذ محترم کی چند حسین یادیں

مولانا اکرام اللہ خان

مدرس جامعہ بنوری ٹاؤن



اکرام اللہ خان لالا حکم یہ استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمہ اللہ کے وہ آخری الفاظ ہیں، جن کے بعد صرف ایک مجلس ہوئی اور استاذ محترم ہمیشہ کے لئے دنیا سے داغ مفارقت دے گئے۔

۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ جمعرات کے دن ششماہی امتحان کے نتائج کے سلسلے میں اجلاس کے بعد جامعہ کے مہمان خانہ میں بعض طلباء کے امور سے متعلق مشورہ طے تھا، استاذ محترم کو مشورہ کی اطلاع دینے جب میں جامعہ کے حجامت خانہ پہنچا تو آپ کرسی پر تشریف فرما تھے، سامنے لگے آئینہ میں مجھے دیکھا، آپ کے استفسار پر طے شدہ مشورہ کی یاد دہانی کرائی تو مشورے کا سن کر فرمایا کہ: بس آتا ہوں، دیکھو! میں نے سر پر سے ٹوپی بھی نہیں اتاری ہے، صرف خط ہی بنوارا ہوں۔ میں مہمان خانہ پہنچا تو وہاں جامعہ کے بڑے اساتذہ کرام تشریف فرما تھے، میں محترم مفتی رفیق احمد بالا کوٹی صاحب کے قریب جا کر بیٹھ گیا، اساتذہ کرام نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کو کہا، لیکن ہم نے اساتذہ کرام کے قدموں میں بیٹھنا اپنی سعادت تعبیر کیا۔ دو منٹ بعد استاذ محترم تشریف لائے اور صوفے پر بیٹھ کر فرمایا کہ: آپ لوگ بھی اوپر بیٹھ جائیں! مفتی صاحب کے انکار پر ہمارے نیچے بیٹھنے کی سہولت کا استاذ محترم کو اندازہ ہو گیا تو فرمایا چلو بھائی! ہم بھی نیچے بیٹھتے ہیں، اور سب حضرات نیچے بیٹھ گئے۔ ہمیشہ کی طرح آج کے اجلاس میں بھی استاذ محترم جامعہ اور طلباء کے امور میں حسب عادت ہر پہلو پر رائے، اس کے لوازمات و مقدمات اور ثمرات و نتائج پر تفصیلی گفتگو سے محظوظ فرماتے رہے۔

استاذ محترم کی شخصیت بے شمار صفات کی حامل تھی۔ میں نے جامعہ میں اپنی سات سالہ عملی زندگی میں استاذ محترم کو بہت قریب سے دیکھا۔ انتہائی متواضع اور بے تکلف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہری رعب اور دبدبہ بھی عطا فرمایا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ تھا۔ رعب اور جلال کی وجہ سے ان کی صفات کا صحیح اندازہ لگانا تو بہت مشکل تھا، پس آپ اخلاص اور وفا کے پیکر تھے۔ جامعہ اور طلباء کی خدمت میں اخلاص کا جو ہر استاذ محترم نے اپنے عمل سے سکھایا۔ استاذ محترم اپنے محبت بھرے لہجے میں فرماتے تھے کہ مولوی صاحب! لوگ اخلاص کے معنی پوچھتے ہیں، اخلاص کے معنی مخلص خود سمجھتا ہے۔

استاذ محترم کو اپنے اکابر اور اساتذہ کرام پر بھرپور اعتماد تھا، ہر کام محترم استاذ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہم سے پوچھ پوچھ کر کرتے۔ اسفار اور مقامی پروگراموں میں شرکت حضرت ڈاکٹر صاحب کی پیشگی اجازت اور رہنمائی کے بغیر نہیں فرماتے اور واپسی پر مکمل کارگزاری سے بھی حضرت کو مطلع فرماتے تھے۔ اپنے اسباق کا خلاصہ بھی کبھی کبھار حضرت ڈاکٹر صاحب کو بیان فرماتے تھے۔ زیر مطالعہ مختلف علمی نکات پر اساتذہ بلکہ ہم جیسے طلباء سے بھی گفتگو فرماتے تھے۔

استاذ محترم کو عرق النساء کی تکلیف تھی، اس کے باوجود اپنے اساتذہ کرام اور اکابر کے سامنے باادب تلمیذ کی طرح بیٹھتے۔ آپ شستہ زبان کے حامل تھے، کبھی استاذ محترم کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں سنے جو شستگی زبان کے منافی ہوں، چھوٹوں کا نام بھی ادب سے لیتے تھے، کسی کا نام بغیر ”صاحب“ کے نہیں لیتے تھے۔ جامعہ کے سابق ناظم تعلیمات حضرت مولانا عبدالقیوم چترالی رحمہ اللہ جو استاذ محترم کے استاذ بھی تھے، ان کی علالت کے باعث جامعہ کی مجلس شوریٰ نے استاذ محترم کو ناظم تعلیمات کے عہدے پر مقرر کیا تو حضرت رحمہ اللہ کی زندگی میں کبھی بھی ناظم تعلیمات کی نشست پر نہیں بیٹھے، ان کی رحلت کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم کے حکم اور اصرار پر صرف چند بار ہی اس نشست پر بیٹھے، ہمیں یہ اندازہ ہوتا تھا کہ استاذ محترم پر یہ کتنا گراں گزر رہا ہے۔ بغیر نام اور عہدہ کے کام کرنا ان کا شعار تھا، تشہیر سے سخت نفرت تھی۔

استاذ محترم کے تذکرہ کے یہ الفاظ لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ ان کی زندگی میں کیا مجال تھی کہ کوئی ان کا اس طرح تذکرہ کرے؟ جامعہ کے

معاملات سے متعلق اگر استاذ محترم کے ذمہ دستخط کی ذمہ داری ہوتی تو متعلقہ نگران سے فرماتے تھے کہ رقم کی تفصیل آپ اپنے ہاتھ سے لکھ دیں، دستخط میں کردوں گا۔ اپنی تنخواہ میں سے لاعلیٰ التعمین کچھ رقم دفتر محاسب میں اس لئے جمع کرواتے تاکہ جامعہ کے املاک کے استعمال میں بے احتیاطی کا ازالہ ہو سکے۔

حضرت استاذ محترمؒ انتہائی زیرک اور معاملہ فہم تھے، بعض معاملات میں استاذ محترم کی رائے بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتی تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حقیقت سمجھ میں آنے پر معلوم ہوتا کہ واقعہً استاذ محترم کی رائے درست تھی۔ جامعہ کے بڑے ذمہ دار اور بیشتر اساتذہ کے استاذ ہونے کے باوجود اصلاح کا طریقہ حکیمانہ تھا، سامنے والے کی عزت نفس کا خاص خیال رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ اساتذہ کے دلوں میں استاذ محترم کی خاص عظمت تھی۔ انتظامی معاملات میں مصروفیات کے باوجود سبق کا نغمہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ ادارے کے لئے اور ہمارے لئے مشکل وقت میں بڑا سہارا تھے، والد یا بڑے بھائی کی طرح ہماری رہنمائی فرماتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کو ضروری سمجھتے تھے، اسی لئے اسکول اور کالج کے طلبہ کے لئے جامع مسجد صالح جہانگیر پارک صدر کراچی میں چالیس روزہ دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت کورس متعارف کروایا، یہ کورس اتنا مفید اور مقبول عام ثابت ہوا کہ اس کی افادیت کی وجہ سے ملک کے کئی مقامات کے علاوہ بیرون ملک بعض فضلاء جامعہ اپنے اپنے حلقوں میں اس کورس کا اہتمام کر رہے ہیں۔ طلباء اور متعلقین کی اصلاح کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے، استاذ محترم کے قریب رہنے والے زیادہ باادب ہوتے تھے، کیونکہ استاذ محترم مصاحبین کی کوتاہیوں پر فوراً اصلاح فرماتے تھے۔ کوئی مصافحہ کرتے وقت خاموش ہوتا تو فوراً فرماتے کہ مصافحہ سے قبل زبان سے سلام کرنا سنت ہے، مصافحہ بغیر سلام کے لا حاصل ہے۔ کوئی مصافحہ کرتے وقت دو انگلیاں ملاتا تو ناصحانہ تنبیہ فرماتے کہ بھائی! اگر پورا ہاتھ نہیں ملانا چاہتے ہو تو مصافحہ کیوں کرتے ہو؟ اپنی اصلاح کرو۔ کوئی گیلے ہاتھوں سے مصافحہ کرتا تو فرماتے: ہاں! اپنے ہاتھ دوسروں پر صاف کرتے ہو؟ طلباء بعض اوقات راستوں میں چھٹی وغیرہ کی درخواستیں پیش کرتے تو فوراً تنبیہ فرماتے اور فرماتے کہ مولوی صاحب! ادب سیکھو، موقع محل پہچانو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ اس طرح کی بے شمار رہنمائیاں ہیں جو ایک مہذب انسان بننے کے لئے بہت ضروری ہیں۔ طلبہ کی غیر حاضری پر بہت ناراض ہوتے تھے، تین دن سے زیادہ رخصت کی درخواست پیش کرنے والے طلباء استاذ محترم کے جلال کی وجہ سے دفتر سے واپس چلے جاتے تھے تو استاذ محترم ہم سے فرماتے تھے کہ اگر اس مولوی صاحب کا چھٹی پر جانا ناگزیر ہو تو پرچی بنا کر دید و اور یہ تاکید کر دو کہ جلدی واپس آنے کی کوشش کرے، ورنہ رخصت کا لعدم ہو سکتی ہے۔

ایک مرتبہ حرمین کے سفر سے واپسی پر مجھ سے فرمایا ”آپ حرم میں یاد آئے تو میں نے آپ کے لئے دعا کی، دیکھو بھائی! یہ جامعہ کی برکات ہیں۔“ اللہ تعالیٰ استاذ محترم کی ان دعاؤں کو ہمارے حق میں قبول فرمائے، ان کی بال بال مغفرت فرما کر ان کے درجات بلند فرمائے، آپ کی مساعی جمیلہ کو آپ کے لئے راحت کا سامان بنائے، استاذ محترم کے جملہ لواحقین، بالخصوص ان کے والدین ماجدین، اہل خانہ، ان کے یار غار حضرت استاذ محترم مولانا مدام اللہ صاحب مدظلہ اور ان کی نسبی و روحانی اولاد کو صبر جمیل عطا فرمائے، جامعہ کی ترقی کو بغیر کسی آزمائش کے برقرار رکھے۔



”من پدر گم کردہ ام“

مولانا مفتی طلحہ منیر
رکن مجلس منتظمہ اقرار و وضعہ الاطفال



جامعہ علوم اسلامیہ کا نام اپنے حفظ کے زمانہ میں سنا تھا کہ عالم اسلام کی مرکزی جامعہ ہے اور بغیر دیکھے ہی دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ آئندہ تعلیم وہاں حاصل کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہوا اور بندہ ۱۹۹۴ء میں اس عظیم دینی درسگاہ سے منسلک ہو گیا۔

داخلہ کی کارروائی میں ایک مرحلہ انٹرویو کا بھی آیا اور پتہ چلا کہ مسجد کے ہال میں جا کر اس مرحلہ سے گزرنا ہوتا ہے۔ وہاں طلبہ ایک قطار میں بیٹھے تھے میں بھی جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی باری آگئی اور میں بھی جائزہ لینے والے استاذ محترم کے روبرو جا بیٹھا۔ جن کی کشادہ پیشانی، سیاہ گھنی داڑھی اور ذہانت و فراست سے پُر نگاہیں ایک لمحہ ہی میں حافظہ خیال میں نقش ہو گئیں، کچھ سوالات ہوئے اور داخلہ کی کارروائی مکمل ہو گئی۔ طلبہ سے معلوم ہوا کہ یہ جامعہ کے استاذ اور ناظم حضرت مولانا عطاء الرحمن (نور اللہ مرقدہ) ہیں۔ اس بات کو لگ بھگ بیس برس ہو گئے ہیں لیکن جب ذرا آنکھیں بند کرتا ہوں تو یہ سارا منظر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ نگاہوں میں پھرنے لگتا ہے۔

یہ حضرت مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد کبھی جامعہ کی مسجد میں، صحن میں، دفتر میں یا درسگاہ میں آتے جاتے حضرت سے ملاقات ہو جاتی اور میں بھی دیگر طلبہ کی طرح حضرت سے مصافحہ کر لیتا۔ اس زمانہ میں جامعہ میں طلبہ کا وہ ہجوم نہیں تھا جو آج الحمد للہ نظر آتا ہے۔ کراچی کے شہری طلبہ گو کہ بہت کم بھی نہیں ہوتے تھے مگر پھر بھی آجکل کے مقابلہ میں کم ہی ہوتے تھے تقریباً روزانہ ہی حضرت کی زیارت ہو جاتی تھی لیکن حضرت کی ذاتی وجاہت اور بارعب چہرے کی بنا پر نہ جانے کیوں ایک رعب سار ہتا تھا اور قریب ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اسی اثناء میں عید الاضحیٰ کا وقت قریب آ گیا واقفین حال جانتے ہیں کہ جامعہ میں عید الاضحیٰ سے پہلے چرم قربانی جمع کرنے کی ترتیب کیسے بنتی ہے اور پھر عین عید الاضحیٰ کے دنوں میں چرم قربانی کس دینی ولولہ سے جمع کی جاتی ہیں، اور وہ زمانہ تو حضرت مفتی عبدالسیع سندھی شہید نور اللہ مرقدہ کا تھا۔ مفتی صاحب میں جامعہ کی خدمت، اس کی ترقی کا بے لوث جذبہ تھا اور یہی جذبہ ان کے رفقاء کار میں بھی نظر آتا تھا۔ انہی دنوں بندہ نے دیکھا کہ مفتی صاحب شہید نور اللہ مرقدہ کے ساتھ جو اساتذہ جامعہ کی اس خدمت میں پیش پیش ہیں ان میں حضرت مولانا امداد اللہ صاحب اور حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید بھی ہیں۔

بندہ کے ذمہ بھی اپنے محلہ میں چرم قربانی جمع کرنا طے پایا۔ اور خوبی مقدر یہ کہ ہمارے حلقہ کے نگران حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ طے پائے۔ اس وقت حضرت سے کچھ گفتگو ہوئی، آپ کی شفقت، محبت محسوس کی، کچھ حجاب ختم ہوا۔ حضرت کی عنایات، بے پایاں الطاف بڑھتے رہے اور پھر روز بروز آپ کی محبت دل و جاں میں پیوست ہوتی رہی تا آنکہ مورخہ 20 اپریل بروز جمعۃ المبارک حضرت ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر اپنے پروردگار سے جا ملے۔ حضرت کی تدفین اور حضرت کے اعزہ سے تعزیت کے لیے حضرت کے آبائی گاؤں بابوزئی اباخیل ضلع مردان جارہا تھا اور ذہن میں ان تمام واقعات کا ایک ہجوم تھا اور مولانا سے متعلق یادداشتوں کا نہ تھمنے والا ایک سلسلہ تھا۔

کیا کیا لکھوں! مولانا کی وجاہت و رعنائی، مولانا کی گونج دار آواز، جامعہ سے عشق کی حد تک لگاؤ، جامعہ کے لیے اپنا تن، من، دھن لگانا، تدریس پر عبور، طلبہ پر شفقت، ایک ایک کا خیال، ایفاء عہد، تواضع، للہیت، فنایت ہر ایک چیز اس کی متقاضی ہے کہ صفحات کے صفحات اس پر لکھے جائیں۔

زفرق تا بقدم ہر جگہ کہ می نگریم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جانیجااست

بہر حال یہ حضرت کی سوانح نہیں بلکہ ایک غم زدہ دل کی تسلی کے لیے اپنے محبوب استاذ کا کچھ تذکرہ ہے:

قفانیک من ذکر ی حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحو مل

یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سانحہ ہو گیا ہے اور مولانا اب ہم میں نہیں رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ابھی فون کی گھنٹی بجے گی اور مولانا اپنے مخصوص انداز میں گفتگو فرمائیں گے۔

جمعہ کے دن مغرب کے بعد حضرت مفتی مزمل حسین کا پڑیا صاحب (نائب مدیر اقرار ووضۃ الاطفال ٹرسٹ) سے یہ روح فرسا خبر سنی تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، بے تابانہ جامعہ کی طرف چل پڑا وہاں پہنچا تو ہر طرف سے آہوں اور سسکیوں کی آواز نے بتا دیا کہ وہ حادثہ رونما ہو چکا ہے جس کی خلا کا پر ہونا صرف مشیت ایزدی ہی سے ہو سکتا ہے۔

حضرت مولانا بندہ کے استاذ ہیں بندہ نے ان سے سب سے پہلے ”شرح جامی“ پڑھی۔ علوم عربیہ سے واقفیت رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ شرح جامی علم النحو کی کس درجہ کی کتاب ہے اور کس قدر دقیق مباحث اس کتاب میں موجود ہیں۔

مولانا سے پہلے یہ کتاب حضرت مفتی عبدالسیع سندھی شہید نور اللہ مرقدہ کے پاس ہوا کرتی تھی۔ مفتی صاحب کی شہادت کے بعد یہ کتاب حضرت مولانا کے پاس منتقل ہوئی تھی۔ حضرت نے اس کتاب کو ایسا پڑھایا گویا حق ادا کر دیا۔ اس کے بعد سابع تک تقریباً تمام درجوں میں مولانا سے کچھ نہ کچھ پڑھنے کا شرف حاصل رہا۔ مولانا کا انداز تدریس بہت عام فہم اور زالا تھا۔ اکثر درس کے دوران درس گاہ کے آخر میں بیٹھنے والے طلبہ کی طرف دیکھ کر فرماتے کہ میں انکو سمجھاتا ہوں صرف ذہین طلبہ کے سر ہلانے پر مطمئن نہیں ہوتا۔ حضرت بلا کے زیرک تھے۔ طلبہ کے چہروں سے اندازہ لگا لیتے کہ سبق سمجھ میں آ رہا ہے کہ نہیں کبھی کبھی اپنے مخصوص انداز میں کسی سے گویا ہوتے کہ ”مولوی صاحب یہ صرف آپ کے لیے“ اور پھر دوبارہ سبق کی تقریر فرماتے، جب تک خود کو اطمینان نہ ہو جاتا کہ طلبہ سمجھ گئے ہیں بار بار اس مقام کی تقریر فرماتے۔

دوران درس بر محل اور برجستہ اشعار سناتے جسے بندہ اپنی کاپی میں قلم بند کر لیتا اور بعد میں کبھی حضرت کو سناتا تھا کہ حضرت یہ آپ سے سنا تھا تو بہت خوشی کا اظہار فرمایا کرتے تھے، کبھی کوئی نصیحت کی بات، کبھی کوئی لطیف نکتہ سناتے اور فرمایا کرتے کہ مولوی صاحب یہ بھی کام کی باتیں ہیں، انہیں اچار چٹنی نہ سمجھا جائے کہ چٹنہ لیا اور بس بلکہ ان پر عمل کی بھی ضرورت ہے۔ باوجود اپنے بلند مرتبہ اور تدریسی تجربہ کے نچلے درجات میں سبق پڑھانے کو محبوب رکھتے تھے اور ان چھوٹے طلبہ کی تربیت فرماتے تھے۔

مولانا کی شخصیت میں ایک جاذبیت تھی، محبوبیت تھی، جس کو حضرت کا قرب نصیب ہوتا وہ اپنے دل میں مولانا کے لیے محبت محسوس کرتا تھا۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ کئی بار صرف اس لیے کہ مولانا کی زیارت ہو جائے، مولانا سے کچھ بات چیت ہو جائے، کسی کتاب کو لے کر مولانا کے پاس چلا جاتا کہ حضرت یہ مقام ذرا سمجھا دیجیے اور مولانا پوری بشارت سے دن رات کے کسی بھی پہر میں اس مقام کی تقریر فرمانے لگتے تھے۔ یوں تو مولانا کی شفقت تمام ہی طلبہ پر ہوا کرتی تھی مگر، وہ طلبہ جن کے گھروں کا ماحول دینی نہ ہو یا ان کے حالات نامساعد ہوں یا شہری ہونے کی بنا پر ان کے خاندان میں علم دین حاصل کرنے کا رواج نہ ہو ان پر ہمیشہ مولانا کی خصوصی شفقت رہا کرتی۔ اور حضرت ہر طریقہ سے ان کا خیال فرمایا کرتے۔ طلبہ کے مدرسہ نہ آنے پر ان کے گھروں پر جا کر ان کو سمجھانا، ان کی ہمت بڑھانا ان کو دوبارہ مدرسہ میں لانا مولانا کا معمول تھا۔

آج مولانا کی ان روحانی اولادوں کے حافظوں میں حضرت کی شفقت کے لاتعداد واقعات محفوظ ہوں گے بندہ نے بھی حضرت کی شفقتوں سے خوب استفادہ کیا ہے۔ امتحانات کے دنوں میں جب بندہ مدرسہ میں مقیم ہوتا تو حضرت پوچھتے صبح ناشتہ کی کیا ترتیب ہے؟ اور بندہ کہتا کہ حضرت ناشتہ تو آپ کے گھر ہوگا اور حضرت خوشی سے فرماتے، ”بس یہی سننا تھا“ اور صبح حضرت کے دسترخوان پر حضرت کے گھر میں پُر تکلف ناشتہ کا بندوبست ایک ایسے طالب علم کے لیے ہوتا جو نہ تین میں تھا نہ تیرا میں، اور میں ہی کیا حضرت سے تعلق رکھنے والے تمام ہی طلبہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ حضرت استاذ محترم کے روحانی احسانات کی طرح جن کا شمار ہی ممکن نہیں حضرت کے مادی احسانات بھی اتنے ہی وسیع اور ناقابل فراموش ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے درجہ سابعہ میں بندہ حضرت کے ایماء پر ایک مسجد میں شام کے اوقات میں کچھ پڑھانے جایا کرتا تھا۔ مسجد کے احباب نے اس وقت کا کچھ معاوضہ دینا چاہا جو بندہ نے قبول نہیں کیا، حضرت کو اطلاع ہوئی مجھے بلوایا اور فرمایا کہ یہ معاوضہ میرے کہنے پر طے ہوا ہے لے لو۔ اور مجھ سے فرمایا کہ میں تمہیں اور ان لوگوں کو اپنی مسجد بلوالوں گا اور وہاں میں ان سے یہ معاوضہ تمہیں دلاؤں گا۔ تعمیل حکم کے علاوہ چارہ کار نہیں تھا وقت مقررہ پر بندہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ان صاحب سے معاوضہ لے لیا۔ واپسی کے سفر میں اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کسی نے جیب پر ہاتھ صاف کر لیا۔ اگلے دن میں نے استاذ محترم کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو حضرت نے فرمایا ”کچھ چیزوں کا پاس نہ رہنا ہمارے لیے اچھا ہوتا ہے، غم کی کوئی بات نہیں۔“ کچھ ہی دنوں بعد امتحانات کے نتائج کے بعد اچھے نتیجے کی خوشی میں حضرت نے اپنی جیب سے اتنی ہی رقم عطا فرمادی اور یوں گویا اس غم کی تلانی فرمادی۔

حضرت کی غیور طبیعت کا احساس ہے وگرنہ کتنے ہی واقعات ایسے ہیں جن کا تذکرہ کرنے کو دل چلتا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ حضرت نے ساری زندگی ان تمام طلبہ سے محبت میں اخلاص اور بے غرضی کو بنیاد بنایا تھا اور حضرت اپنی حیات میں بھی اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ان واقعات کا افشا ہو۔

چنانچہ بس اسی ایک واقعہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت مولانا کی ایک نمایاں خصوصیت اُن کی معاملہ فہمی اور ایمانی فراست تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت کو اس سلسلہ میں وہ ملکہ حاصل تھا کہ آپ کی نگاہ کھرے اور کھوٹے میں فوراً ہی فرق کر لیا کرتی تھی۔ لہذا آپ کے متعلقین اپنے ذاتی معاملات بھی آپ سے رجوع کیا کرتے تھے اور حضرت بھی ایسے لوگوں سے جو حضرت سے اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلہ میں مشورہ کرتے تھے ”المستشار مؤتمن“ کے مصداق صائب رائے دیا کرتے تھے اور اس بات پر کہ اپنا سمجھ کر ان سے مشورہ کیا گیا ہے بہت خوشی کا اظہار فرماتے تھے۔

میں کیسے بھول جاؤں کہ صرف ایک فون کال پر جب بندہ نے حضرت سے کہا کہ حضرت حج پر جانا ہے اور اس سلسلہ میں آپ سے مشورہ کرنا ہے تو کس خوشی سے پہلے تو حضرت نے مبارکباد دی اور پھر پوچھا کہ آپ کہاں ہیں۔ میرے بتانے پر فرمایا کہ بس میں بھی قریب ہی ہوں آپ سڑک پر آجائیں اور مل لیں۔ رات کے اس پہر میں مولانا اپنے مخلص رفیق اور خادم مولانا سہیل صاحب کے ساتھ موٹر سائیکل پر تشریف لائے۔ بندہ نے کہا حضرت آپ کو بڑی زحمت ہوگئی۔ فرمایا نہیں خوشی ہوئی کہ آپ نے مشورہ کے لیے مجھ پر اعتماد کیا اور پھر میری بات سن کر اپنی رائے دی اور تشریف لے گئے۔

اور میں اس سوچ میں غرق کہ کیا میرے لیے بھی ممکن ہے کہ اپنے کسی چھوٹے کی صرف ایک فون کال پر یوں دوڑا چلا آؤں۔ یقیناً نہیں۔ باوجودیکہ میری مشغولی کا ذمہ داری کا حضرت کی مشغولیوں اور ذمہ داریوں سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ لیکن اس کا کیا کریں کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھیجتا ہی اس لیے ہے کہ وہ انسانیت کے لیے ایک مثالی نمونہ بنیں۔ لوگوں کو اخلاق اور انسانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلانیں۔ ایسے لوگوں کے اپنے اور پرائے سبھی معترف ہوتے ہیں۔ ہمارے حضرت کا بھی یہی حال تھا۔

ذاتیات اور اغراض سے بلند و بالا ہو کر اپنے متعلقین کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھنا، ان کے مزاج کی رعایت کرنا، حضرت مولانا کا خاصہ تھا۔ اس ضمن میں اگر لکھنا شروع کر دوں تو ایک دفتر جمع ہو سکتا ہے۔

قارئین کے لیے شاید اس میں کوئی چاشنی نہ ہو لیکن میرا دل مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے رہا کہ میں حضرت کی زندگی کے اس عظیم پہلو سے صرف نظر کر کے گزر جاؤں۔ یہ واقعاً حضرت کی کرامت ہی تھی کہ حد درجہ مشغولی کے باوجود نہ صرف حضرت کو اپنے متعلقین کی خبر رہتی تھی بلکہ ان کی راحت رسانی کے ہر ممکن کام کا صدور حضرت سے ایسے ہوتا تھا کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ ہمارے تخصص کے سال حضرت پر عرق النساء کا شدید حملہ ہوا۔ وہ دن ویسے بھی بڑے عجیب تھے۔ حضرت مفتی ڈاکٹر نظام الدین شامزئی شہید نور اللہ مرقدہ کی شہادت کا سانحہ تازہ تازہ تھا۔ جامعہ کے دروہام پر ایک غم و مایوسی کی چادر تھی ہر ایک مفتی صاحب کی رحلت پر افسردہ تھا۔ اور حضرت مولانا پر تو غم کی ایک الگ ہی کیفیت تھی کہ حضرت کا حضرت مفتی صاحب سے ایک الگ ہی رشتہ تھا گو کہ حضرت مولانا مفتی صاحب کے شاگرد نہیں تھے لیکن مفتی صاحب کی عزت ایسے ہی کرتے تھے جیسے ایک شاگرد استاذ کی عزت کرتا ہے بارہا بندہ نے حضرت مولانا کو حضرت مفتی صاحب کی چپل سیدھی کرتے دیکھا اور دوسری جانب حضرت مفتی صاحب کو حضرت مولانا سے محبت تھی اور حضرت مولانا کی آمد پر حضرت مفتی صاحب کا رخ انور پھول کی طرح کھل جاتا تھا۔ بندہ نے حضرت مفتی صاحب کی شہادت سے پہلے کئی دفعہ تخصص کی درسگاہ میں حضرت مفتی صاحب کو سوچ میں ڈوبا ہوا بیٹھے دیکھا اور پھر حضرت مولانا کی آمد پر حضرت کے رخ انور کو پھول کی طرح کھلتے دیکھا۔

حضرت مفتی صاحب کے یہ الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں کہ ”مولوی صاحب! ہمارے مولانا کے لیے اچھی سی چائے لاؤ“، پھر مولانا ہوتے، مفتی صاحب ہوتے مولانا امداد اللہ صاحب بھی اکثر اس نشست میں شریک ہوتے کبھی کبھار حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خان شہید نور اللہ مرقدہ بھی ہوتے اور خوش مزاجی اور دل بستگی کا ایک دور دورہ ہوتا۔ اب تو ان حضرات میں سے سوائے حضرت مولانا امداد اللہ صاحب متعنا اللہ بطول بقائہ فیما کے سوا سارے ہی حضرات اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔ اللہ کے فضل سے کیا بعید کہ اب یہ مجلس وہاں لگتی ہو جس کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ”مالا عین رأت ولا اذن سمعت“ فرمایا ہے۔

ایک طرف تو حضرت مفتی صاحب کی رحلت کا غم دوسری جانب حضرت مولانا پر درد کا شدید حملہ کئی دن حضرت مولانا جامعہ کے مہمان خانہ میں مقیم رہے۔ اپنے گھر جو کہ جامعہ کے سامنے ہی ہے تشریف نہ لے جاسکے۔ انہی دنوں ایک طالب علم بندہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ کو استاذ جی بلارہے ہیں بندہ مہمان خانہ گیا تو حضرت نے فرمایا کہ گھر سے چائے آئی ہے آپ کے لیے رکھی ہے پی لیں۔ اور یہ صرف اس پر ہے کہ ایک دفعہ بندہ نے حضرت سے کہا تھا کہ حضرت آپ کے گھر جیسی چائے کہیں نہیں پی، بہت مزیدار ہوتی ہے، خدا نخواستہ اس واقعہ کے ذکر سے مقصود اپنی کسی فضیلت کا اظہار نہیں، یہ صرف اس خدا رسیدہ بزرگ کی زندگی کی ایک جھلک ہے۔ کہ ایک دفعہ کے تذکرہ پر حضرت کے ذہن میں یہ بات رہ گئی اور اس بیماری کے عالم میں بھی یہ بات

حضرت کے ذہن سے فراموش نہ ہوئی۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

اپنے متعلقین کی خوشی کی خاطر باوجود حالات کی خرابی اور بدامنی کے حضرت کا ان کی خوشی، غمی میں شریک ہونا، صرف ملاقات کے لیے مستقل سفر کرنا جماعتوں میں نکلے ہوئے طلبہ کی نصرت کرنا، آنے والے مہمانوں جن میں اکثریت طلبہ ہی کی ہوتی ان کے خیال میں دیر تک ان کے ساتھ بیٹھے رہنا، ان کے لیے دسترخوان وسیع کرنا اور سارا دن جامعہ میں موجود رہ کر جامعہ کے تعلیمی اور انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کرنا اور اپنے آرام و راحت کا بالکل خیال نہ رکھنا حضرت کی ایسی خصوصیات ہیں کہ بھلائے نہیں بھولتیں۔

سال گزشتہ کے ماہ دسمبر میں بندہ کا ویسٹ انڈیز (جزائر غرب الہند) کا سفر طے ہوا جہاں بندہ کی دو بہنوں کا سسرال بھی ہے یہ سفر ان لوگوں سے ملاقات اور تیسری ہمشیرہ کی نکاح کی تقریب کے سلسلہ میں تھا۔ میرے بہنوئی بھی حضرت کے شاگرد حضرت کے عاشق زار اور حضرت کے خصوصی متعلقین میں سے ہیں۔ ان حضرات نے حضرت مولانا سے فرمایا کہ آپ بھی تشریف لائیں کیوں کہ ہماری خواہش ہے کہ نکاح آپ پڑھائیں۔ حضرت کا ان دنوں برطانیہ جانے کا ارادہ تھا، بکمال شفقت اس دعوت کو قبول کیا۔

ویسٹ انڈیز کے جزیرے ٹرینیڈاڈ تشریف لے گئے بندہ بھی ایک طویل سفر کر کے وہاں پہنچا اور یوں زندگی کے کچھ حسین ترین دن حضرت مولانا کی رفاقت میں گزرے۔ اس جزیرہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ نہیں ہے البتہ تبلیغ کی محنت ہو رہی ہے جماعتیں کام کرتی ہیں مساجد موجود ہیں اور بہر حال کچھ نہ کچھ مسلمان بھی ہیں۔

اسی جزیرہ میں میرے ان عزیزوں کا ایک مدرسہ ہے، اقرأ کی ترتیب پر ایک اسلامی اسکول اور مسجد بھی ہے جہاں الحمد للہ وہ اپنی وسعت سے بڑھ کر دین کا کام کر رہے ہیں۔ اس ادارہ میں پورے ملک سے طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حضرت مولانا کو ان نامساعد حالات میں دین کا کام کرنے والوں سے ایک خاص محبت تھی۔ چنانچہ مولانا نہ صرف ان کے استفسار پر ان کی راہنمائی فرماتے بلکہ اس ادارہ کو اپنا سمجھتے ہوئے از خود بھی ان کی راہنمائی فرمادیتے۔ تقریباً دو ہفتے صبح، شام، دن رات حضرت کے ساتھ گزرے۔ کیا عرض کروں کہ اس سفر کی یادوں کے کیسے کیسے دیپ ہیں جو ان شاء اللہ تادم مرگ اس حقیر کے دل میں روشن رہیں گے۔

مولانا کا تہجد میں اٹھ کر نماز میں مشغول ہونا، از خود مدرسہ کے تمام امور میں دلچسپی لینا ان کے لیے نصاب کی تیاری میں سرپرستی کرنا، اپنی طرف سے پوری کوشش کرنا کہ ان کی وجہ سے کسی کو مشقت نہ ہو، وہاں رہتے ہوئے بھی پاکستان کے تعلق والوں سے مستقل رابطہ رکھنا۔ طویل طویل سفر کر کے مختلف جگہوں پر جا کے دعائیں کرنا کہ وہاں مدرسہ بنے، مسجد بنے دین کا کام شروع ہو دارالعلوم ٹرینیڈاڈ میں جا کر بیان کرنا جہاں کے موجودہ مہتمم مفتی وسیم صاحب بھی حضرت کے شاگرد ہیں۔

ان میں سے کچھ بھی تو ایسا نہیں جسے فراموش کر سکوں۔ اسی سفر کے دوران مولانا کے لیے ایک بلا و بار باڈوز سے بھی آیا جو ویسٹ انڈیز کا ایک جزیرہ اور مستقل ملک ہے۔ مولانا چند دنوں کے لیے وہاں بھی تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں نے خصوصیت سے گجراتی احباب نے حضرت مولانا سے خوب استفادہ کیا۔

مولانا نے بندہ سے فرمایا کہ میرا بار باڈوز کا سفر حرم کی برکت سے ہوا ہے اور پھر خود ہی فرمایا کہ ایک دفعہ میں حرم کی میں زمیہ کے احباب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا اس نے مجھ سے کہا ”تم بار باڈوز نہیں آتے؟“ میں نے کہا ضرور آؤں گا۔ بس یہی وہاں کے سفر کا وسیلہ بن گیا ورنہ وہاں کے ویزے کا حصول آسان نہیں ہے۔

گو کہ اصلاً مولانا کراچی سے انگلینڈ کے لیے نکلے تھے اور وہاں مختلف شہروں میں مشتاقین شدت سے آپ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے لیکن مولانا نے زیادہ عرصہ وہیں ویسٹ انڈیز میں گزارا اور فرمایا کہ ان لوگوں کا خلوص اور محبت جانے نہیں دیتا۔

آخر میں چند دن کے لیے انگلینڈ بھی تشریف لے گئے اور وہاں سے سعودیہ عرب پہنچے اور عمرہ کی سعادت اور حرمین کی حاضری کے بعد پاکستان پہنچے۔ اس کے علاوہ کئی ممالک کا سفر حضرت نے صرف بلانے والوں کے خلوص اور محبت پر قبول فرمایا اور وہاں تشریف لے جا کر دین کا کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھایا۔ زمیہ، ساؤتھ افریقہ کے کئی اسفار فرمائے وہاں جامعہ کے فضلاء نے جو مدارس قائم کر رکھے ہیں ان کے دورے کیے وہاں قیام فرمایا،

سرپرستی فرمائی۔

حرمین سے بھی حضرت کو خصوصی لگاؤ تھا، حضرت کی اور حضرت کے دیرینہ رفیق حضرت مولانا امداد اللہ صاحب کی آرزو ہمیشہ سے یہی رہتی کہ کہیں کا بھی سفر ہو کوئی ترتیب ایسی بن جائے کہ آتے یا جاتے یہ سعادت نصیب ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کوئی نہ کوئی ترتیب بنا ہی دیتے تھے۔

مضمون طویل ہو رہا ہے مگر حضرت کی یادیں ختم نہیں ہو رہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کیوں کہ ہمارے حضرت نے اپنی زندگی میں دین کی مختلف جہات میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

وَمَا هُلُكُ قَبْسٍ هُلُكُهُ هُلُكُ وَاحِدٍ

وَلَكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

ایک طرف حضرت جامعہ علوم اسلامیہ کے قدیم استاذ اور ناظم تھے ابتداء ہی سے جامعہ کی تعلیمی شوریٰ کے رکن تھے۔ ایک دفعہ حضرت خود فرمانے لگے کہ میرے ابتدائی تقرر کے زمانہ میں جب تعلیمی کمیٹی کوئی مشورہ کرنے بیٹھتی تو مفتی ولی حسن صاحب فرمایا کرتے ”یہ اچھا آدمی ہے اس کو بھی بٹھاؤ“۔ آپ حضرت مفتی احمد الرحمن اور حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید نور اللہ مراد قدامت کے خصوصی معتمد تھے۔

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ کی شہادت کے بعد آپ جامعہ کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب متعنا اللہ بطلول بقائہ فینا کے دست و بازو بنے اور حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ کی بیماری اور پھر رحلت کے بعد جامعہ کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے اور جامعہ اور شاخہائے جامعہ میں تعلیم کے اسی معیار کو برقرار رکھنے کے لیے شب و روز کوشاں رہے جو جامعہ کا خصوصی امتیاز ہے، تو دوسری جانب آپ تادم رحلت کراچی کی مرکزی مسجد جامع مسجد صالح جہانگیر پارک کے امام و خطیب بھی رہے۔ بندہ کے اندازے کے مطابق شاید کراچی شہر میں جمعہ میں سب سے زیادہ نمازی اسی مسجد میں ہوتے ہیں۔

الحمد للہ بندہ کو بھی حضرت کی نیابت میں اس مسجد میں جمعہ اور عید پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اور بندہ نے حضرت سے عرض بھی کیا کہ آپ کی مسجد میں جمعہ پڑھانے کا بڑا لطف آتا ہے کہ بیان شروع ہونے سے پہلے ہی مسجد بھر جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ہمارے استاذ جی کے اخلاص ہی کا ثمر تھا کہ آپ کی سیدھی سادھی لیکن دل میں اُتر جانے والی تقریر کو سننے کے لیے مجمع پہلے ہی سے مسجد میں آ بیٹھتا تھا اور اسی مسجد سے اللہ تعالیٰ نے حضرت سے اس مقبول کام کی ابتداء کرائی جسے لوگ ”تعلیم و تربیت کورس“ کے نام سے جانتے ہیں اور الحمد للہ دنیا کے کئی ممالک میں آج یہ کورس پڑھایا جا رہا ہے۔ حضرت کے دل میں یہ ارمان اور خواہش تو تھی کہ نئی نسل سے دین کی دوری ختم ہو۔ ابتداء ہی سے ان کی تربیت دینی رُخ پر ہو سکے، ان کے دلوں میں دین کی محبت اور عظمت ہو اور اس سلسلہ میں مولانا حتی الوسع کوشش بھی فرماتے تھے اور اپنی مسجد میں اس سلسلہ میں کوئی نہ کوئی نظم بھی بناتے تھے۔ لیکن مولانا کی آرزو یہ تھی کہ اس سلسلہ میں کوئی ایسی ترتیب بنائی جائے جس کے نتائج دور رس ہوں پہلے قدم کے طور پر حضرت استاذ محترم نے اسکول و کالج کی گرمیوں کی تعطیلات میں اپنی مسجد میں اس کورس کا آغاز کیا جس میں قریبی دکانداروں کے بچوں نے داخلہ لیا اور یوں پڑھائی کا آغاز ہوا۔ بندہ اس وقت غالباً درجہ خامسہ یا سادسہ کا طالب علم تھا۔ استاذ جی کی دور رس نگاہوں نے اس کورس کی افادیت کو بھانپ لیا تھا لہذا حضرت نے اپنے تعلق رکھنے والے طلبہ اساتذہ اور دیگر متعلقین کو اس کورس کی طرف متوجہ فرمایا اور اس سلسلہ میں اس سے آئندہ سال بندہ اور کچھ طلبہ کو جامع مسجد محمدی فیڈرل بھی ایریا بلاک ۷ ابھججا جہاں حضرت کے کچھ متعلقین نے جن کا تعلق گودھرا برادری سے تھا، کورس کا انتظام کیا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کورس کے مراکز میں اضافہ ہوا۔ مولانا ایسے تمام لوگوں کی سرپرستی فرماتے ان کے مراکز میں تشریف لے جاتے ان کا حوصلہ بڑھاتے۔ رفتہ رفتہ اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ اس کورس کے لیے مختلف عمر کے طلبہ کے معیار کے مطابق مختلف کتابیں ہونی چاہئیں، مولانا نے اس پر کام شروع کیا۔ بندہ بھی ان خوش نصیب لوگوں میں شامل ہے جن پر حضرت استاذ محترم نے اعتماد فرمایا اور ان کو شامل کار فرمایا۔ حضرت مفتی ڈاکٹر نظام الدین شامز کی شہید نور اللہ مرقدہ بقید حیات تھے حضرت نے بھی بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور یوں اس کورس کی تالیف کا حتمی کام شروع ہوا۔ بڑے سہانے دن تھے دارالتصنیف میں حضرت استاذ جی اور ہم چند طلبہ اور اساتذہ ہوتے اور حضرت ایک ایک عبارت، جملہ اور لفظ لفظ پر بحث فرماتے اور اچھی طرح مطمئن ہو کر اسے کتاب میں شامل فرماتے۔ کتاب کی تکمیل پر حضرت کی مسرت کا عالم دیدنی تھا یہ حضرت کی للہیت، اخلاص اور جامعہ کی برکات ہی ہیں کہ آج یہ کورس کئی ممالک میں پڑھایا جا رہا ہے۔ اس درجہ عظیم خدمت کے بعد حضرت کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ اس کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ اس کتاب میں حضرت کا تذکرہ بھی ہو۔ حقوق طباعت بھی جامعہ کے دارالتصنیف کے حوالے فرمائے اور ایسے ہو گئے گویا اس عظیم خدمت میں ان کا کوئی کردار ہی نہ ہو۔ میری ناقص رائے میں تو حضرت کا یہ تجدیدی کارنامہ ہی ان شاء اللہ ہمیشہ

حضرت کے تذکرہ خیر کا ذریعہ بنا رہے گا۔

موت تو برحق ہے اس سے کسی کو مفر نہیں جو آیا ہے جانے کے لیے آیا ہے لیکن ہمارے حضرت ان شاء اللہ ہمیشہ اپنے ان دینی آثار کی شکل میں ہم میں موجود رہیں گے۔ آج حضرت کے خدام، حضرت کے تلامذہ جہاں جہاں بھی دینی خدمات میں مشغول ہیں، ان کی ان خدمات کے اجر میں حضرت مولانا کا پورا پورا حصہ ہے کیوں کہ استاذ جی نے ہمیشہ ان کی راہنمائی فرمائی ہے حوصلہ بڑھایا ہے۔ دین کے لیے سب کچھ لگا دینے کا جذبہ ان میں پیدا کیا ہے۔ اگر میں اپنی ہی بات کروں تو میرا اقرار و رضۃ الاطفال ٹرسٹ سے منسلک ہونا وہاں خدمات انجام دینا اس میں حضرت کی توجہات، سرپرستی شامل ہے۔ یہ حضرت ہی تھے جنہوں نے تخصص کے زمانہ میں مجھے اقرار و رضۃ الاطفال ٹرسٹ سے منسلک ہونے کی اجازت دی۔ اور فرمایا کہ یہ تو ہمارے ہی بزرگوں کا ادارہ ہے اس کی خوب خدمت کرو۔

اس عظیم سانحہ سے ایک ہی دن قبل مؤرخہ ۱۹/۱۱/۱۹۷۱ بروز جمعرات میری ہمشیرہ کے ولیمہ میں حضرت تشریف لائے تھے، بڑا ہی پر مسرت موقع تھا عصر کے بعد بندہ نے حضرت سے موبائل پر رابطہ کیا تو حضرت نے فرمایا کہ میں ضرور آؤں گا اور میرے ساتھ مولانا عرفان مبینؒ اور دیگر حضرات بھی ہوں گے۔ جامعہ کے اساتذہ میں سے حضرت مولانا امداد اللہ صاحب اور حضرت مفتی محمد عاصم ذکی صاحب دامت برکاتہم بھی اس دعوت میں تشریف لائے۔ کھانا شروع ہونے میں حضرت مولانا شہید کا انتظار کیا جا رہا تھا بندہ کے رابطہ کرنے پر حضرت نے فرمایا کہ ہم ناظم آباد پہنچ چکے ہیں لیکن آپ ہمارا انتظار نہ کیجیے کھانا شروع کروادیتے ہیں۔ بندہ نے تعمیل ارشاد میں ایسا ہی کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں حضرت تشریف لے آئے ہم استقبال کے لیے دروازے پر آئے تو سلام کے بعد حضرت نے فوراً کھانے کے بارے میں پوچھا کہ شروع کر دیا کہ نہیں؟ بندہ نے عرض کیا حضرت! الحمد للہ آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔ اس پر حضرت نے خوشی کا اظہار فرمایا۔ اگر میں یہ کہوں کہ مولانا اس تقریب میں بطور مہمان نہیں بلکہ بطور میزبان شامل ہوئے تھے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ اس نکاح، رخصتی اور ولیمہ میں شروع سے آخر تک حضرت مولانا کی سرپرستی ہمیں حاصل رہی۔ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ، حضرت مولانا امداد اللہ صاحب، مفتی عاصم ذکی صاحب، مولانا عرفان شہیدؒ میرے والد محترم اور دیگر حضرات ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا تناول کر رہے تھے اور دل بستگی کا ایک دور دورہ تھا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ حضرت کی آخری زیارت ہے اور اب قیامت تک یہ آنکھیں حضرت کی زیارت سے محروم رہیں گی۔ کافی دیر تک یہ حضرات اس دعوت میں شریک رہے اور پھر اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو گئے اور اس کے بعد تو حضرت وہاں تشریف لے گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ حضرت کی سعید روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور جامعہ اور دین کے جس جس شعبہ میں حضرت کے جانے سے خلا واقع ہوا ہے اپنے کرم سے اس خلا کو پر فرمائے، حضرت کے اعزہ، حضرت کے والدین، جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کو صبر کی توفیق نصیب فرمائے، خصوصیت سے اللہ تعالیٰ میرے استاذ محترم مولانا امداد اللہ صاحب کو صبر نصیب فرمائے کہ مولانا مرحوم سے حضرت کی رفاقت کئی عشروں پر محیط تھی اور اب حضرت کے چلے جانے کے بعد وہ تنہا رہ گئے ہیں۔ اس حادثہ میں جن جن گھرانوں پر قیامت ٹوٹی ہے اللہ سب ہی کو اپنے شایان شان بدلہ نصیب فرمائے۔

حق تلفی ہوگی اگر مولانا کے اس تذکرے میں اپنے دوست مولانا عرفان شہید نور اللہ مرحوم کا تذکرہ نہ کروں کہ وہ اب استاذ جی کے صاحب فی الزوار بھی ہیں۔ مولانا عرفانؒ کو ہمارے استاذ محترم سے بہت محبت تھی اور انہوں نے اپنا آپ گویا استاذ جی کے لیے وقف کر رکھا تھا، جب کہ دوسری جانب استاذ جی کو بھی مولانا مرحوم سے بہت لگاؤ تھا۔ جب بھی مولانا مرحوم پر استاذ جی کی شفقت دیکھی تو ہمیشہ رشک آیا۔ کہتے ہوئے تو عجیب سا لگتا ہے لیکن کہہ ہی دیتا ہوں کہ اگر مولانا عرفان مرحوم اس حادثہ میں شہید نہ ہوئے ہوتے تو حضرت کی جدائی کے صدمہ میں چل بستے۔ لیکن اللہ نے ان کو اس غم سے محفوظ رکھا اور حضرت کے ساتھ ان لازوال نعمتوں میں شریک کر لیا جو خاص اسی کی عطا اور دین ہیں۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

یہ شعر جس کے لیے بھی کہا گیا ہو بہر حال ہمارے مولانا عرفان نور اللہ مرحومؒ اس کے مصداق ٹھہرے ہیں۔ اللہ ان کے پسماندگان کو بھی صبر جمیل نصیب فرمائے۔



بہار آخر شد

مولانا مفتی محمد قاسم عباسی
مہتمم مدرسہ عربیہ شہزادہ گارڈن کراچی



حضرت استاذ محترمؒ کا شروع ہی سے ہمارے عباسی خاندان سے محبت و اخوت کا گہرا تعلق تھا لہذا جامعہ میں داخلہ کے ساتھ ہی حضرت استاذ محترمؒ کی شفقتیں میسر رہیں الحمد للہ یہ بندہ کی خوش قسمتی ہے کہ مادر علمی جامعہ بنوری ٹاؤن میں درجہ اولیٰ سے دورہ تک اکثر درجات میں حضرت استاذ محترمؒ سے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ ۱۹۹۸ء میں جب بندہ اور برادر م مفتی محمد خالد عباسی جامعہ میں درجہ اولیٰ میں داخل ہوئے تو درجہ اولیٰ میں ہمیں استاذ محترمؒ سے تسہیل الحو، ثانیہ میں قرأت الراشدہ، معلم الانشاء، رابعہ میں شرح جامی، خامسہ میں ہدایہ اول، آثار السنن، سابعہ میں مشکوٰۃ اور دورہ میں مسلم شریف پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی یہ حقیقت ہے کہ بندہ اپنے اساتذہ میں سے جن کی تدریس و انداز، تربیت و فراست سے سب سے زیادہ متاثر ہے وہ استاذ محترمؒ ہی کی شخصیت ہے، آپ کو اللہ نے مضبوط علم کے ساتھ ساتھ فراست، دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے اوصاف سے خصوصیت سے نوازا تھا مضمون لکھتے وقت بندہ کے ذہن کی اسکرین پر حضرتؒ کے بے شمار واقعات تسلسل کے ساتھ ابھر رہے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ بندہ حضرتؒ کے کس وصف کا تذکرہ کرے لہذا بندہ چند واقعات پر ہی اکتفاء کرتا ہے۔

تعلق و وفا:

ہمارے والد محترم حضرت مولانا محمد شفیق عباسیؒ کا ۳۰ دسمبر ۲۰۱۲ء شب جمعہ کو انتقال ہوا اور بعد نماز جمعہ جامعہ میں ان کی نماز جنازہ ہوئی تو جامعہ میں تمام اساتذہ تعزیت کے لیے تشریف لائے تھے، استاذ محترم کو بندہ نے اطلاع کے لیے فون کیا تو آپ کا موبائل بند تھا بعد میں معلوم ہوا کہ آپ سفر پر ہیں اور ویسٹ انڈیز تشریف لے گئے ہیں دو دن کے بعد حضرتؒ کا ویسٹ انڈیز سے فون آگیا، تعزیت فرمائی اور تسلی کے کلمات کہے یہ حضرتؒ کا اپنے شاگردوں سے تعلق اور محبت تھی۔

ذکاوت و فراست:

ایک مرتبہ والد مرحوم حج یا عمرہ کے لیے تشریف لے گئے اس دن بندہ اور برادر م محمد خالد جب سبق کے لیے جامعہ پہنچے تو شرقی گیٹ پر استاذ محترمؒ ملے اور پوچھا کیا آپ کے والد حج کے لیے گئے ہیں؟ بندہ نے عرض کیا جی ہاں تو فرمایا میں نے صبح ان کو جامعہ سے گاڑی میں گزرتے ہوئے دیکھا تھا انہوں نے احرام پہنا ہوا تھا تو میں سمجھ گیا کہ بیت اللہ جا رہے ہیں۔

امتیازی شان سے اجتناب:

۲۰۰۳ء میں سادسہ کے سال میں بندہ والد صاحب کے ساتھ حج پر گیا وہاں مکہ مکرمہ میں چھت پر اچانک حضرتؒ سے ملاقات ہوئی بہت خوشی کا اظہار فرمایا کچھ دیر بعد نماز کا وقت ہو گیا چونکہ بندہ کے پاس مصلیٰ تھا تو بندہ نے وہ فوراً استاذ محترمؒ کے سامنے بچھا دیا فوراً فرمایا اسے ترچھا کر کے بچھا دو تا کہ سب کے سامنے آجائے۔

تواضع و کسر نفسی:

اسی سفر حج کا واقعہ ہے کہ بندہ حضرت استاذ محترمؒ کے سامنے مسجد حرام میں چھت پر بیٹھا ہوا تھا اور استاذ محترمؒ کے ہمراہ جامعہ کے استاذ مولانا فیصل خلیل صاحب بھی تھے تو قریب میں ہی مشہور بزرگ اور شیخ طریقت حضرت الحاج واصف منظور تشریف فرما تھے تو مولانا فیصل خلیل صاحب نے استاذ محترمؒ کو اُن کی موجودگی سے مطلع کیا تو استاذ محترمؒ فوراً اُن سے ملاقات کے لیے کھڑے ہو گئے اور جا کر اُن سے ملاقات فرمائی جب کہ حضرت واصف منظورؒ نے جب آپ کو دیکھا تو ایک دم احتراماً کھڑے ہو گئے اور آپ کی انتہائی تعظیم و تکریم فرمائی، یہ استاذ محترمؒ کی تواضع کی واضح مثال ہے۔

اسی طرح بندہ کو یاد ہے کہ جامعہ میں دورانِ تعلیم اکثر شام کو چھٹی میں ہمارے ماموں زاد بھائی مولوی فضل الرحمن عباسی اپنی گاڑی میں استاذ محترمؒ کو صالح مسجد تک چھوڑنے کی خدمت انجام دیتے تھے تو چونکہ ہمارا گھر راستہ میں پڑتا تھا تو ہم گاڑی سے اپنے گھر کے پاس راستے میں اتر جاتے بندہ اکثر اترتے وقت چائے کی دعوت دیتا تو فرماتے ”بھائی جب آپ دعوت کرو گے تو پھر آئیں گے ابھی تو مسجد پہنچنا ہے۔“

جب ہم نے اپنی مسجد، جامع مسجد شہزادہ میں چار سال قبل تعلیم و تربیت کورس کا آغاز کیا تو آپ سے اکثر مشاورت کرتے اور آپ اپنے قیمتی مشوروں

سے نوازتے، ۲۰۱۰ء میں کورس کی افتتاحی تقریب میں تشریف لائے اور مسجد میں خطاب فرمایا اسی طرح ۲۰۱۱ء میں اختتامی تقریب میں تشریف لائے انتہائی پر مغز بیان فرمایا، جب ہم تقریب کے لیے وقت لینے گئے تو فرمایا ”تقریب میں طلبہ سے آیات و احادیث کا ترجمہ لوگوں کے سامنے سنوائیں پھر ان سے تقریب بھی کروائیں اس سے بچوں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور عوام پر بھی اچھا اثر پڑے گا“ چنانچہ اس سال ایسا ہی کیا تو واقعی اس کا بہت اچھا اثر پڑا، ۲۰۱۰ء میں جب والد محترم، اساتذہ اور بزرگوں کے مشورہ سے ہم نے مسجد میں شعبہ درس نظامی کی ابتداء کی اور مدرسہ عربیہ کے نام سے مدرسہ شروع کیا تو اس وقت بھی بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور قیمتی مشوروں سے نوازا نیز ایک مرتبہ دفتر میں جب استاذ محترم کی خدمت میں حاضر تھا تو اچانک بندہ سے مخاطب ہو کر فرمایا اگر آپ دونوں کو کہیں جزوقتی تدریس بھی ملے تب بھی اپنی ترتیب کو جاری رکھیں اور اس کو کبھی ختم مت کریں، نیز اس تعلیمی سال ۲۰۱۲ء کی ابتداء میں بندہ اور برادر م مفتی محمد خالد نے طے کیا کہ مدرسہ کے قدیم اور جدید اساتذہ سے خصوصی گفتگو کے لیے استاذ محترم کو لانا ہے چنانچہ استاذ نے کمال شفقت سے وقت عنایت فرمایا اور مدرسہ تشریف لائے اور دفتر میں اساتذہ سے نہایت قیمتی ارشادات فرمائے۔ نیز ہم نے اس سال باہمی مشورے سے قدیم و جدید اساتذہ کے لیے ایک ہدایت نامہ تیار کیا تھا جس پر اساتذہ سے دستخط کروانے تھے، تو وہ بھی بندہ نے استاذ محترم کو بغرض اصلاح پیش فرمایا تو اس کی ایک ایک شق کو غور سے پڑھا اور بعض شقوں کو بہت پسند فرمایا اور بندہ سے اس کا اظہار بھی کیا۔

غالباً ۲۰۱۰ء میں پشاور میں جمعیت کے زیر اہتمام دیوبند کانفرنس ہوئی جس میں بندہ بھی اپنے ماموں زاد بھائیوں کے ساتھ شریک ہوا اس سفر میں ہم پہلے لاہور پہنچے پھر وہاں سے اسلام آباد پہنچے اور قاری اسد اللہ صاحب کے مدرسہ میں ایک دن ٹھہر کر پھر وہاں سے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ہوتے ہوئے استاذ محترم کے گاؤں بابوزئی مردان گئے وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ استاذ محترم اور ان کے خاندان میں دیگر صفات کے ساتھ ساتھ مہمان نوازی کا وصف بھی بدرجہ اتم موجود ہے، چنانچہ باوجودیکہ ہم آپ کے چھوٹے شاگردوں میں سے تھے انتہائی اعزاز و اکرام فرمایا اور آپ کے برادران اور صاحبزادگان نے بھی بہت تکریم کی۔

حضرت استاذ محترم سے آخری ملاقات شہادت سے کچھ عرصہ قبل جامعہ کے دفتر میں ہوئی جب کہ بندہ کے بہنوئی حافظ محمد عمر ابراہیم جو کہ جوہانسہرگ جنوبی افریقہ سے آئے تھے اور چونکہ ان کے والد مفتی عبداللہ ابراہیم صاحب مدظلہ اور دادا حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن میاں صاحب کا حضرت بنوری سے خصوصی تعلق رہا تھا تو وہ استاذ محترم حضرت مولانا صاحبزادہ سید سلیمان بنوری صاحب دامت برکاتہم (نائب مہتمم و استاذ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی) سے ملاقات کے خواہش مند تھے تو دفتر میں حضرت سے ملاقات ہوئی اور حضرت استاد جی نے بندہ اور برادر م سے دوبارہ والد صاحب سے انتقال کی تعزیت فرمائی اور کافی دیر تک اُن کا تذکرہ فرماتے رہے، یہ ہماری آخری ملاقات تھی کسے معلوم تھا کہ علم و عمل کے اس آفتاب و ماہتاب کو دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

حیف در چشم زدہ صحبت یاد آخِ رشد روئے گل سیر ندیدم و بہار آخِ رشد

اللہ تعالیٰ استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم، استاد جی کے والد محترم حضرت الحاج مشفق الرحمن صاحب دامت برکاتہم، برادران مولانا لطف الرحمن، مولانا احمد الرحمن، مولانا انعام اللہ، صاحبزادگان مولوی مسیح الرحمن، مولوی فصیح الرحمن، مولوی جمیل الرحمن، حافظ بلخ الرحمن، اور استاذ محترم حضرت مولانا امداد اللہ صاحب دامت برکاتہم کو بھی صبر جمیل و اجر جزیل عطاء فرمائے آمین۔



طلباء پر مشفق و مہربان

مولانا محمد آصف

مدرس جامعہ محمودیہ بفرزون



حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ سے میرا بہت خاص تعلق تو نہیں تھا لیکن جب جامعہ بنوری ٹاؤن میں تخصص کے داخلہ کی سعادت ملی تو عرصہ دو سال میں حضرتؒ کی زیارت اور گاہ بگاہ مصافحہ اور مختصر گفت و شنید ہوا کرتی تھی اور اکثر یہ اس وقت ہوتا کہ جب حضرتؒ گھر سے تشریف لاتے تو ہر دوسرے تیسرے دن راستہ میں مصافحہ کرنے کی سعادت ملتی، حضرتؒ بڑے پیار و محبت سے مصافحہ کر کے خیریت دریافت کرتے اور چل دیتے، حضرتؒ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ راہ چلتے ہوئے نظریں نیچی رکھا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود تقریباً ہر طالب علم پر نظر رہتی، ساتھیوں کے کہنے پر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوا لیکن ایک مرتبہ مدرسہ سے باہر دورانِ تعلیم حضرتؒ نے مجھے دیکھ لیا لیکن میں یہ سمجھا کہ حضرتؒ نے نہیں دیکھا کچھ عرصے کے بعد میرے ایک ساتھی جن کا حضرتؒ سے خاص تعلق تھا اُن کے ساتھ حضرتؒ کے گھر پر حاضری ہوئی خاطر تواضع کے بعد بات چیت کا سلسلہ چلا تو ساتھی نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ یہ ہمارے تخصص علوم حدیث کے ساتھی ہیں فرمایا مجھے اچھی طرح معلوم ہے لیکن یہ دورانِ تعلیم باہر ہوتے ہیں تو میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا اور فرمایا ہماری ہر طرف نظر ہوتی ہے، اسی طرح ایک مرتبہ میرے ایک مہمان مجھ سے ملنے کے لیے جامعہ آئے دوپھر آرام کا وقت تھا اور میں اس مہمان کے ساتھ مسجد کے برآمدہ اور دفتر کی کھڑکی کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا اسی دوران حضرتؒ کا وہاں سے گزر ہوا تو میں نے کھڑے ہو کر سلام کیا حضرتؒ نے فرمایا کیا کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا مہمان آئے ہوئے ہیں اُن سے کام ہے اس لیے یہاں بیٹھا ہوں! حضرتؒ نے فرمایا آپ ان کے ساتھ بیٹھے رہیں گے تو سوؤں گے کب؟ اگر اس وقت سوؤں گے نہیں تو دوپھر کی پڑھائی متاثر ہوگی، اندازہ کیا جائے کہ حضرتؒ طلباء پہ کتنا شفیق تھے اب اس کو ہماری بدقسمتی کہیے کہ حضرتؒ سے زیادہ استفادہ نہ کر سکے۔

ایک مرتبہ آپ مدرسہ امام ابو یوسف شادمان ٹاؤن نار تھ کراچی میں شہید ناموس رسالت حضرت مولانا سعید احمد جلاپوریؒ کے برادر کبیر جناب الحاج جام محمد نوازؒ کی وفات کے موقع پر تعزیت کے لیے جامعہ بنوری ٹاؤن کے وفد کے ہمراہ تشریف لائے اس میں آپ کے علاوہ حضرت مولانا محمد انور بدخشانی، حضرت مفتی محمد عاصم زکی، حضرت مولانا سید سلیمان بنوری وغیرہ حضرات تھے، تمام حضرات سے مصافحہ و ملاقات کا شرف حاصل ہوا حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ سے جب ملا تو اچھی طرح پہچان گئے کیا غضب کا حافظہ تھا! جامعہ کے طلباء اور فضلاء کو شکلوں سے اچھی طرح پہچانتے تھے اگرچہ ناموں سے ہر ایک کو نہیں جانتے تھے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ حضرتؒ کے ساتھ رضاء رضوان کا معاملہ فرمائے اور ہمیں ان کا نعم البدل نصیب فرمائے، آمین۔



جامعہ بنوری ٹاؤن کا فیض

مولانا مفتی راشد ابوبکر

رفیق دارالافتاء و استاذ جامعہ فاروقیہ شجاع آباد



بسم الله الرحمن الرحيم

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اما بعد: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل فضل و کمال کی قلت و قدر دانی بیان کرنے کے لئے ایک مثال کے ذریعے امت کو سمجھایا ہے ارشاد مبارک ہے ”انما الناس کالابل المائۃ لا تکاد تجد فیہا راحلۃ“ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ”لوگوں کی مثال ایک سواونٹوں کی طرح ہے جن میں تم سواری کے قابل بمشکل ایک اونٹ پاؤ گے“ یعنی ہزاروں میں کوئی ایک ایسا صاحب فضل و کمال ہوتا ہے جس کو اسوہ اور نمونہ بنایا جائے مگر فضیلت کو کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ ”مثل امتی مثل المطر لا یدری اولہ خیر ام آخرہ“ (ترمذی) یعنی میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے یہ نہیں معلوم کہ اس کا اول بہتر ہے یا آخر۔ یہ امت مرحومہ ہے اس کا کوئی دور خیر سے خالی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ دور اول کی بزرگ ہستیوں کو اگر صحابیت و رفاقت، مدد و نصرت تبلیغ و دعوت، اعانت و نقوبت کا شرف حاصل ہے تو بعد کے امتیوں نے رسالت کو جوں کا توں تسلیم کیا دین کو استحکام و رواج بخشا اور چار داگ عالم میں اس کا پرچار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنے آخری دین متین کی حفاظت کے لئے ایسے علماء کا انتخاب فرمایا جنہوں نے سنت کی پرزور حمایت کی عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردید کی، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی جابر سلاطین کے سامنے کلمہ حق بلند کیا اور اسلام میں نئی قوت و حرکت مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کی۔ یہ افراد ماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے زمانے کے ممتاز ترین افراد تھے جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لئے ان کے پاس کوئی ید بیضاء تھا، یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے بارگراں کو جب انبیاء کرام علیہم التحیات والسلام الف مرآت کے بعد علماء امت محمدیہ کے دوش پر ڈالا گیا تو نہ صرف یہ کہ علماء نے اس کو سر آنکھوں پر عقیدت و احترام سے سجا یا بلکہ انبیاء کرام علیہم التحیات والسلام الف مرآت کے اس حق کو ادا کر کے برگاہ حق میں سرخ رو ہوئے۔ چنانچہ علماء نے اگر اپنی زندگی میں وعظ و نصیحت، درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے ذریعے عامۃ الناس کو ہدایت کی راہیں دکھلائیں تو انکے جانے کے بعد صدیوں تک انکی تصنیفات و تالیفات اور تلامذہ کے ذریعے لوگ ہدایت حاصل کرتے رہے، اپنے دور میں علماء نے زمانے کے تقاضوں کے مطابق احیائے دین کی ایسی مبارک کوششیں کیں جن سے بلا مبالغہ صدیوں تک کروڑوں لوگ مستفید ہوتے رہے تیرہویں صدی میں سرزمین برصغیر پر قیام دارالعلوم دیوبند انہی کوششوں کا تسلسل ہے۔ جو بلاشبہ ایک الہامی طریقہ تھا جو اپنی تاثیر میں اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ جس کو اپنی جامعیت کی بناء پر ام الحسانت ہی کہا جاسکتا ہے چونکہ اللہ کو اپنے آخری دین کی حفاظت کروانا تھی اس لئے یہ مبارک سلسلہ دیکھتے ہی دیکھتے صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب تک اس کی سرحدات پھیل گئیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں مدارس وجود میں آگئے۔ روئے زمین پر مدارس دینیہ کی کثرت کے باوجود مرکزیت دارالعلوم دیوبند ہی کو حاصل رہی جو اب تک بھی باقی ہے اللہ اس کو قیامت کی صبح تک باقی رکھے دارالعلوم دیوبند کے طرز پر بے شمار مدارس وجود میں آئے جن میں سے بعض کا فیض مشرق و مغرب تک پہنچا۔ لیکن دیوبند کے بعد جو مرکزیت تکوینی طور پر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی۔

جو بھی ادارہ قائم ہوتا ہے اس کا عام طریقہ یہ ہوتا ہے کہ چند اہل الرائے ایک جگہ جمع ہو کر باہمی مشورے سے ایک چیز طے کرتے ہیں مگر بنوری ٹاؤن کی تاسیس اس عام طریقے سے ہٹ کر ہوئی۔ بنوری ٹاؤن الہام غیب اور اہل اللہ کے قلوب پر انکشاف و اردات کا نتیجہ ہے، چنانچہ ماہنامہ بینات کے مدیر حضرت مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ رقمطراز ہیں:

”اس جامعہ کی بنیاد و ترقی میں نہ جانے کتنی دعائیں انکی آہ سحرگاہی شامل ہیں اور آج یہ جامعہ زمانے کے بے شمار انقلابات کے باوجود حضرت بنوری قدس سرہ کے اخلاص کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ حضرت بنوریؒ نے اس ادارے کے شروع کرنے سے پہلے نہ جانے کتنے استخارے کئے، دعائیں کیں، غلاف کعبہ پکڑ کر گڑ گڑائے، روضہ رسول کی جالیوں کے سامنے حق تعالیٰ سے التجائیں کیں اہل قلوب سے دعائیں کروائیں، معاملہ فہم مخلصین سے مشورے کئے پھر جب یہ مدرسہ شروع کیا تو نتائج سے بے پرواہ ہو کر ہر طرف سے بے نیاز ہو کر محض اللہ کے بھروسے پر شروع کیا اور پھر انہی دعاؤں، التجاؤں، اللہ کے سامنے رونے اور گڑ گڑانے کا زندگی بھر معمول رہا۔ حضرت کے اخلاص تو کل علی اللہ

ایسا ہو جہاں جامعہ کے تربیت یافتہ اور فضلاء دین کو پھیلا نے اور علم کی اشاعت میں مصروف نہ ہوں۔“ (اشاعت خاص ماہنامہ بینات شہید ناموس رسالت نمبر ص: ۷، ۸)۔

یہی وجہ ہے کہ یہ جامعہ آج بھی حضرت بنوریؒ کی ایک زندہ کرامت کہ جس کو حضرت کی وفات کے بعد سے مسلسل قیامت خیز حادثات کا سامنا ہے۔ اہتمام، نظامت، شیخ الحدیث جیسے اہم اور کلیدی مناصب پر یکے بعد دیگرے کتنی تبدیلیاں آئی ہیں صرف اہتمام میں ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۷ء تک چار تبدیلیاں ہوئی مگر پھر بھی دور اول کے انوارات و برکات کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہر خاص و عام کر سکتا ہے۔ حالانکہ اداروں کے حالات و تاریخ سے واقفیت رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ کسی بھی ادارے میں جب اہتمام و انتظام میں شخصی تبدیلی آتی ہے تو بسا اوقات اداروں کا تشخص تک ختم ہو کے رہ جاتا ہے۔ ۲۰/۱۲/۲۰۱۲ء کو پیش آنے والا حادثہ فاجعہ بھی اپنی قیامت خیزی میں سابقہ حادثات سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جسمیں کاروان بنوری کی متاع عزیز جامعہ کے ناظم تعلیمات و استاذ الحدیث، استاذ العلماء، محبوبنا الفقید، شیخنا الکریم، استاذنا المکرم حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ نے جام شہادت نوش کیا طاب اللہ ثراہ وجعل الجنة مثواه۔

اکابر و اسلاف کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فراغت کے بعد جس کسی سے بھی اللہ نے اپنے دین کی خدمت لی تو زمانہ طالعلمی ہی سے بارگاہ حق کی جانب سے اس کے قسم کے ظاہری و باطنی کمالات سے مکمل طور پر آراستہ و پیراستہ کیا گیا۔ چنانچہ حضرت شہید کو بارگاہ الہی سے تعمیر و ترقی کے ایسے تمام اسباب میسر آئے کہ جنہوں نے استاذ صاحب کو کندن بنا دیا۔ مردان جیسے دور افتادہ شہر سے حضرت کا بنوری ٹاؤن جیسے ادارے میں پہنچنا اور پھر حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ اور حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکنیؒ سمیت تمام مشائخ بنوری ٹاؤن کی صحبت کا میسر آنا اور دل میں اطاعت و خدمت کے جذبہ کی بناء پر مشائخ جامعہ کی سائے میں مردہ بدست زندہ کی مانند تعلیمی سفر طے کرنا وغیرہ ترقی کے ضامن اسباب کا حاصل ہونے میں توفیق الہی شامل حال رہی۔

اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی سے حضرت شہید کو مشائخ جامعہ کا منظور نظر اور معتمد بنایا چنانچہ جب دارالعلوم دیوبند میں تاریخ ساز صد سالہ جشن ہوا جس میں فضلاء دیوبند اور مسلمانان عالم کو پوری دنیا سے مدعو کیا گیا اور فضلاء کو اس موقع پر اعزازی سند اور دستار فضیلت عطاء کی گئی۔ تو بنوری ٹاؤن کے سابق استاذ الحدیث اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر عالی قدر حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کو بھی اس جشن صد سالہ میں فاضل دیوبند ہونے کی حیثیت سے جانا تھا۔ یہ سال حضرت شہید کا درجہ خامسہ کا سال تھا اور حضرت شہید کو بھی حضرت میرٹھیؒ کے ساتھ اس سفر میں رفاقت کی سعادت میسر آئی۔ پروگرام میں جب دستار کی تقسیم شروع ہوئی تو رش بہت زیادہ تھا حضرت میرٹھیؒ کی طبیعت ضعف اور بیماری کی بناء پر اسٹیج پر جانے کی متحمل نہ ہوئی اس لئے حضرت میرٹھیؒ نے استاذ صاحب کو سند و دستار کی وصولی کے لئے بھیج دیا۔ سند وصول کر کے واپس آنے تک حضرت میرٹھیؒ سوچکے تھے صبح جب حضرت میرٹھیؒ بیدار ہوئے تو اٹھتے ہی پوچھا کہ بھی سند کا کیا بنا؟ حضرت شہیدؒ نے فوراً پیش کر دی۔ حضرت میرٹھیؒ نے اس کو انتھائی عقیدت سے لیا اور دعاء دیتے ہوئے فرمایا کہ ”جیتے رہو، جیتے رہو، جیتے رہو“ یہ واقعہ سنا کر استاذ صاحبؒ وجد میں آ کر فرمانے لگے کہ الحمد للہ جی رہے ہیں۔ (راقم کہتا ہے کہ) یہ واقعی جینا تھا کہ یہ واقعہ سناتے وقت حضرت شہید بنوری ٹاؤن کے دارالحدیث میں حضرت میرٹھیؒ کی مسند پر بیٹھ کر حضرت میرٹھیؒ ہی سے پڑھی ہوئی صحیح مسلم کا درس ارشاد فرما رہے تھے۔ اسی سفر کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے کسی شہر کے ایک ادارے میں جانا ہوا۔ جہاں پر اور بھی بہت زیادہ مہمان آئے ہوئے صبح جب مدرسہ کی انتظامیہ سے حضرت بنوریؒ کے حوالے سے تعارف ہوا تو اہل مدرسہ نے ہمارے لئے الگ سے میزبانی کا انتظام کیا۔ ہم ناشتے سے پہلے چہل قدمی کے لئے نکل پڑے تو راستے میں اسی علاقے کے ایک بڑے عالم ملے جب ان کے سامنے تعارف کے دوران حضرت بنوریؒ کا تذکرہ آیا تو وہ فرمانے لگے کہ ”حضرت بنوریؒ.....؟ آہ حضرت بنوریؒ..... اللہ..... اللہ وہ دریا کیسے ہوں گے جن کے قطرے سمندر۔“

۱۹۸۳ء میں فراغت کے بعد جب گھر واپس ہوئے تو والد صاحب کے دوست اور محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر آف ایجوکیشن نے حضرت کو محکمہ تعلیم میں ہی چار ہزار مشاہرہ پر بھرتی کی پرکشش آفر کی اور ادھر اپنے مادر علمی بنوری ٹاؤن سے ۶۰۰ روپے بمع الاؤنس پر مشاہرہ کی آفر ہوئی جو کہ مراعات کے اعتبار سے سرکاری آفر سے سات گنا کم تھی۔ مگر زندگی کے اس عظیم امتحان میں اللہ نے حضرت کی مدد فرمائی اور حضرت نے مرغ پلاؤ پر دال روٹی کو ترجیح دیتے ہوئے بنوری ٹاؤن کی تدریس کو قبول کیا۔

اور پھر جب بنوری ٹاؤن میں آ کر تدریس کی تو حضرت کی خداداد صلاحیت و استعداد کا اعتراف اکابر، مشائخ، اساتذہ اور طلباء سب ہی نے کیا۔ تدریس میں اعدادیہ سے آغاز کر کے اپنے اساتذہ حدیث کی موجودگی میں ہی حدیث کے اسباق تک پہنچنا اساتذہ و مشائخ کی طرف سے عملاً حضرت کے فضل و کمال کے اعتراف کی کھلی دلیل ہے۔ اسی طرح قولاً بھی اساتذہ نے حضرت کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے۔ جیسا کہ بنوری ٹاؤن کے سابق مہتمم و شیخ

الحديث حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ نے اپنی مایا ناز تصنیف ”کشف النقاب عما یقول الترمذی وفی الباب“ میں حضرت کے فضل و کمال اور معاونت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے ”واشکر اخی فی اللہ الشیخ عطاء الرحمن علی بذل جہوہ معی فی تصحیح الاخطاء المطبعية بكل اخلاص ونشاط وبکل تحقیق و تدقیق“۔

اسلاف کی نظر میں حضرت شہیدؒ کے فضل و کمال کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے جس کو مولانا ولی خان المظفر نے روزنامہ اسلام میں لکھے گئے اپنے مضمون ”.....مولانا عطاء الرحمن..... کچھ یادیں کچھ باتیں.....“ میں ذکر کیا ہے ”حضرت مفتی نظام الدین شامزئیؒ کی شہادت کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی ایک مجلس میں جامعہ بنوری ٹاؤن کے حوالے سے کچھ گفتگو ہو رہی تھی اسی اثناء میں حضرت نے فرمایا ارے بھائی مفتی صاحب کا خلا پر ہونا تو یقیناً مشکل ہے لیکن وہاں حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب جیسے لائق فائق حضرات جب تک موجود ہیں فکر کی ضرورت نہیں۔ پھر فرمانے لگے مولانا عطاء الرحمن صاحب بخاری ترمذی سمیت درس نظامی کے ہر فن مولانا مدرس ہیں، میں (مولانا ولی خان المظفر) نے یہ کلمات کسی مناسب موقع پر ان کے سامنے نقل کئے تو جھوم اٹھے اور پھر فرمانے لگے ”من آنم کہ من دانم“ پر حضرت اقدس کے یہ کلمات میرے لئے سرمایہ حیات ہیں۔

سادگی: ۱۹۸۸ء میں حضرت شہیدؒ کا تقرر امام و خطیب کی حیثیت سے صالح مسجد صدر میں ہوا جو کہ کراچی جیسے شہر میں انتہائی سرمایہ دار تاجروں کی آماج گاہ ہے۔ اور اسی مسجد میں شہادت والے دن جمعہ کی نماز کی امامت کروا کے عازم سفر ہوئے اور یہی سفر سفر آخرت ثابت ہوا۔ اتنی بڑی اور پرکشش جگہ کی مسجد کے خطیب ہونے کے باوجود زندگی کا طرز و ریشہ ہی رکھا اور تقریباً ۲۴ سال تک آنے جانے کے لئے کسی پرائیویٹ سواری کا انتظام نہیں کیا بلکہ روزانہ کا آجانا عام پبلک ٹرانسپورٹ پر ہی رہا الا یہ کہ کبھی کسی شاگرد کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ وہ استاذ محترم کو موٹر سائیکل پر لے گیا اور اکثر و بیشتر یہ سعادت حضرت کے شاگرد خاص اور رفیق سفر استاذ محترم حضرت مولانا عبدالغفار صاحب دامت برکاتہم کے حصے میں ہی رہی۔

جامعہ کے ناظم تعلیمات ہونے کے ناطے حضرت کو کراچی میں پھیلی ہوئی جامعہ کی شاخوں کے معائنے کے لئے جانا ہوتا تو وہ بھی موٹر سائیکل پر ہی جاتے حتیٰ کہ جب ملیر شاخ کے استاذ مولانا مفتی سعید احمد مردانی رحمۃ اللہ علیہ کو شہید کیا گیا تو باوجود کہ اس دن ملیر شاخ کے حالات بہت خراب تھے اور جامعہ کی طرف سے جانے کے لئے گاڑی کا انتظام بھی تھا مگر اس دن بھی جنازہ کے لئے موٹر سائیکل پر ہی تشریف لے گئے۔ غرض کہ حضرت نے ساری زندگی کراچی جیسے روشنیوں والے شہر میں اس طرح سادگی سے گزاری کہ قرون اولیٰ کی یاد تازہ کر دی۔

یوں تو حضرت کی ساری زندگی ہی خدمت دین اور حفاظت دین میں گزری ہے مگر عصری اداروں میں پڑھنے والے بچوں کے لئے جو چالیس روزہ دینی تعلیم و تربیت کے نام سے باقاعدہ نصاب مرتب کیا ہے یہ حضرت کا وہ کارنامہ ہے جس سے یقیناً حضرت تاقیامت زندہ رہیں گے۔ اگر ہم حضرت کے صرف اسی کارنامہ کو ہی لے لیں تو اس میں حضرت کی اتنی خوبیاں نظر آئیں گی کہ جن کا احاطہ مشکل ہو جائے گا۔ اس میں حضرت کے اخلاص کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پوری تین کتابوں میں کہیں حضرت کا نام نہیں باوجود اس کے کہ اس میں ساری محنت استاذ محترم کی ہوئی ہے۔ اور پھر مزید برآں یہ کہ اس کے جملہ حقوق طباعت، جامعہ کے نام وقف کر دئے۔ حالانکہ اس کتاب کی طباعت میں بلاشبہ لاکھوں روپے کا سالانہ جائزہ اور حلال نفع تھا۔ جو لوگ استاذ محترم کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ استاذ محترم عیال دار تھے اور کوٹھی، کار اور بنگلے کے مالک نہ تھے۔ اور کراچی جیسے شہر میں اتنی بڑی حیثیت کے باوجود نہ تو اپنے لئے کوئی بینک بیلنس جمع کئے اور نہ ہی کوئی پلاٹ اور دکانیں میراث میں چھوڑیں بلکہ جامعہ کے ایک مختصر سے فلیٹ میں حیات مستعار کی مقررہ ساعات گزار کر اپنی زندگی کو کن فی الدنیا کأنک غریب او عابر سبیل کی عملی تصویر بنادیا۔ حضرت کے اسی اخلاص کی برکت تھی کہ حضرت کا مرتب کیا ہوا چالیس روزہ کورس دیکھتے ہی دیکھتے کراچی کے علاوہ ملک کے دوسرے بے شمار شہروں میں شروع ہونے کے ساتھ ساتھ بیرون ممالک میں بھی شروع ہوا۔ اور اللہ نے اس کو اس قدر مقبولیت سے نوازا کہ ہر سال اس کورس میں شرکت کی وجہ سے سینکڑوں بچے سکول، کالج، چھوڑ کر مدارس سے دینی تعلیم حاصل کر کے عالم، حافظ اور مفتی بن کر دین کی خدمت میں ہمیشہ کے لئے مصروف ہو گئے۔ یقیناً یہ حضرت کے اخلاص ہی کا نتیجہ ہے۔

مدارس دینیہ کی چار دیواری میں جو استاذ و شاگرد کا محبت بھرا تعلق ہوتا ہے اگر اس کو قید تحریر میں لایا جائے تو ایثار و محبت کی ایسی داستانیں مرتب ہو جائیں کہ جن کی نظیر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔ جیسا کہ حضرت مدنیؒ نے دور حاضر کی کیوبا سے زیادہ بدنام زمانہ جیل کالا پانی کو اپنا سکون صرف استاذ کی محبت میں بنایا اور ماضی قریب میں لال مسجد کے خونی آپریشن میں سینکڑوں طلباء طالبات نے استاذ کی جدائی پر موت کو ترجیح دی۔ ہمارے استاذ محترم میں یہ عشق و وفاء

شاگرد کی حیثیت سے اپنے اساتذہ و مشائخ کے ساتھ اور استاذ کی حیثیت سے اپنے تلامذہ کے ساتھ بقیہ خوبیوں کی طرح کمال درجے میں پائی جاتی تھی۔ چنانچہ اپنے اساتذہ و مشائخ کا تذکرہ اس محبت بھرے انداز سے اس کثرت کے ساتھ کرتے تھے کہ سننے والوں کے دلوں میں اسلاف و اکابر کی محبت راسخ ہو جاتی تھی اور باوجود اپنے تمام ظاہری و باطنی کمالات کو اپنی لیاقت، ذہانت اور محنت کوشش کی طرف منسوب کرنے کی بجائے اپنے اساتذہ کی طرف ہی ہمیشہ منسوب کرتے اسی جامعہ کے ساتھ انکی محبت اور تعلق بھی دیدنی تھا جامعہ کے تمام معاملات اور ضروریات کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے اور جو فیصلہ بھی ہوتا اس پر مکمل عمل کرتے۔ مشورے میں طے ہونے والے امور اور اکابر کے فیصلوں پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی کسی فیصلے کی اطلاع یا کوئی انتظامی اعلان لکھ کر دستخط کے لئے حضرت کے پاس لایا جاتا تو استاذ محترم اس کو پڑھنے سے پہلے اس پر دستخط کرتے پھر اس کو پڑھتے اسکی وجہ یہ بتلاتے کہ دستخط پہلے اس لئے کر دیتا ہوں تاکہ جامعہ کے کسی طے شدہ فیصلے سے اختلاف کا خیال بھی دل میں پیدا نہ ہو سبحان اللہ گویا کہ خود بھی اسلاف کی اندھی تقلید کرتے اور دوسروں کو بھی اسی کا درس دیتے۔ اسی تقلید کے بارے میں خود استاذ صاحب کی ہی زبانی یہ واقعہ سنا کہ ”ایک مرتبہ حرمین کے ایک سفر میں ہم ایک بہت ہی تعلق والے شاگرد کے ساتھ مسجد حرام سے نکل رہے تھے اور اس نے میرے جوتے بھی اٹھائے ہوئے تھے اور کسی مسئلہ پر بات چل رہی تھی اور وہ شاگرد اس مسئلہ میں اکابر کی تحقیق کے خلاف کسی متجدد کے افکار سے متاثر تھا اٹھائے گفتگو میں حضرت نے اس سے یہ کہا کہ ہمارے اکابر کی اس مسئلہ میں یہ رائے نہیں اس پر اس شاگرد نے اس متجدد کے دلائل کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا کہ پھر ان کا کیا مطلب ہوگا.....؟ اس کے اس جواب پر حضرت باوجود بہت زیادہ شفیق ہونے کے اس قدر برہم ہوئے کہ اس سے اپنا جوتا بھی لے لیا اور تعلق بھی ختم کر دیا، الغرض اگر حضرت کے حالات و واقعات کو لکھا جائے تو یقیناً یہ ایک ضخیم تصنیف کو محیط ہونگے اس لئے اپنی ان سطور کو اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ اب ہم شاگردوں پر استاذ صاحب کے کیا حقوق ہیں تاکہ ان کو اداء کرنے کی کوشش کی جائے، طالب علمانہ خیال میں ہم پر حضرت کے مندرجہ ذیل حقوق لاگو ہوتے ہیں:

- (۱) روزنہ کی بنیاد پر حضرت سمیت مرحوم اساتذہ کے لئے ایصالِ ثواب کا معمول بنایا جائے جیسا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب معین اللہ بطول حیات سے کئی بار سنا کہ جب سے ہمارے شیخ حضرت بنوریؒ کا انتقال ہوا اس کے بعد سے کبھی کوئی دن ایسا نہیں گزرا جس میں ان کے لئے ہم نے ایصالِ ثواب نہ کیا ہو۔
- (۲) حضرت کے خطبات اور دروس اگر دستیاب ہو جائیں تو انکو کتابی صورت میں مرتب کر کے افادہ عام کے لئے شائع کر دیا جائے۔
- (۳) اور سب سے اہم حق جو ہر تلمیذ پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت کے مرتب کردہ چالیس روزہ دینی تعلیم و تربیت کورس کو اس قدر وسیع پیمانہ پر عام کیا جائے کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں کوئی مسجد ایسی نہ رہے کہ جس میں اس کورس کی کلاس نہ لگے اور نہ ہی کسی عصری ادارے کا کوئی بچہ ایسا رہے جو اس کورس میں شامل نہ ہو۔



حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ ایک شخص... ایک انجمن

مولانا مفتی محمد یاسر عبداللہ

مدرس جامعہ بنوری ناؤن



ہمارے شیخ رحمہ اللہ کی شخصیت اس قدر پرکشش تھی کہ جو ایک بار ملتا آپ کے اخلاق و عادات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا، ہر ایک کا یہ خیال تھا کہ ان کا سب سے زیادہ مجھ سے تعلق ہے اور یوں اس سنت پر ان کا غیر اختیاری عمل تھا۔ برادرِ مولا ناصحی الرحمن کے بقول: شہادت کے بعد جامعہ میں صفائی پر مامور ایک غیر مسلم تعزیت کے لئے آیا، اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا کہ: مجھ سے وہ تعلق رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً چپکے سے مالی تعاون کیا کرتے تھے۔ جامعہ کے ایک ادنیٰ خادم کے ساتھ جب آپ کا یہ معاملہ تھا تو اساتذہ و طلبہ کے ساتھ تعلق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بندہ نے خود عوام الناس میں سے کئی لوگوں کو یہ اظہار کرتے سنا کہ: مولانا ہمارا بڑا خیال رکھتے تھے، کبھی کبھار فون کر کے حال احوال دریافت کرتے، پریشانی اور مسائل سنتے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے تھے، ہماری خوشی غمی میں شریک ہوتے اور ہمیں اپنائیت کا احساس دلاتے تھے۔ طرزِ زندگی میں وضع داری اور احباب و متعلقین کے لئے طرح داری حضرت استاذ جی کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اپنی بے انتہا مصروفیت اور بے شمار مشاغل کے باوجود تعلق داری کا یہ وصف یقیناً ان کی کھلی کرامت تھی۔ میرے محسن و مربی حضرت شیخ عطاء رحمہ اللہ کا ایک نمایاں وصف ”اکابر پر اعتماد“ تھا، آج کا زمانہ فتنوں کا زمانہ ہے، جس میں علمی اور فکری تحریکوں کا ایک طوفان برپا ہے، قلم و قرطاس کے عموم و شیوع کے متعلق لسانِ نبوت کی بیان کردہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوتے دکھائی دے رہی ہے۔

منفرد اسلوب اور پُر فریب طرزِ تحریر کے ساتھ ”تحقیق کے نام پر تشکیک“ کا زہر گھول کر پلانے والے دانشوروں کی ایک کھیپ اُمَنڈتی چلی آرہی ہے، جو پچھلوں کی تحقیقات پر خطِ نِخ پھیر کر اپنی آراء کو نصوص کا درجہ دینے پر مصر ہیں اور آزادی اظہارِ رائے کے دُرُ بانعرے کے ذریعہ مسلمات و مجمع علیہا مسائل کو بھی از سر نو غور و فکر اور ”اجتہاد“ کے لائق قرار دے رہے ہیں۔ حضرت استاذِ محترم نہایت ذکی الحس اور بالغ النظر عالم تھے، گرد و پیش کے احوال، اُٹھتی ہوئی تحریکوں اور نئی تحقیقات پر ان کی گہری نظر تھی، اس لئے وہ خود بھی اپنے آپ کو اکابر کے دامن کے ساتھ باندھے ہوئے تھے اور طلبہ کو بھی اسی کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اپنے درس و بیانات میں اکثر اکابر کے اقوال سناتے اور ان کی عظمت دلوں میں بٹھاتے۔ ایک بار فرمانے لگے کہ: ”میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ انہی اساتذہ سے پڑھ کر جاتے ہیں اور پھر انہی کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔“

اکابر کے مسلک و منہج اور ان کی علمی تحقیقات پر استاذِ جی کو کلی اعتماد تھا، اس سلسلے میں وہ ”متعصب“ تو نہیں تھے، لیکن ”متصلّب“ ضرور تھے۔ ہمارے شیخ رحمہ اللہ (جن کو طلبہ بابوزئی مردان اور اہل خانہ محبت سے ”لالہ جی“ کہا کرتے تھے) میں عشقِ رسالت گوٹ گوٹ کر بھرا ہوا تھا، دورہ حدیث کے سال صحیح مسلم (جلدِ ثانی) کے درس اور دیگر مواقع میں ذکرِ رسالت (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات) پر ان کی ضبط کرتی آنکھیں اس وقت بھی نگاہوں میں گھوم رہی ہیں، اگرچہ اپنی قلبی کیفیات کے انہا کی حد درجہ کوشش فرماتے تھے، لیکن عشق کی خوشبو بھی بھلا چھوٹے بغیر رہتی ہے؟ دلی کیفیت سے قریب بیٹھنے والا ضرور متاثر ہوتا ہے، اپنے لطیف انداز میں رومال سے آنسوؤں کو تودہ پونچھ لیتے تھے، لیکن متاثر ہوتے قلوب کو رونا ان کے اختیار میں نہ تھا، چنانچہ بارگاہِ رسالت سے اس تعلق کا اظہار وقتاً فوقتاً نعتیہ اشعار کی صورت میں ہوتا رہتا تھا، بارہا ان سے یہ شعر سنا جو آج بھی انکے لہجہ کی گھن گرج کے ساتھ کانوں میں گونج رہا ہے:

سنائے قبر میں دکھلاتے ہیں شبیہ نبی
اجل کا اس لئے ہم انتظار کرتے ہیں

آج یقیناً ان کی یہ خواہش پوری ہو چکی ہوگی۔ قدرت نے انہیں آواز بھی خوبصورت دے رکھی تھی، جب کبھی اپنی لے میں ترنم کے ساتھ اشعار سناتے تو اک سماں سا بندھ جاتا تھا اور سامعین بھی اپنے سینوں میں عشق کی چنگاری سلگتی محسوس کرتے تھے اور یہی جذبہ محبت تھا جو انہیں ہر سال کشاں کشاں حرمین شریفین (زادہما اللہ شرفاً) کی طرف کھینچ لے جاتا، جہاں وہ اپنی پیاس بجھاتے اور قلبی تسکین کا سامان حاصل کرتے۔ سفرِ حرمین کو اپنی انہا پسند طبعیت کے موافق حتی الامکان مخفی رکھتے تھے، بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ جامعہ کے اساتذہ کو بھی ان کے حرمین جانے کے بعد سفر کا علم ہوا، دیارِ محبوب کی طرف روانگی کے وقت ان کی کیفیت دیدنی ہوتی تھی، شنیدنی نہیں۔

شعر و شاعری کی بات چھڑی ہے تو آپ کے ادبی ذوق کا تذکرہ بھی مناسب ہوگا، فرمانِ رسالت کے بموجب ”بعض اشعار پُر حکمت ہوتے ہیں“ اور حدود و آداب کی رعایت کے ساتھ ادبی ذوق نعمتِ خداوندی ہے، ہمارے شیخ عطاء رحمہ اللہ پاکیزہ ادبی و شعری ذوق رکھتے تھے، بلا مبالغہ اردو، عربی، فارسی اور پشتو کے ہزاروں اشعار ان کے حافظہ میں محفوظ تھے، موقع کی مناسبت سے اشعار کا برمحل استعمال ان کی گفتگو اور بیانات کو چار چاند لگا دیتا تھا، آج بھی ان کی مترنم آواز میں سننے ہوئے بے شمار اشعار ہیں جو کانوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ ان کا ادبی ذوق صرف شعر سننے سناتے تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ گہرے ادب شناس تھے، ایک بار اردو کے کسی لفظ پر بحث چھڑی تو اپنی رائے کی تائید میں کئی الفاظ پیش کر دیئے جو زبانِ پران کی گرفت کی واضح دلیل ہے۔ عربی ادب میں بھی ان کا اپنا مقام تھا، مختلف لہجوں میں بے تکلف گفتگو پر قادر تھے، درسِ حدیث کے دوران کبھی حدیثِ مبارک میں کوئی غریب لفظ آ جاتا تو برجستہ شعر پڑھ کر استنبہا دفرماتے، ہمارے درسِ نظامی میں شامل کتب مقاماتِ حریری، دیوانِ منتہی اور حماسہ کے بے شمار اشعار نوکِ برزبان تھے۔ اپنے اس ذوق کے باوجود وہ جادہ اعتدال پر قائم تھے، بعض لوگوں پر ادبی ذوق اتنا غالب ہو جاتا ہے کہ قرآن و حدیث میں انہیں وہ لطف نہیں آتا جو شعر و شاعری میں محسوس ہوتا ہے، حضرت استاذِ محترم اس چیز کو قطعاً ناپسند فرماتے تھے، ایک بار ایک فاضل شاگرد نے عرض کیا کہ: استاذِ جی! مجھے آپ سے اشعار سن کر یاد کرنے کا شوق پیدا ہوا، حضرت الاستاذ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”مجھ سے تم نے یہی سیکھا؟ یہ کوئی سیکھنے کی چیز ہے؟“۔ گویا تنبیہ تھی کہ ہر چیز کو اس کا مقام دینا چاہئے، یہ ان کی طبعیت کی اعتدال پسندی کا نتیجہ اور طلبہ کی تربیت کے خاص ذوق کا ایک نمونہ تھا۔

طلبہ کی تربیت کے معاملہ میں ان کا اپنا انداز تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ”استوصوا بہم خیراً“ پر وہ پوری طرح عامل تھے، البتہ جس چیز کو ان کے لئے خیر کا باعث سمجھتے اس کو اختیار فرماتے، ہم طلبہ کی جماعت اپنی کوتاہ فہمی اور کم علمی و لا اُبالی پن کی بنا پر نہ جانے کن کن چیزوں میں اپنا وقت برباد اور علمی و فکری صلاحیتوں کا ضیاع کرتے ہیں، ہمارے شیخ رحمہ اللہ اس سلسلہ میں بے حد حساس مزاج رکھتے تھے، طلبہ کی حرکات و سکنات، وضع قطع اور دیگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگاہ رکھتے اور موقع بموقع تنبیہ و اصلاح فرماتے تھے، اکثر فرماتے تھے کہ: ”اولاد اور طلبہ کی محبت صرف دل میں ہونی چاہئے،

اس کا اظہار ان کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے، چنانچہ اپنی اولاد کی تربیت کے معاملہ میں بھی ان کا منفرد انداز تھا، جس کے اثرات ان کی اولاد پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں اور استاذ محترم حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف خان غزنوی صاحب دامت برکاتہم نے بھی شہادت کی رات تعزیتی مجلس کے دوران اس کا خصوصی ذکر فرمایا تھا۔ اپنے سرانجام دیئے ہوئے کارناموں کے متعلق حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا حال یہ تھا کہ نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پرواہ، بڑی سے بڑی خدمات پر بھی اپنا نام نہ آنے دیتے تھے، بلکہ دیگر رفقا کی طرف منسوب کر دیتے تھے، آج ملک بھر میں سینکڑوں جگہوں پر اسکول و کالج کے طلبہ کے لئے شروع کیا گیا ”چالیس روزہ دینی و اخلاقی تربیتی کورس“ دن دو گنی رات چو گنی ترقی کر رہا ہے، درحقیقت یہ سلسلہ ہمارے شیخ عطاء رحمہ اللہ ہی کی فکر کا نتیجہ تھا، اپنی مسجد (مسجد صالح صدر جہاں امام و خطیب تھے) سے اس کا آغاز کیا، کورس کی کتابیں مرتب کروائیں اور کورس کے دنوں میں جگہ جگہ جاکر جائزہ لیتے، مفید مشوروں سے نوازتے، حوصلہ افزائی کرتے اور کوتاہیوں کی نشاندہی فرماتے، ہر سال جون جولائی کی تعطیلات شروع ہونے سے قبل مختلف مقامات پر کورس کا انعقاد کرنے والے منتظمین و اساتذہ کو جامعہ میں جمع کر کے کورس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے، تدریس کا اسلوب اور دیگر مفید باتیں بتلاتے، یہ ایک پُر کیف مجلس ہوتی تھی، امسال بھی یہ مجلس ۱۹ مئی بروز اتوار کو الحمد للہ! اسی جوش و خروش کے ساتھ منعقد ہوئی، بس نگاہیں حضرت استاذ محترم کی متلاشی رہیں اور دل ان کی کمی کو محسوس کرتا رہا:

بہت لگتا تھا جی ان کی محفل میں وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

اس کورس پر اس قدر محنت و جدوجہد کے باوجود اپنا نام خود لینا تو درکنار کسی سے سننا بھی گوارا نہ تھا، اس کو بانی جامعہ محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ و دیگر اکابر جامعہ کی فکر کا نتیجہ قرار دیتے اور کورس کا نصاب کتابی صورت میں مرتب کروا کر جامعہ ہی کے لئے وقف کر دیا۔ لیکن انھا و غمول کا یہ معاملہ محض اپنی ذات کے ساتھ مخصوص تھا، اپنے پہاڑوں جیسے کاموں کو ذرہ نہ سمجھتے، لیکن دوسروں کے ذرہ کو بھی پہاڑ کا درجہ دے کر خوب حوصلہ افزائی اور تشجیع فرماتے، اصغر نوازی بھی ان کا امتیازی وصف تھا، بندہ تاحیات یہ بات نہیں بھول سکتا کہ دورہ حدیث کے سال استاذ محترم نے اپنے درس صحیح مسلم میں عبارت خوانی کے لئے بندہ کو منتخب فرمایا اور میری بے حد تشجیع فرمائی، ان کے اس عمل نے مجھے کس قدر حوصلہ اور جرأت دی اور آگے بڑھنے کی تحریک پیدا کی، یہ میں اور میرا رب جانتا ہے، نہ جانے کتنی چھپی صلاحیتوں کو ہمیز دے کر نمایاں کیا ہوگا؟ پھر انہوں نے عملی میدان میں آگے بڑھ کر کیا کچھ کارنامے انجام دیئے ہوں گے؟ یہ سب ہمارے استاذ محترم کے نامہ اعمال کا حصہ ہے جس کا صلہ رب انہیں ضرور دے گا، ان شاء اللہ!

صالح مسجد (صدر) جہاں آپ امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، شہر کی مرکزی مساجد میں شمار ہوتی ہے، اس مسجد کی اہمیت کی بنا پر وہ بجا طور پر اس کا حق ادا فرماتے تھے، یہیں سے ۱۹۹۸ء میں ”چالیس روزہ کورس“ کا آغاز کیا جو بعد میں موجودہ شکل تک پہنچا، مسجد کے نمازی بھی آپ سے محبت کرتے تھے، بہت سے لوگ آپ کی اقتدا میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے دور دور سے آتے تھے، ہمارے تھخص کے ایک ساتھی کے قریبی عزیز ہر جمعہ کو صرف استاذ محترم کا بیان سننے اور آپ کی اقتدا میں نماز جمعہ پڑھنے کے لئے حیدرآباد سے سفر کر کے آتے تھے، جمعہ کی نماز کے لئے مسجد کھچا کھچ بھر جاتی، اور نمازیوں کی کثرت کی بنا پر متصل جہانگیر پارک میں بھی ٹینٹ لگا کر صفیں بچھائی جاتی تھیں، اگرچہ وہ معروف معنوں میں جلسے جلوسوں کو گرمانے والے خطیب نہیں تھے، لیکن ”از دل خیزد بردل ریزد“ کے مصداق ان کی دل سے نکلی ہوئی باتیں دلوں پر اثر کرتی تھیں اور عوام الناس اپنی زندگیاں بدلتے تھے۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے کمرے میں ان کی یادگاروں کو دیکھ کر بھی آنکھیں اشک بار ہو جاتی تھیں، سچ یہ ہے کہ:

جہانے را در گروں گرد یک مرد خود آگاہے

آپ کے فیض یافتہ نمازی، دیگر لوگ اور آپ کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں شاگرد، آپ کی نیک صالح اولاد، آپ کا جاری کردہ کورس اور نہ جانے کیا کچھ آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ بھر)



شیخ عطاء کے اوصاف حمیدہ

مولانا طیب زمان

رفیق شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ بیت العلم



ہوے کہے۔ یہ ۱۳۳۰ھ کے دورہ حدیث کے سہ ماہی امتحان کی بات ہے اگرچہ میں نے صرف ایک ہی سال جامعہ میں پڑھا اور استاذ جی سے کوئی زیادہ گفت و شنید نہیں ہوئی، لیکن یہ اُن کی صفت خاصہ تھی کہ وہ اپنی تھوڑی سی ہم نشینی جسے دیتے وہ ان سے بہت کچھ بھانپ لیتا تھا انہوں نے اس پندرہ منٹ کی ملاقات میں مجھے ایسی اپنائیت دی کہ بس میں یوں سمجھا کہ ان کا مجھ ہی سے سب سے زیادہ تعلق ہے، آپؒ میں ایسے اوصاف حمیدہ تھے کہ جن کا ایک وجود میں آج کے دور میں جمع ہو جانا ایک انوکھی بات ہے۔ آپ کے اوصاف میں سے یہ بھی تھا کہ آپ ایک ذی رائے انسان تھے اکثر لوگ اپنے مسائل دنیویہ میں آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور آپ خوب سوچ سمجھ کر مشورہ دیتے اور لوگ آپ کے دیئے گئے مشوروں پر عمل کر کے بہت ہی فائدہ محسوس کرتے۔ مشورہ طلب کیے جانے پر آپ ایسے جوابات دیا کرتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی جیسا کہ آپ نے خود دورانِ درس صحیح مسلم فرمایا کہ ”ایک مولوی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ حضرت! میں امامت و خطابت کرتا ہوں اب سوچ رہا ہوں کہ کاروبار بھی کروں تو میں نے کہا کہ: دیکھو مولوی صاحب کاروبار کرنا کوئی بری چیز نہیں لیکن میری بات یاد رکھنا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”کلما دخل علیہا زکریا المحراب وجد عندہا رزقا“ بس اس ممبر و محراب سے جڑے رہو رزق بغیر فکر اور تگ و دو کے ملتا رہے گا باقی آپ کی مرضی۔

آپ کے اوصاف حمیدہ میں سے ایک وصف یہ بھی تھا کہ باوجودیکہ استاذ جی کی ایک بار عرب شخصیت تھی لیکن نامعلوم ایسی کون سی بات تھی کہ جو علماء اور طلباء کو آپ کی جانب کھینچتی تھی ہر ایک کا استاذ جی سے کسی نہ کسی درجے میں تعلق ہوتا تھا اور استاذ جی بھی جب کسی سے ایک بار ملتے تو برسوں اس کو یاد رکھتے اگر وہ عرصہ دراز بعد بھی حاضر ہوتا تو استاذ جی فوراً پہچان لیتے۔

آپ کے اوصاف حمیدہ میں سے یہ بھی تھا کہ آپ ایک سادہ اور دنیا سے مستغنی انسان تھے اتنے بڑے ادارہ کے ناظم ہونے کے باوجود آپ کے پاس اپنی ذاتی سواری تک نہ تھی۔

من جملہ آپ کے اوصاف حمیدہ میں سے یہ بھی تھا کہ آپ کی شخصیت انتہائی عاجزی اور انکساری والی تھی حتیٰ کہ جب ہم گزشتہ سال ”تبلیغی سال“ میں تھے تو اس دوران رائے ونڈ کا عالمی اجتماع آگیا، تو حضرتؒ بھی تشریف لے آئے اجتماع کے منتظمین نے دیگر اکابرین کے ساتھ خواص کی حویلی میں آپ کے لیے جگہ مخصوص کرنا چاہی مگر آپ نے صاف انکار فرمادیا اور عمومی مجمع کے پنڈال میں قیام فرمایا اور فضلاء کے پاس خود ان کی جگہوں میں ملنے کے لیے تشریف لائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ ایک ملنسار خندہ پیشانی سے ملنے والے، ذی رائے اور عبقری و علمی شخصیت تھے، اللہ جل شانہ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا اور ہم جیسے کئی طلباء اور علماء علمی و روحانی مربی سے محروم ہو گئے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آہ! کاروان بنوری کے حدی خواں

محمد زین العابدین



۲۷ جمادی الاول ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰/۱۲/۲۰۱۲ء بروز جمعۃ المبارک چھ بج کر چالیس منٹ شام کا وقت مسلمانان پاکستان اور بالخصوص جامعہ بنوری ٹاؤن کے لئے ایک جانکاہ صدمہ بن کر آیا۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکیؒ کے شاگرد رشید و فاق المدارس العربیہ پاکستان کی امتحانی و نصابی کمیٹی کے رکن، جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات و استاذ الحدیث، علم و عمل اور اخلاص و للہیت کے پیکر، خوش مزاجی اور نرم خوئی کے خوگر، سادگی، متانت اور نورانیت کے پیکر مجسم، طلباء پر مشفق اور مہربان اور کاروان بنوری کے حدی خواں حضرت مولانا عطاء الرحمن بینظیر انٹرنیشنل انیورپورٹ کے قریب تھانہ کورال چوک کی حدود میں کراچی سے اسلام آباد آنے والا نجی فضائی کمپنی بھوجا انیورلائن کے مسافر طیارے کے گرنے سے اپنی ہمیشہ سمیت سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون! حضرت مولانا کے ساتھ مزید ایک سو ستائیس مسافر بھی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے۔

حضرت بنوریؒ اپنے اس ادارے کی بنیاد کس اخلاص اور قربانی کے جذبہ سے رکھ گئے کہ اس ادارے کی آبیاری اور ترقی شہداء کے خون سے ہو رہی ہے۔

حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ ایک وقت ایک کاماب مدرسہ، زیر دست خطب اور بہتر نظم حال نہ والے ناظم تھے۔ آپ ایک مخلص و ترسوا انسان تھے۔

آپ ایک بہت بڑے ادارے کے ناظم اور صدر کراچی کی معروف مسجد صالح کے امام و خطیب تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ عہدے ایسے ہیں کہ اس میں رہتے ہوئے آدمی کے تعلقات بڑے بڑے عہدیداروں اور مالداروں سے ہو جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے بھی اس قسم کے لوگوں کے ساتھ بہت اچھے مراسم تھے۔ لیکن آپ نے کبھی ان مراسم کو ذاتی تعلقات کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ میری معلومات کے مطابق آپ کی کوئی ذاتی گاڑی یا کوئی ذاتی جائیداد نہیں اور اسی طرح سے بندہ نے کئی دفعہ آپ کو جامعہ سے جامع مسجد صالح صدر نماز پڑھانے کے لئے جاتے ہوئے بسوں میں سفر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ناظم تعلیمات ایک بادشاہ ہوتا ہے اور وہ بھی جامعہ بنوری ٹاؤن کا ناظم تعلیمات۔ لیکن اللہ تعالیٰ استاد محترم کو غریقِ رحمت فرمائے کہ آپ نے ہمیشہ ایک سادہ زندگی گزاری اور دنیا میں ایسے رہے کہ جیسے ایک مسافر رہتا ہے اور ایک سفر ہی میں آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے اور اس حدیث کے صحیح مصداق ہوئے: ”کن فی الدنيا كانك غریب او عابر سبیل“۔

آپ انتہائی بے لوث اور بے غرض خدمت دین انجام دینے والے انسان تھے۔ آپ نے عصری اداروں کے طلباء کو دینی معلومات فراہم کرنے کے لئے ایک نصاب مرتب کیا۔ جسے بفضلہ تعالیٰ بین الاقوامی طور پر بڑی قبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کے متعلق آپ کو حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ نے فرمایا کہ آپ نے یہ نصاب مرتب کیا۔ اس کے بارے میں آپ کو لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے۔ آپ ہر ایک کی بات کو نظر انداز کر کے اس کو جامعہ کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کئی کتب خانہ والوں نے آپ سے رابطہ کر کے رائے دی کہ اس کو ایسا کر لیں و یسا کر لیں۔ اس طرح چھاپ لیں۔ لیکن آپ حضرت مفتی صاحب کی بات پر تادم آخر قائم رہے اور اس کو جامعہ کی مجلس دعوت و التحقیق کے حوالے کر دیا اور اس پر جتنا لاگت آئی اتنا ہی اس کی قیمت رکھوائی۔ یہاں تک کہ اس کتاب پر اپنا نام تک لگوانا گوارا نہ کیا اور اس کتاب کی آمدنی سے ایک پیسے کا مطالبہ نہ کیا،!! کہاں سے لائیں ایسا مخلص انسان؟۔

حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ ۶ اگست ۱۹۶۰ء میں ضلع مردان کے علاقہ بابوزئی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد جناب مشفق الرحمن صاحب ایک مذہبی سوچ اور دیندار شخصیت کے حامل تھے۔ جبکہ آپ کے دادا حضرت مولانا عبدالسبحانؒ سہارنپور کے فاضل تھے آپ نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم شیرگڑھ مردان میں حاصل کی اور ساتھ ساتھ میٹرک بھی کیا۔ بعد ازاں آپ کے دادا نے آپ کو جامعہ بنوری ٹاؤن پڑھنے کے لئے بھیجا۔ آپ نے ۱۹۸۲ء میں یہیں سے فاتحہ فراغ پڑھا اور حضرت مولانا مفتی ولی حسن خان ٹوکنیؒ کی زیر نگرانی تخصص فی الفقہ کیا۔ بعد ازاں آپ کو جامعہ میں تدریس کے لئے منتخب کر لیا گیا تو آپ نے جامعہ ہی کو اپنا مستقر اور مسکن بنالیا۔ جو کچھ تھا آپ کا جامعہ ہی تھا۔ تمام تر صلاحیتیں اور استعدادیں جامعہ کی ترقی کے لئے وقف کر دیں اور مسلسل ۲۷ سال تادم آخر آپ نے جامعہ کی خدمت کی۔ حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ کی بیماری کے بعد مجلس شوریٰ نے آپ کو ناظم تعلیمات کے عہدہ پر مقرر کیا اور واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اس عہدے کا حق ادا کر دیا۔ اگرچہ اس طرح کے مناصب کو قبول کرنا آپ کی طبیعت میں نہیں تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ بندہ آپ سے رخصت منظور کروانے کے لئے حاضر خدمت ہوا تو آپ دفترِ اہتمام کے باہر کھڑے تھے۔ فرمانے لگے آؤ بھائی کھلی کچہری ہے۔ پھر فرمایا کہ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ میں دفتر میں جاؤں۔ مدیرِ تعلیم کی نشست پر بیٹھوں۔ لیکن میرا جی نہیں چاہتا کہ میں یہ کروں۔ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ گھر سے آؤں پڑھاؤں اور چلا جاؤں۔ انتظامی امور میں نہ پڑوں۔ آہ! ایسے لوگ اب کہاں سے لائیں گے۔ بندہ جب بھی آپ کے پاس رخصت کے ارادے سے حاضر خدمت ہوا فوراً رخصت منظور کر لی۔ آپ ایسے مشفق انسان تھے۔

آپ نے مندرجہ ذیل اساتذہ سے احادیث پڑھیں:-

حضرت مولانا مفتی ولی حسن خان ٹوکنیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ، حضرت مولانا بدیع الزمانؒ، حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہؒ، حضرت مولانا محمد امین اور کزن شہیدؒ حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ، اور حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ۔ آپ کو فنِ حدیث سے خصوصی لگاؤ تھا۔ مسلم شریف پڑھاتے ہوئے آپ اکثر حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکنیؒ اور حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ اکثر حدیث کی عبارت آپ خود ہی پڑھتے۔ آپ کی رس گھولتی آواز سے دارالحدیث گونجا کرتا تھا۔ آپ کی آواز دفترِ بینات تک جایا کرتی تھی۔ شعبہ بنات میں بھی بخاری شریف آپ ہی پڑھایا کرتے تھے۔

آپ نے پسماندگان میں اہلیہ محترمہ اور چار صاحبزادے مولانا مفتی مسیح الرحمنؒ، مولانا مفتی فصیح الرحمنؒ، مولوی جمیل الرحمنؒ اور ملیح الرحمنؒ سو گوار چھوڑے

ہیں۔

رفتی واز رفتن تو عالمے تاریک شد

مولانا عزیز احمد یوسف زئی

مدرس شاخ جامعہ بنوری ٹاؤن



۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰/۱۲/۲۰۱۲ء کو بنوری ٹاؤن کے آفتاب، شیخنا و استاذنا شیخ عطاء اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے، ان اللہ وانا الیہ راجعون ان کی موت ایک شخص کی موت نہیں ایک عالم کی موت ہے، ایک فکر کی موت ہے، ایک انجمن کی موت ہے، ایک شیعہ ادب کا بھج جانا ہے، ایک صدائے عزیمت اور ایک لکار کا خاموش ہو جانا ہے۔

دراز قامت، سڈول گھٹا ہوا بدن، گول چہرہ اور اس پر نورانیت کی کرنوں کی بارش کہ دیکھنے والے کا جی چاہے شام و سحر اسے دیکھتا رہوں سیاہ و سفید ڈاڑھی، عقابی آنکھیں، پر گوشت نرم ہتھیلیاں، گرج دار طوفانی لہجہ، خاموش رہے تو ہزاروں سنجیدگیاں ان پر قربان، بولے تو شہد کے قطرے ٹپکائے، سامعین کی نگاہوں کو جانچ کر ان کے دلوں کی تختیوں سے ان کے مقصد کی باتیں کھرچ کھرچ کر اس تسلسل و تشنگی اور سلاست سے بیان کرتے کہ سننے والے مبہوت رہ جاتے اور وقت ایسا گزرتا کہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملتا یہ تھے ہمارے مشفق و مربی استاذ شیخ عطاء رحمۃ اللہ علیہ، رحمۃ واسعۃ۔

بچھڑا کچھ اس اداء سے کہ رت ہی بدل گئی اک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا

مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ ۶ اگست ۱۹۶۰ء کو مردان کے ایک گاؤں بابوزئی میں مشفق الرحمن صاحب کے ہاں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم قاعدہ، ناظرہ اور فارسی ۳/۴ سال کی عمر میں اپنے والد اور دادا سے حاصل کی ۱۹۶۴ء میں محلہ کے اسکول میں داخل ہوئے، ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بابوزئی سے میٹرک امتیازی نمبرات سے پاس کیا، پھر کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے تک عصری تعلیم پرائیویٹ حیثیت میں حاصل کی، دینی علوم کے حصول کے لئے آپ نے دارالعلوم شیر گڑھ مردان کا رخ کیا اور ابتدائی درجات وہاں پڑھے اس کے بعد وراثت انبیاء کا یہ طالب اپنے علم کی پیاس بجھاتا ہوا ایشیاء کی عظیم دینی درس گاہ جامعہ بنوری ٹاؤن پہنچا اور درجہ ثالثہ سے دورہ حدیث تک تمام درجات بنوری ٹاؤن ہی میں پڑھے، ۱۹۸۳ء میں دورہ حدیث سے فراغت کے بعد ۱۹۸۴ء میں مفتی اعظم پاکستان مفتی ولی حسن ٹوکنی سے تخصص فقہ اسلامی کا کورس پڑھا درس نظامی اور تخصص سے فراغت کے بعد آپ نے گلستان بنوری کی آبیاری شروع فرمائی چنانچہ اعدادیات سے لے کر دورہ حدیث تک آپ نے اکثر فنی، ادبی اور فقہی کتب پڑھائیں آپ کے جلالین کے درس کا طلبہ میں بہت شہرہ تھا، مشکوٰۃ شریف، صحیح مسلم شریف اور تفسیر بیضاوی بھی آپ نے ایک عرصہ تک پڑھائیں اور تادم حیات مسلم شریف پڑھاتے رہے اسی طرح بخاری شریف حصہ اول آپ جامعہ کے بنات میں پڑھاتے تھے، درس و تدریس کے ساتھ جامعہ کے دیگر امور کی ذمہ داریاں بھی آپ کے حوالے ہوئیں جن میں نظامت مطبخ، نظامت دارالاقامہ، نظامت تعلیم اور رکنیت شوریٰ کی ذمہ داری بھی شامل تھی جنہیں آپ نے بحسن و خوبی پورا کیا اور نبھایا اور اکابر کی وراثتوں، امانتوں کے صحیح حقیقی حق دار اور جانشین ٹھہرے۔

سلام تا قیامت حشر تک زندہ و پائندہ

تمہاری داستان تاریخ میں درخشنده

دیدہ دل حشر تک آنسو بہاتا جائے گا

موت سے شکوہ رہے گا غم اٹھتا جائے گا

میں اخلاص و وفا، شفقت و محبت، علم و عمل کے اس نور مجسم کی زندگی کے کس کس پہلو کا تذکرہ کروں اور کس کس پہلو سے صرف نظر کروں ان کے تمام اوصاف حمیدہ کو قید قلم میں لانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، اخلاص و وفا کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی جامعہ کے لئے وقف کر دی تھی، سادگی اس قدر تھی کہ باوجود بنوری ٹاؤن جیسے عالمی ادارہ کے ناظم تعلیمات اور استاذ حدیث ہونے کے نام و نمود تصنع اور تکلف اور روایتی شان کے سائے سے بھی کوسوں دور رہتے تھے، آخر عمر تک اکثر عام بسوں اور موٹر سائیکل پر صالح مسجد نمازیں پڑھانے کے لئے تشریف لے جاتے، کسی جگہ کوئی پروگرام ہوتا بغیر کسی سکیورٹی اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے تشریف لے جاتے، نہ ان میں تکلف، نہ تصنع، نہ وہ اس کو کسی اور کے لئے پسند کرتے تھے ’’الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ‘‘ پر اس قدر عمل کا اہتمام تھا کہ ہر کہتر و بہتر کو نصیحت سے نہ رکتے وہ جامعہ کے لئے عطاء من جانب الرحمن تھے، ان کے وجود سے جامعہ کے درود یار منور تھے، وہ جامعہ کا ایک قیمتی سرمایہ تھے، جامعہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی اٹھارہ سالوں کے علاوہ تمام عمر حضرت بنوریؒ کے سرسبز و شاداب باغ بنوری ٹاؤن میں گزاری، جامعہ کی تعمیر و ترقی کے لئے انہوں نے اپنی جوانی خاک کر دی، وہ جامعہ کے لئے وقف تھے، وہ جامعہ کی رونق تھے، وہ جب جامعہ میں چلتے تو جامعہ کے درود یواران کے وجود پر فخر محسوس کرتے، ان کا وجود جامعہ کے لئے ستون کی

مانند تھا وہ جب دارالحدیث میں ”قال رسول اللہ ﷺ“ کا نعرہ مستانہ بلند کرتے تو یوں لگتا کہ ہم کسی اور دنیا میں بیٹھے ہیں ان کی مترنم رس گھولتی آواز کانوں کے راستے دل میں اتر کر پیوست ہو جاتی، بندہ نے شیخ عطاءؒ سے درجہ ثالثہ میں فقہ العرب، درجہ رابعہ میں شرح جامی اور دورہ حدیث میں مسلم ثانی مکمل اور بخاری ثانی کا اکثر حصہ پڑھا اس کے علاوہ درجہ سابعہ میں ایک ہفتہ بیضاوی شریف بھی ان سے پڑھی جس انداز سے وہ درس پڑھاتے تھے اتنی مٹھاس اور چاشنی ہوتی تھی کہ وقت گزرنے اور گھنٹہ گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا خصوصاً جب ادب عربی کا درس دیتے تو طبعیت باغ باغ ہو جاتی وہ ادیب النفس تھے ان کو سینکڑوں اشعار ان گنت ضرب الامثال، بے شمار محاورے اور سینکڑوں تمثیلات زبانی یاد تھیں دورانِ درس موقع کی مناسبت سے ایسے برجستہ اشعار ٹانگتے کہ دل بے اختیار عرشِ عش کر اٹھتا، وہ ایک ماہر فنی عالم، فقیہ اور محدث تھے دورانِ درس ایسے نکات بیان فرماتے کہ عقل حیران رہ جاتی، وہ ایک ماہر مدّرس اور چہرہ شناس استاد تھے دورانِ درس اکثر طلباء کو تنبیہ فرماتے کہ مولوی صاحب! آپ کا دماغ کہیں اور ہے واپس آ جاؤ!، درس میں کمزور غبی اور کند ذہن طلباء کا اس قدر خیال رکھتے کہ بسا اوقات ایک ایک بات کئی کئی دفعہ دہراتے، تحقیقی مزاج اس قدر تھا کہ اگر دورانِ درس کوئی لفظ یا مسئلہ تحقیق طلب آ جاتا تو درس روک کر اس کو حل فرماتے اور اکثر اوقات کتاب بھی منگواتے تھے جب مسئلہ حل ہو جاتا تو پھر درس شروع فرماتے علمی مسئلہ پوچھنے کی نوبت آتی تو بلا جھجک اپنے اساتذہ کے پاس کتاب لے کر پہنچ جاتے اور تشفی فرمالیتے۔

آج شیخ عطاءؒ ہم سے بچھڑ چکے ہیں، وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں، وہ داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے اپنی جان کو جان آفریں کے سپرد کر کے ہمیں اکیلا چھوڑ گئے ہیں، وہ اسلاف کی یادگار تھے، وہ اکابر کی وراثتوں اور امانتوں کے امین تھے، آج بنوری ٹاؤن کی رونقیں پھر کسی شیخ عطاءؒ کے وجود کو ترس رہی ہیں، اس بوڑھی مادرِ علمی (بنوری ٹاؤن) نے سینکڑوں صد مات سہے ہیں مگر جو صد مہ شیخ عطاءؒ کی شہادت سے اس کو پہنچا ہے اس کی تلخیاں برسوں تک محسوس ہوں گی، شیخ عطاءؒ کا نام بنوری ٹاؤن کے درودیوار میں تا ابد گونجتا رہے گا، آنے والی نسلوں کے لئے ان کی زندگی مشعلِ راہ ہے جو شمع انہوں نے روشن کی ہے وہ ابد تک فروزاں رہے گی، وہ آواز آج خاموش ہو چکی ہے جس نے بیس سال تک اپنے درد دل سے بنوری ٹاؤن کو معمور رکھا وہ مسجائے نفس رخصت ہو گیا۔ جس کی صدائے تم سے ان کے ہزاروں شاگردوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے، اس دین کا وجود اللہ تعالیٰ نے شخصیات پر قائم نہیں رکھا ہے لیکن شخصیات کے جانے سے ایک نقصان ضرور ہوتا ہے ایک خلاء پیدا ہو جاتا ہے جس کے پورا ہونے میں برسوں بیت جاتے ہیں آج ان کے بنادل بوجھل، طبعیت اداس اور عالم تاریک نظر آتا ہے، رفتی واز رفتن تو عالمی تاریک شد

مخفلوں کا جو توشہ تھا واحسرتا	قبر کا اسکو دولہا بنایا گیا
اک ماتم بپا ہو گیا ہر طرف	رخ سے اس کے جب سہرا ہٹایا گیا
رشت و درود دیئے، بحر و برود دیئے	چڑھ کے کندھوں پہ جب وہ روانہ ہوا
آگے مسافر کی بارات تھی	پیچھے پیچھے تھا زمانہ روتا چلا
اک عطاءؒ تھا اور گھر سے ایسے چلا	شہر کا شہر جیسے رونہ ہوا



امی غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل

مولانا ولی اللہ چترالی
فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن



۲۰/۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعہ عالم اسلام کی عظیم دینی درس گاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی کے دورہ حدیث کی درس گاہ میں گونجنے والی ایک بارعب اور نہایت دل نشین آواز بھوجا ایرلائن کے حادثے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ کانوں میں رس گھولنے اور دل کے تاروں کو سوز بخشنے والی یہ آواز ہمارے پیارے اور عظیم استاذ اور جامعہ کے اوالعزم ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحبؒ کی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ رات کا پہلا پہر تھا۔ ماحول کو ردائے شب اوڑھے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اک ساتھی آکر بتانے لگے بھوجا ایرلائن کی بروز حادثے کا شکار ہوئی

ہے اور سنا ہے کہ استاذ محترم مولانا عطاء الرحمن صاحب بھی اس میں سوار تھے۔ ظاہر ہے یہ ایک ”سناؤنی“ تھی، مگر دل ایسی خبریں اتنی جلدی کہاں مانتا ہے۔ سودل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے کہ خبر افواہ ہی رہے، حقیقت حال کی دریافت کی فکر میں پڑ گئے۔ مگر افسوس کہ تصدیق ہو چکی کہ استاذ محترم اسی جہاز میں سوار تھے لیکن اب بھی قدرت کے کرشمے کا انتظار ذہن میں جاگزین تھا، کیونکہ خط الرجال کے اس دور میں یکے بعد اکا بر امت کے چلے جانے کے بعد حضرت الاستاذ جیسی باکمال شخصیت کی زمانے کو بالعموم اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ کو بالخصوص ضرورت تھی۔ اس لئے اس بات کا پتا لگنے کے بعد بھی کہ حضرت الاستاذ اس طیارے میں موجود تھے، ان کی زندگی کی امید دعا میں ڈھلی ہوئی تھی۔ جہازوں کے اس قسم کے حادثات میں کسی کا زندہ بچ جانا تو محال ہوتا ہے لیکن تاریخ میں رونما ہونے والا ایک واقعہ بچپن سے ذہن میں نقش تھا، جب ایک دفعہ ہمارے آبائی علاقے چترال جاتے ہوئے ایک طیارہ حادثے کا شکار ہوا۔ اس حادثے کے باوجود ایک بچہ زندہ بچ نکلا تھا، یہ قدرت کا کرشمہ تھا۔ آج ہم بھی اسی طرح کے کسی کرشمے کی دعا کر رہے تھے۔ راقم سمیت کچھ اور طلباء ساتھی جو حضرت الاستاذ کی شاگردی کے شرف سے مشرف تھے، انتہائی بے قراری کے عالم میں نیوز چینلوں کے آگے دوڑاؤ موجود تھے۔ اچانک اسکرین پر آنے والی شہداء کی فہرست میں استاذ محترم کا نام آتے ہی آنکھوں سے اشکوں کی برسات ہو گئی۔ اب اشکوں کے سوا ہمارے پاس کیا رہ گیا تھا اور پھر یہ خواہش بھی حسرتِ ناتمام رہی کہ ایک بار ہی سہی اپنے استاذ کا آخری دیدار کر لوں، کیوں کہ ایسا ممکن نہ رہا تھا۔

ای غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل

می گویمت ثنا و دعا می فرستمت

(اے وہ شخص کہ جو نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود میرے دل کے آس پاس ہے۔ میں برابر تیری مدح کرتا ہوں اور دعاؤں کے تحفے بھیجتا ہوں) حضرت الاستاذ سے میرا استاذ شاگرد جیسا روحانی اور مقدس رشتہ تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میں دنیا کے ان بدنصیب لوگوں میں سے ایک ہوں جن کو بہترین مواقع میسر ہونے کے باوجود ایسی شخصیات سے خصوصی تعلق پیدا کرنے کا ٹھنگ نہیں آتا۔ حضرت الاستاذ سے میرے والد محترم مولانا قاری فیض اللہ چترالی صاحب کے آخر دم تک انتہائی خوشگوار تعلقات رہے۔ خصوصاً جب شروع میں دونوں جامعہ میں استاذ تھے، اس وقت کی یادیں ناقابل فراموش ہیں، جن کے متعلق ہم نے والد صاحب سے بھی اور حضرت الاستاذ سے بھی مختصر ملاقات میں سے بہت کچھ سنا تھا۔

دورہ حدیث سے فراغت کے بعد جب میرا تخصص فی الفقہ کا پہلا سال چل رہا تھا، ایک دن جامعہ کے استاذ مفتی نیاز صاحب دامت برکاتہم مجھے حضرت الاستاذ کے پاس لے گئے اور تعارف کرایا تو استاذ محترم فرمانے لگے کہ تم نے دورہ حدیث ہمارے ہاں کیا اور تخصص کا سال بھی آدھا گزر گیا لیکن ہمارے دوست کے بیٹے ہونے کے باوجود ہم سے کبھی ملے ہی نہیں۔ یہ سن کر سوائے اظہارِ ندامت کے میرے لیے کوئی چارہ نہیں تھا، چنانچہ میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ دوسری ملاقات اسی سال چھٹی کی درخواست کے ساتھ ہوئی۔ میں نے درخواست آگے بڑھائی تو حضرت فرمانے لگے تم خود تو چترال گھومنے جاتے ہو، ہمیں کب لے کر جاؤ گے؟ یہ سن کر سوچا استاذ محترم کو چترال ضرور لے کر جاؤں گا لیکن بوجہ اس شرف سے محروم رہا۔ آخر وہ افسوس ناک گھڑی آگئی، جب استاذ محترم ہزاروں گناہ چاہنے والوں، خاص عقیدت مندوں، جامعہ کے اساتذہ کرام، رفقاء اور فیض یاب ہونے والے ہزاروں طلبہ کو حسرت و یاس کی حالت میں چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

حضرت الاستاذ مولانا بابا عبدالقیوم چترالی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوریٹاؤن کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔ جامعہ جیسے عظیم ادارے میں نظامت کے عہدے کے لئے ان کا چناؤ ان کی شخصیت کی بلندی کا منہ بولتا ثبوت اور جامعہ کی طرف سے اتنے بڑے عہدے کے لئے ان کا انتخاب دراصل ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔

دورہ حدیث کے سال مسلم شریف کے درس کے دوران جہاں حدیث شریف کی تشریح اور مخصوص انداز میں ان کی تلاوت حدیث کی سماعت ہوتی وہیں قیمتی نصائح اور مواظبت بھی استاذ محترم کی زبانی سننے کو ملتے۔ ان کے کچھ نصائح اور دورانِ درس مختلف حوالوں سے کہی گئی سبق آموز باتیں جن کو ڈائری میں محفوظ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، ان میں سے ایک کا تعلق ۲۹ جنوری ۲۰۰۶ء سے ہے۔ اخبارات میں اس وقت کے صدر پاکستان پرویز مشرف کی ایک غیر ملکی دورے کے دوران اپنے ہم منصب کے ساتھ ملاقات کی تصویر چھپی تھی، جس میں پرویز مشرف کتے کا ایک پلا ہاتھوں میں اٹھائے ”روشن خیالی“ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ حضرت نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ”ہمیں ایسی روشن خیالی نہیں چاہیے۔“ پھر حضرت نے مسلم شریف ہاتھ میں اٹھائی اور فرمانے لگے ”ہمارے ہاتھ میں یہ ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔“ ایک اور موقع پر فرمایا ”اپنے اکابر پر اعتماد کرو، جس کو اکابر پر اعتماد کا شرف حاصل ہو جائے، وہ کبھی راہِ راست سے نہیں بھٹکے گا، کیونکہ انسان کی زندگی میں مرورِ ایام کے ساتھ بعض ایسے حالات و واقعات آتے ہیں

جہاں وہ صحیح اور غلط کا تعین کرنے میں غلطی کا شکار ہو جاتا ہے، ایسے مواقع پر اکابر کا اتباع ہی صحیح راستے کا ضامن ہوتا ہے۔‘

حضرت الاستاذ ان گنے چنے افراد میں سے ایک تھے، جو اپنے بے پناہ صلاحیتوں کے ذریعے بلند یوں کو چھوتے ہیں، بلا امتیاز ہر ایک کے دل میں خاص مقام حاصل کرتے ہیں، ان کا اس طرح اچانک چلے جانا پیچھے رہ جانے والوں کے لئے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بنتا ہے اور پھر کسی کا ان کی جگہ لے لینے میں طویل عرصہ لگ جاتا ہے۔ اللہ رب العزت ہمارے اساذ محترم اور ان کے ساتھ طیارے کے سانچے میں شہید ہونے والے تمام مسلمانوں کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے، آمین۔



علم و عمل کا بحر بے کراں

مولوی محمد اسد اللہ غالب بلتستانی

متعلم جامعہ بنوری ٹاؤن



گزشتہ دنوں بھوجا ایئر لائن کے دل خراش فضائی حادثہ میں جہاں دیگر لوگوں کو اپنے پیاروں کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا، وہیں ایشیا کی عظیم دینی درس گاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کو ایک عظیم مربی، مدرس، استاد الحدیث اور انتظامی معاملات میں بے مثال ایک قیمتی گوہر سے محروم ہونا پڑا۔ یہ گوہر ”عطاء الرحمن“ کے نام سے اسم با مسمی تھا۔ ہاں یقیناً! وہ اس عظیم جامعہ کے لئے رب کی عطا تھے، اور وہ اس جامعہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت شہیدؒ نے اپنے دس سالہ نظامت تعلیم کے دوران جامعہ اور اس کی شاخوں کے تعلیمی معیار کو انتہائی بلندی تک پہنچا دیا تھا۔ حضرت شہیدؒ سے جامعہ کے اساتذہ و طلبہ کو انتہائی عقیدت و محبت تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ کی شہادت کی خبر سن کر کتنے ہی اساتذہ و طلبہ دھاڑیں مار کر روتے رہے اور جامعہ کے دارالحدیث میں موجود غم زدہ اساتذہ کی حالت دیکھ کر سخت دل انسان کا دل بھی پسچ ہو کر رہ جاتا اور آنکھ اشکبار اور دل مغموم ہو جاتا، تادم تحریر بھی کتنی ہی آنکھیں حضرت شہیدؒ کی یاد میں پر غم ہیں۔ بقول کسے:

ہر آنکھ اشک بار ہے، ہر دل سو گوار ہے میرا شیخ عطاء کہاں ہے؟ میرا شیخ عطاء کہاں ہے؟

حضرت شہیدؒ نے ۱۹۶۰ء میں مردان کے ایک گاؤں بابوزئی میں اسکول کے ہیڈ پرنسپل مشفق الرحمن کے گھر آنکھ کھولی، اگرچہ آپ کے والد محترم خود تو عالم دین نہ تھے، لیکن آپ کے دادا ہندوستان کے پڑھے ہوئے ایک جید عالم دین تھے، اسی وجہ سے گاؤں میں آپ کا گھر انہی مشہور، اور ”مولوی صاحب کا خاندان“ سے یاد کیا جاتا ہے۔ سن شعور کو پہنچتے ہی شفیق والد نے اسکول میں داخل کروایا اور اپنے ہی زیر سایہ میٹرک تک عصری علوم کی تعلیم دی، اس کے بعد مذہبی ذہنیت کے حامل والد محترم نے آپ کو دینی علوم کے لئے وقف کر دیا۔ آپ نے دینی علوم کی ابتدائی کتب خیر پختہ خواہ (سرحد) میں پڑھیں، اس کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لئے ”مدارس کا شہر کراچی“ کی طرف رخت سفر باندھا اور جامعہ بنوری ٹاؤن میں درجہ ثالثہ میں داخلہ لیا اور اسی جامعہ سے سند فراغت اور تخصص فی الفقہ کرنے کے بعد یہیں سے ہی اپنے استاذوں کے زیر سایہ تدریس کا آغاز کیا۔ اور پھر تادم شہادت اسی جامعہ سے وفاداری نبھاتے رہے، اور پھر اچانک اس پھلتے پھولتے گلشن کو اپنی جدائی کا بوجھل صدمہ دے کر کوچہ آخرت کو روانہ ہو گئے۔

کلیوں کو میں خون جگر دے کے چلا ہوں صدیوں مجھے گلشن کی فضاء یاد کرے گی

حضرت شہیدؒ بچپن سے ہی انتہائی ذہین و فطین، محنتی، شریف الطبع اور خوش طبیعت تھے جامعہ بنوری ٹاؤن کے استاذ، جامع المعقول والمعتول حضرت مولانا رزین شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: ”میں نے اور حضرت شہیدؒ نے جامعہ میں ایک ساتھ داخلہ لیا تھا، آپ اسباق میں انتہائی محنت فرماتے اور اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کرتے تھے، اور اللہ نے آپ کو حسن صوت کے ساتھ عبارت خوانی کا بھی خاص انداز عطا فرمایا تھا، دورہ حدیث کے سال استاذ العلماء مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکنی خصوصی طور پر حضرت شہیدؒ کو عبارت پڑھنے کا فرماتے تھے یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے آپ کی تدریس میں نکھار عطا فرمایا تھا۔ جامعہ کے طلبہ جانتے ہیں کہ حضرت شہیدؒ کے درس میں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ آپ ہر موقع عربی، اردو اور پشتو اشعار، محاورات اور علمی و ادبی چٹکوں کا استعمال فرماتے تھے اور ساتھ ساتھ فرق باطلہ کا بھی انتہائی مدلل انداز میں رد فرماتے تھے۔ آپ کی تدریس میں مہارت اہل علم کے ہاں مسلم تھی، اسی وجہ سے آپ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نصابی کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ اور آپ اصول و ضوابط کے انتہائی پابند تھے، اصول کی خلاف ورزی پر اگرچہ وہ آپ کا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو، نرمی کا معاملہ نہ برتتے تھے۔ حضرت شہیدؒ کے جہاں اندرون ملک

ہزاروں شاگرد ہیں، وہیں بیرون ممالک میں بھی آپؒ کے ہزاروں شاگرد ہیں، جن کی دعوت پر آپؒ نے کئی ممالک کا دورہ فرما کر وہاں کے دینی پروگرامات میں شرکت اور کئی مدارس و مساجد کا افتتاح فرمایا تھا حضرت شہیدؒ کے مزاج میں تصنع، تکلف اور ریا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اتنے بڑے جامعہ کے ناظم تعلیمات ہونے کے باوجود کار، موٹر سائیکل وغیرہ کسی سواری کے بھی مالک نہ ہوئے اور ساری زندگی درویشانہ انداز میں گزار دی۔ حضرت شہیدؒ کے ایک قریبی عزیز نے بتایا کہ ”گاؤں کے عام لوگوں کو حضرتؒ کے اتنے بڑے مقام کا علم نہ تھا، اگرچہ آپؒ سال میں ایک، دو بار گاؤں بھی تشریف لاتے تھے، مگر عام پبلک ٹرانسپورٹ یا کسی جاننے والے دوست کی گاڑی میں تشریف لاتے، لیکن آپؒ کے جنازے میں اتنی بڑی خلقت اور جید علمائے کرام کی شرکت کو دیکھا تو سر پکڑ کر رہ گئے کہ یہ تو بہت بڑے عالم تھے!!“ ایک اور واقعہ بھی جس سے حضرت شہیدؒ کے درویش صفت مزاج کا پتہ چلتا ہے، جو جامعہ کے استاذ الحدیث، شیخ التفسیر مولانا قاری مفتاح اللہ صاحب نے سنایا: ”ایک سال جب میں حج پر گیا، جب کہ میں حضرت مولانا محمد زرولی خان صاحب مہتمم جامعہ عربیہ احسن العلوم کراچی کے گروپ میں شامل تھا، اور ہماری رہائش وغیرہ کا بھی انتظام پہلے ہی سے ہو چکا تھا، اچانک مولانا شہیدؒ سے ملاقات ہو گئی۔ جب میں نے ان سے رہائش کے متعلق پوچھا تو جواب نہ ارد، پھر میں نے حضرت شہیدؒ کو اپنی قیام گاہ میں ٹھہرنے کی دعوت دی، جسے آپؒ نے قبول فرمایا اور چار، پانچ دن ہمارے ساتھ گزارے“۔ سبحان اللہ! کیا عجیب درویشانہ مزاج تھا!۔

حضرت شہیدؒ جامعہ بنوریؒ ٹاؤن سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ، جامع مسجد صالح صدر میں امامت و خطابت کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ آپؒ نے ۲۰ اپریل کو اسی مسجد میں اپنی زندگی کا آخری خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا، پورے خطبہ میں آپؒ نے عوام الناس اور نوجوان نسل کو موت کی تیاری اور توبہ کی تلقین کی، اسی خطبہ کا اقتباس ملاحظہ ہو: ”نوجوانو! توبہ کرو، موت کا کوئی پتہ نہیں، دنیا میں آنے کی ترتیب ہے کہ پہلے باپ آتا ہے پھر بیٹا، لیکن جانے کی کوئی ترتیب نہیں“۔ پھر آپؒ اسی دن ۵ بجے بھوجا ایر لائن میں اپنی نیک سیرت، ہمشیرہ کے ساتھ اسلام آباد کے لئے روانہ ہوئے، کسے معلوم تھا کہ آج علم و عمل کا بحر بیکراں، سراپا عجز و تقویٰ درحقیقت آخرت کا راہی ہو رہا ہے۔

وہ	سرتاج	دیوبند	منع	علم	وعرفان	چھپ	گیا
حکمتوں	کا	بحر	بیکراں	آج	پھر	سے	غزالیٰ
تاریخ	نے	خود	کو	دھرایا	دوبارہ		
ثانی	احمد	الرحمان	چھپ	گیا			

حضرت شہیدؒ کی نماز جنازہ کی امامت اسلام آباد میں قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب دامت برکاتہم اور آپؒ کے آبائی گاؤں میں جہاں آپؒ کا بھی مدفن بھی ہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب مدظلہ نے کی، دونوں جنازوں میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کر کے حضرتؒ سے عقیدت کا ثبوت دیا۔ حضرت شہیدؒ کی شہادت کے بعد استاذ العلماء حضرت مولانا محمد انور بدخشاہی صاحب نے دورہ حدیث کے طلبہ کے سامنے حضرت شہیدؒ سے وابستہ یادوں کے درتچے واکرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

ما	ہرچہ	خواندہ	ایم	فراموش	کردہ	ایم
الا	حدیث	عطاء	کہ	تکرار	میکلیم	

اللہ رب العزت اس فضائی حادثہ میں شہید ہونے والے سب مسلمانوں کی مغفرت اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، اور سب کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نمبر)



تشکر و امتنان

حضرت مولانا امداد اللہ صاحب

استاذ حدیث جامعہ بنوری ٹاؤن



شیخ عطاء الرحمن شہیدؒ کی شہادت کا حادثہ فاجعہ جس طرح جامعہ کے لیے عظیم سانحہ ہے اسی طرح طبعی طور پر خاندان کے لیے بھی بہت بڑا صدمہ ہے اس

صدے میں دنیا بھر سے مختلف حضرات نے خط و کتابت، فون یا تشریف آوری کے ذریعے جامعہ اور خاندان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرمایا اسی طرح کراچی سے کثیر تعداد میں احباب جنازے میں شرکت کے لیے گئے اور پھر تسلسل کے ساتھ تعزیت کا اظہار کرتے رہے اسی طرح راولپنڈی، اسلام آباد کے مختلف حضرات جنہوں مختلف طریقوں سے ہمدردی کا اظہار فرمایا اس کے علاوہ ملک کے کونے کونے سے علماء اور احباب نے جامعہ آکر یا ہمارے دور افتادہ گاؤں آکر اظہار تعزیت کی میں ان سب کا جامعہ کی طرف سے اپنی طرف سے اور مولانا مرحوم کے والد بزرگ وار کی طرف سے اور پورے خاندان کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بلاشبہ جن جن علماء اور صحافی حضرات نے برادرِ مکرم حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب شہید رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے وہ ان کے دل کا درد تھا اور وہ بھی اپنی جگہ تعزیت کے مستحق ہیں ہم ان سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے اپنی اور خاندان کی طرف سے ان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں ان تمام حضرات کی ہمدردی اور تعزیت کے اظہار سے یقیناً مجھے اور پورے خاندان کو تسلی ہوئی ہے ان حضرات کی تحریریں یادگار اور قابل قدر ہیں اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی علمی و قلمی صلاحیتوں میں برکت اور ترقی نصیب فرمائے اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو دونوں جہانوں میں اس حسن اخلاق اور اظہار ہمدردی کا اعلیٰ سے اعلیٰ صلہ عنایت فرمائے، آمین۔

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)

تشکر و امتنان

حضرت مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب
مدیر ماہنامہ بینات و استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن



۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۰/۱۲/۲۰۱۲ء بروز جمعہ کی خونی شام کو نماز مغرب سے کچھ دیر پہلے ہمارے محبت و محبوب، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات، استاذ الحدیث، استاذ العلماء حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ اپنے سفر و حضر کے ساتھی مولانا محمد عرفان جمید میمنؒ اور اپنی بہن سمیت بھوجا ایئر لائن کے طیارہ کے حادثہ میں اسلام آباد ایئر پورٹ کے قریب بستی حسین آباد میں شہید ہو گئے تھے۔ اس الم ناک اور اذیت ناک حادثہ پر جامعہ کے فضلاء، جامعہ کے محبین، مخلصین، متعلقین اور حضرت مولانا مرحوم کے رفقاء، تلامذہ اور احباب نے جس خلوص و اخلاص کے ساتھ اس غم کو اپنا غم جانا اور درد دراز کا سفر طے کر کے حضرت مولانا شہیدؒ کے جنازہ میں شریک ہوئے، اسی طرح ان کے اعزہ و اقرباء سے دلی ہمدردی کے اظہار اور تعزیت کے لئے وہاں پہنچے یا جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں تشریف لا کر یا ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے اکابر جامعہ و اساتذہ جامعہ سے دلی غم کا اظہار اور تعزیت کی یا اب تک اظہار تعزیت کر رہے ہیں۔

ان تمام محبین، متعلقین، علماء و مشائخ اور جملہ احباب کا جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس و شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم، نائب رئیس و استاذ الحدیث جناب مولانا سید سلیمان بنوری صاحب، نو منتخب ناظم تعلیمات مولانا امداد اللہ صاحب، اساتذہ جامعہ، حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے والد گرامی جناب مشفق الرحمن صاحب، مولانا کے برادران گرامی مولانا انعام اللہ صاحب، مولانا لطف الرحمن صاحب، جناب احمد الرحمن صاحب، مولانا حفظ الرحمن اور مولانا شہیدؒ کے صاحبزادگان مولانا مسیح الرحمن، مولانا فصیح الرحمن، مولوی جمیل الرحمن، حافظ ملیح الرحمن یہ سب حضرات اور راقم الحروف تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان کے لئے دعا گو ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو دونوں جہانوں میں بہترین بدلہ اور جزائے خیر عطا فرمائیں اور ہم سب کو ناگہانی آفات و بلیات سے محفوظ فرمائیں۔

قارئین اور جملہ احباب سے درخواست ہے کہ ان شہداء کے لئے ایصالِ ثواب کرتے رہیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں اور ان کو جنت الفردوس کا مکیں بنائیں۔

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)



سوانح

حیاتِ مستعار کی اک جھلک

حضرت مولانا مفتی خالد محمود

نائب رئیس اقراء روضۃ الاطفال



کسی بھی شخصیت کی تعمیر کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن تین اسباب اس میں بنیادی عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس شخصیت کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں: (۱) خاندان، (۲) ماحول، (۳) تعلیم و تربیت۔

(۱) خاندان: حسب نسب کو اگرچہ اسلام نے بہت زیادہ اہمیت نہیں دی اور حسب نسب پر فخر کرنا، اترانا اور اکرنا تو شریعت نے بالکل پسند نہیں کیا اور خاندان و نسب کے مقابلے میں تقویٰ اور پرہیزگاری کو ترجیح دی اور اُسے معیارِ فضیلت قرار دیا، لیکن اس حسب نسب اور خاندانی شرافت اور وجاہت کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا بلکہ بہت سے احکامات میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے خود حضور ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا کہ ”مجھے بنی ہاشم میں سے منتخب کیا گیا، بنو ہاشم کو قریش میں سے منتخب کیا گیا، قریش کو پورے عرب سے اور عرب کو پوری دنیا کے انسانوں میں سے منتخب کیا گیا ہے، اسی لئے کسی بھی ممتاز اور قابل ذکر شخصیت کے پیچھے اس کے خاندان اور گھرانہ کی شرافت و نجابت کا تعلق ضرور ہوتا ہے۔

(۲) ماحول: خود حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”کلّ مولود یولد علی الفطرة الاسلام فابواه یهودانہ أو ینصرانہ أو یمجسانہ“ ہر بچہ فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے اُس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔ یعنی ماحول کا اس پر اثر ہوتا ہے اور وہ بچہ فطرتِ سلیمہ اور صحیح دین پر پیدا ہوتا ہے ماحول کے اثرات سے اس کے خیالات و نظریات اور طور طریقے بدل جاتے ہیں، اس لیے ماحول کا بھی شخصیت کے بننے اور بگڑنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

(۳) تعلیم و تربیت: سب سے زیادہ اثر کسی شخص کے بننے میں اس کی تعلیم و تربیت کا ہوتا ہے اگر تعلیم و تربیت صحیح نہج پر ہو تو آدمی کی شخصیت میں نکھار آ جاتا ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ خود صراطِ مستقیم پر گامزن ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی سیدھے راستے پر ڈال دیتا ہے، جب کہ غلط تعلیم و تربیت آدمی کو گمراہی کے گھڑے میں ڈال دیتی ہے وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کی گمراہی کا بھی سبب بنتا ہے تعلیم و تربیت کا اثر صرف فرد یا افراد پر ہی نہیں ہوتا بلکہ پوری پوری قومیں اس سے متاثر ہوتی ہیں۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے استاذِ حدیث اور ناظمِ تعلیمات، جامعہ کی شوریٰ کے رکن، وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی امتحان اور نصاب کمیٹی کے اہم رکن، ہزاروں علمائے اور طلباء کے دلوں کی دھڑکن، ہر دل عزیز شخصیت حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر ہم نگاہ

خاندان:

مولانا عطاء الرحمن رحمہ اللہ کا خاندان و گھرانہ کوئی مشہور اور معروف گھرانہ نہیں تھا نہ ہی اُن کے گھر کے تمام افراد علم دین کے ماہر تھے مگر اُن کا گھرانہ دین دار ضرور تھا، دین اور اہل دین سے محبت رکھنے والا ضرور تھا، علم دین کا اگرچہ بہت زیادہ ان کے گھرانہ میں چرچا نہیں تھا، لیکن علم دین سے خالی بھی نہیں تھا، آپ کے دادا باقاعدہ عالم دین تھے جس کی وجہ سے آپ کا گھرانہ ’مولوی صاحب کا خاندان‘ کے نام سے مشہور تھا۔
آپ کے دادا جان:

مولانا کے دادا جان حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب بن رحیم اللہ بن شفیق اللہ، جو اپنے علاقے میں باباجی کے نام سے معروف تھے، باقاعدہ عالم دین تھے اور جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کے بعد عالم اسلام کی مایہ ناز درس گاہ مظاہر العلوم سہارنپور کے فاضل تھے، اور آپ بڑے بڑے اکابرین حضرت مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ ایسے جید علماء کے ہم عصر تھے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے شاگرد رشید تھے اور اپنے اکابر کے مسلک و مشرب پر سختی سے کاربند تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا عطاء الرحمن جب درس نظامی سے فراغت پر چھٹیوں میں گھر پہنچے، تو مردان میں ایجوکیشن کے سرکاری محکمہ سے چار ہزار روپے ماہوار ملازمت کی پیشکش ہوئی، جب کہ دوسری طرف آپ کی مادر علمی میں آپ کو چھ سو روپے ماہوار پرتدریس کے لیے منتخب کیا گیا تو آپ کے دادا مرحوم نے اسی موقع پر فرمایا کہ ہمیں سرکاری چار ہزار منظور نہیں، دینی خدمت میں رہ کر جو چھ سو روپے ملیں وہ منظور ہیں، اسی طرح ایک واقعہ اور کہ جس سے آپ کے دادا مرحوم کی اکابرین سے محبت و عقیدت کا پتہ چلتا ہے، ماہنامہ بینات آپ کے گھر ہر ماہ موصول ہوتا تھا ایک مرتبہ گھر کے کسی فرد نے یہ کہا کہ اس ماہ کے رسالے میں یہ جو فلاں مضمون ہے یہ تو پہلے بھی لگ چکا ہے تو دادا صاحب نے فرمایا کہ میں بینات مضامین پڑھنے کے لئے نہیں منگواتا بلکہ اس لیے منگواتا ہوں کہ اس رسالے کی نسبت حضرت بنوریؒ کی طرف ہے، ایسے عظیم دادا کی ابتدائی تربیت آپ کی شخصیت کو نکھارنے کے لیے بنیاد ثابت ہوئی۔
والد محترم:

مولانا عطاء الرحمنؒ کے والد جناب مشفق الرحمن صاحب عالم دین تو نہیں ہیں لیکن دین کی معلومات سے خوب بہرہ مند ہیں، آپ ایک عرصہ تک محکمہ تعلیم مردان میں ملازم رہے، لیکن اپنے عظیم والد ماجد مولانا عبدالسبحان صاحبؒ کی تربیت کا اثر ہے کہ سرکاری محکمہ میں ملازمت کے باوجود طبعیت میں دین داری غالب رہی اور یہی وجہ ہے کہ آج جب بھی مردان ان کی خدمت میں جایا جائے تو علماء، طلباء اور عوام الناس کا ایک مجمع ہر وقت دعاؤں کے لیے ان کی خدمت میں حاضر رہتا ہے اس وقت آپ علاقے کی معزز، بزرگ ترین اور مستجاب الدعوات شخصیت ہیں اللہ تبارک و تعالیٰ عمر میں برکت عطاء فرمائے۔
پیدائش:

حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی پیدائش بروز پیر ۶ اگست ۱۹۶۰ء بمطابق ۱۲ صفر ۱۳۸۰ھ بابوزئی مردان میں ہوئی۔

ابتدائی ماحول:

مولانا عطاء الرحمنؒ نے اسی دینی گھرانے اور دینی ماحول میں آنکھ کھولی، ان کے دادا اور والدین نے نیک ماحول میں ان کی پرورش اور تربیت کی، چنانچہ دینی گھرانوں کی دینی روایت کے مطابق مولانا عطاء الرحمنؒ کو سب سے پہلے قرآن کریم کی تعلیم سے آراستہ کیا گیا اس کے بعد ابتدائی فارسی پڑھائی گئی اور پھر اسکول کی تعلیم دلائی گئی، اسکول کی تعلیم خصوصاً میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے والوں کے خیالات و کردار میں کافی فرق آجاتا ہے اور جدید تعلیم خصوصاً انگریزیت کا بھوت اُن پر سوار ہو جاتا ہے مگر دینی ماحول اور دینی تربیت کا اثر تھا کہ مولانا عطاء الرحمنؒ ان تمام اثرات سے محفوظ رہے۔
تعلیم و تربیت:

میٹرک تک عصری تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ آپ کی خاص ماحول میں تربیت ہوتی رہی بعد ازاں آپ کی دینی تعلیم کا آغاز ہوا اور علاقہ کا مشہور و معروف مدرسہ دارالعلوم شیرگرھ میں آپ کو تعلیم کے لیے داخل کر دیا گیا، حضرت مولانا امین گل اور حضرت مولانا محمد احمد سے ابتدائی درجات وہاں پڑھے مگر قدرت نے ان سے مستقبل میں بڑے کام لینے تھے اس لیے ضرورت تھی کہ ان کی تعلیم و تربیت بھی اسی انداز اور اعلیٰ پیمانہ پر خوبصورت اور قابل تقلید دینی ماحول میں ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن پہنچا دیا تاکہ آپ کی تربیت بہتر طریقے سے ہو اللہ تعالیٰ نے یقیناً آپ کے اندر استعداد و صلاحیت رکھی تھی مگر اس صلاحیت کا ظہور اور آپ کی استعداد کی جلوہ گری جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے وابستگی کے

بعد ہوتی ہے، جامعہ میں آنے سے پہلے آپ کی حیثیت ایک نا تراشیدہ جوہر کی سی تھی کہ اس میں اور عام پتھر میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے، لیکن جب یہ جوہرات جوہری کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ ان کو تراش خراش کر کے ایک خوبصورت شکل عطاء کرتا ہے اور اس میں چھپی ہوئی خوبیوں اور خوبصورتی کو ظاہر کر دیتا ہے، مولانا عطاء الرحمنؒ کے جوہر یہاں آ کر خوب کھلے اور جامعہ کی تعلیم و تربیت کے اثرات روز بروز ظاہر ہوتے چلے گئے۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ انسانیت سازی کی عظیم تحریک:

صرف ایک مولانا عطاء الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کیا اس جامعہ نے سینکڑوں نہیں ہزاروں افراد ایسے تیار کئے جو علمی و عملی دنیا کے افق پرستاروں کی مانند چمکے اور دنیا کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے درحقیقت جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن صرف ایک ادارہ نہیں بلکہ یہ مردم سازی کا کارخانہ ہے جہاں افراد بنائے جاتے ہیں ان کی صلاحیتوں کو نکھارا جاتا ہے بلکہ اسے انسانیت سازی کی عظیم تحریک کہنا چاہئے، جیسا کہ جامعہ کے متعلق برادر م مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب لکھتے ہیں:

”جامعہ علوم اسلامیہ نے ہزاروں افراد تیار کیے جنہوں نے اقطار عالم میں جامعہ کا فیض پہنچایا، اس جامعہ نے ایسی شخصیات تیار کیں جنہوں نے ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے، اس جامعہ نے ایسے عظیم مجاہد تیار کیے جنہوں نے اپنی جدوجہد اور محنت سے ہمیشہ کلمہ حق بلند کیا اور باطل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اس لیے جامعہ ہمیشہ دشمن اور باطل کی آنکھ میں خارجی طرح کھٹکتا رہا اور آج بھی باطل اسے مٹانے کے درپہ ہے، لیکن باطل نہ پہلے اپنی مذموم کوششوں میں کامیاب ہو سکا اور نہ آئندہ کبھی ہو سکے گا، کیونکہ اس جامعہ کی بنیاد اور ترقی میں نہ جانے کتنے اہل اللہ کی دعائیں، اُن کی آہ سحرگاہی شامل ہیں اور پھر یہ حضرت بنوریؒ کے اخلاص کی جیتی جاگتی تصویر ہے، حضرت بنوریؒ نے اس ادارے کے شروع کرنے سے پہلے نہ جانے کتنے استخارے کیے، دعائیں کیں، غلاف کعبہ پکڑ کر گڑ گڑائے، روضہ رسول (ﷺ) کی جالیوں کے سامنے حق تعالیٰ سے التجائیں کیں، اہل قلوب سے دعائیں کرائیں، معاملہ فہم مخلصین سے مشورے کیے، پھر یہ مدرسہ شروع کیا اور جب شروع کیا تو نتائج سے بے پرواہ ہو کر، ہر طرف سے بے نیاز ہو کر محض اللہ کے بھروسے پر شروع کیا اور پھر یہی دعاؤں، التجاؤں، اللہ تعالیٰ کے سامنے رونے اور گڑ گڑانے کا زندگی بھر معمول رہا، حضرتؒ کے اخلاص اور توکل علی اللہ کی برکت کے حضرتؒ کے زمانے سے ہی یہ جامعہ ”اصلہا ثابت و فروعها فی السماء“ کا منظر پیش کر رہا ہے اور روئے زمین کا شاید ہی کوئی خطہ ہو جہاں جامعہ کے تربیت یافتہ اور فضلاء دین کو پھیلانے اور علم کی اشاعت میں مصروف نہ ہوں۔“ (اشاعت خاص ماہنامہ بیانات شہید ناموس رسالت نمبر ص: ۷، ۸)

اور صرف حضرت بنوریؒ کا اخلاص ہی نہیں بلکہ بعد میں آنے والے آپ کے تمام جانشین بھی اسی اخلاص وللہیت، توکل و تقویٰ اور انابت کی صفات سے مالا مال تھے بلکہ علامہ بنوری ٹاؤن سے وابستہ تمام ہی افراد ان صفات سے متصف ہیں اس لیے اس پورے سلسلے کو ہی اخلاصی سلسلہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

بہر حال مولانا عطاء الرحمنؒ نے اس جامعہ میں صرف تعلیم ہی حاصل نہیں کی بلکہ اُن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بھرپور تربیت بھی اس پاکیزہ اور پر خلوص ماحول میں ہوئی پھر مولاناؒ کی خوش قسمتی کہ انہیں حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ جیسے عظیم مفسر، مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکیؒ جیسے عظیم فقیہ، حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ جیسے محدث، حضرت مولانا محمد بدیع الزمانؒ جیسے متبع سنت، حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہؒ جیسے باریک بین، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ جیسے مفکر و دانش ور، حضرت مفتی احمد الرحمنؒ جیسے مدبر و جری، حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ جیسے منتظم و معاملہ فہم، حضرت مولانا محمد امین اور کزنٹی جیسے بزرگ، حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ جیسے شب بیدار، حضرت مولانا محمد سواتیؒ جیسے درویش خدا مست، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر جیسے مشفق و نرم خواہ اور حضرت مفتی رضاء الحق جیسے درویش فقیر منش حضرات کی سرپرستی حاصل رہی جن کی نگرانی میں خوب ذوق و شوق سے تعلیم حاصل کی اور اپنے اساتذہ کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہے، ۱۴۰۳ھ بمطابق ۱۹۸۳ء میں جامعہ سے فراغت حاصل کی اس کے بعد تخصص فی الفقہ میں داخلہ لیا اور فتویٰ نویسی میں مہارت حاصل کی، بعد ازاں تین ماہ کا کورس کرنے کے لیے آپ جامعہ الازہر مصر تشریف لے گئے، جس میں آپ کے ساتھ جامعہ دارالعلوم کراچی کے سابق ناظم تعلیمات، اور موجودہ استاذ الحدیث، ماہنامہ البلاغ کے مدیر حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب ساتھ تھے ان شاء اللہ اس سفر کی کچھ روداد مولانا لکھیں گے، اس کے علاوہ آپ نے پرائیویٹ طور پر کراچی یونیورسٹی سے ایم اے بھی کیا، جب کہ اسی دوران اپنے اساتذہ کے ساتھ اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند میں بھی آپ تشریف لے گئے۔

اکابرین جامعہ کی طرف سے جامعہ میں آپ کا تقرر آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف اور بھرپور اعتماد:

آپ کی صلاحیتوں کا اساتذہ کی طرف سے بھرپور اعتراف اس انداز میں کیا گیا کہ تخصص فی الفقہ سے جب فراغت حاصل کر کے آپ اپنے گھر چھٹیاں

گزارنے گئے تو آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے اساتذہ (جامعہ کی انتظامیہ) نے آپ کا تقرر کیا اور اس کی اطلاع بذریعہ خط آپ کو دی گئی یہ اساتذہ کا آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی تھا اور آپ پر اعتماد بھی اور آپ نے بھی اپنے اساتذہ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی بلکہ اپنی شانہ روز کی محنت اور اپنی مخلصانہ کوششوں سے اس اعتماد میں مسلسل اضافہ کیا فتویٰ نویسی اور ابتدائی درجات کے اسباق سے آغاز کیا اور رات دن کامیابی کے مدارج طے کرتے چلے گئے ناظم دارالاقامہ، ناظم مطبخ، یہاں تک کہ جامعہ کی نظامت تعلیمات کی ذمہ داری بھی آپ کو دے دی گئی اور پھر ایک وقت آیا کہ آپ نے مسندِ حدیث کو رونق بخشی، جامعہ میں آپ نے اعداد یہ سے لے کر دورہ تک تقریباً تمام ہی کتب کا درس دیا جب کہ آخر میں آپ کے زیرِ درس بخاری اور مسلم شریف تھیں۔

اکابرین کی صحبت:

زمانہ طالب علمی سے ہی مولانا عطاء الرحمنؒ حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکنیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ، حضرت مولانا محمد امین اور کزنؒ، حضرت مفتی احمد الرحمنؒ وغیرہم حضرات کی صحبتیں اٹھاتے رہے، لیکن آپ کی شخصیت میں سب سے زیادہ نکھار سال ہا سال تک حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ کی صحبت میں رہنے سے آیا جب کہ حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ بھی آپ سے خصوصی محبت و شفقت فرمایا کرتے تھے، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کے ساتھ آپ کا بیشتر وقت دارالتصنیف میں گزرا کرتا حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی بیشتر کتابوں میں بھی آپ کا تذکرہ کیا ہے، حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ کی شہادت کے بعد آپ نے اپنے دینی و دنیوی امور میں مشورہ کے لیے حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی کو بڑا مان لیا تھا چنانچہ کسی بھی کام میں حضرت مفتی صاحبؒ سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے، جب حضرت مفتی صاحبؒ بھی شہید ہو گئے تو پھر آپ کے لیے کل سرمایہ آپ کے استاذ محترم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہم العالی کی ذات والا صفات تھی، انہی اکابر کی صحبتوں نے آپ کو کندن بنادیا تھا۔

جامعہ کی نظامت تعلیمات:

جامعہ علوم اسلامیہ کی نظامت تعلیم کے منصب پر فائز ہونا کوئی معمولی بات نہیں اور نہ ہی اس منصب کو سنبھالنا ہر ایک کے بس کی بات ہے، ابتداء میں تو اہتمام کے ساتھ ساتھ یہ منصب بھی حضرت بنوریؒ کے پاس ہی تھا بعد میں حضرت مولانا حامد میرٹھیؒ، حضرت مولانا فضل محمد سوئیؒ، حضرت مولانا محمد بدیع الزمانؒ، حضرت مولانا محمد اسحاق صدیقی سندیلوی ندویؒ، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندرؒ، حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہؒ اور حضرت مولانا عبد القیوم چترائیؒ جیسے اساطین علم اس منصب پر فائز رہے اتنی بڑی ہستیوں کے بعد حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کا اس منصب کو سنبھالنا ایک اچھنبے کی بات تھی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ دورانِ سفر میں نے خود حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہم العالی سے بطور حیرت و استعجاب کے پوچھا کہ حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ یہ کام سنبھال لیں گے؟ اور اسے احسن طریقے سے انجام دے پائیں گے تو حضرت ڈاکٹر صاحب نے بڑے اعتماد سے فرمایا تھا کہ ہاں انہوں نے تو یہ کام بہت اچھے طریقے سے سنبھال لیا ہے، یہ تھا اساتذہ کا آپ پر اعتماد اور جس طرح اس سے قبل مولانا عطاء الرحمنؒ افتاء، تدریس وغیرہ دیگر امور میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے اس میدان میں بھی وہ سرخرو اور کامیاب ٹھیرے حالانکہ اس وقت جامعہ میں آپ کے کئی اساتذہ موجود تھے اور آپ کے ہم عصروں کی تو کافی تعداد موجود تھی اس صورت حال میں کام کرنا خاصا مشکل اور دشوار ہوتا ہے مگر آپ نے کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

جامعہ سے وفاداری اور اقرباء پروری سے اجتناب:

مولانا کی تمام تر جدوجہد اور آپ کی سوچ و فکر کا محور اول تا آخر جامعہ علوم اسلامیہ ہی تھا اسی کے لئے سوچتے اسی کے لئے کڑھتے، اسی کی کامیابی و کامرانی کے لیے کوشاں رہتے، نہ اپنے لیے کبھی سوچا، نہ کبھی کچھ چاہا، نہ کوئی ذاتی فائدہ اٹھایا حتیٰ کہ اپنی اولاد کو بھی جامعہ میں نہ لگوا یا حالانکہ ان کے بیٹے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اس قابل تھے کہ انہیں جامعہ میں کوئی ذمہ داری دی جائے اور بہت سارے حضرات نے اس کے لیے سفارشیں بھی کیں، لیکن صرف اس غدشہ کے پیش نظر کہ کوئی یہ طعنہ نہ دے کہ مولاناؒ نے بھی اقرباء پروری اور اپنی اولاد کو نوازنا شروع کر دیا، اس سے اجتناب کیا۔

چالیس روزہ تعلیم و تربیت کورس:

آپ نے عصری اداروں کے طلباء کے لیے اُن کی موسم گرما کی تعطیلات قیمتی بنانے کے لیے ایک مختصر سادہ بینی معلومات سے بھرپور کورس مرتب فرمایا اور یہ بھی آپ کی حسنت میں سے ایک ہے جس کے متعلق آپ کے شاگرد مولانا محمد کامران اجمل لکھتے ہیں:

”حضرت استاذ شہیدؒ کے جہاں اپنے شاگردوں پر احسانات ہیں، وہیں پر عوام اور عصری طلبہ پر بھی بہت احسانات ہیں، جس طرح

انہوں نے جامعہ میں رہ کر درجہ اولیٰ سے دورہ حدیث تک کتابیں پڑھا کر طلبہ کی ضروریات کو پورا کیا، اسی طرح چالیس روزہ تعلیم و تربیت کورس

شروع کر کے اسکول و کالج کے طلبہ کی دینی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش فرمائی، جس طرح جامعہ میں پڑھنے والے ان کے شاگرد حضرت

اسکول، کالج کے طلبہ کی چھٹیوں کو ضائع ہونے سے بچانے اور مسلمانوں کو ان کی بنیادی تعلیمات کی طرف توجہ دلانے کے لئے شروع کیا، اس کورس کی کتابوں کے لکھنے، اس کورس کے مرتب کرنے اور اپنی مسجد صالح میں اسے شروع کرنے اور کتابوں کے چھپوانے کے تمام مراحل کی خود نگرانی کی اور اخلاص کے ساتھ یہ کورس شروع کیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کورس اس قدر پھیلا کہ نہ صرف کراچی، پاکستان بلکہ بعض ممالک میں یہ کورس شروع ہوا اور ہزاروں تشنگان علم نے اس چشمہ فیض سے اپنے آپ کو سیراب کیا اور بہت سارے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا۔ (اشاعت خاص

ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نمبر، ص: ۸۵، ۸۶)

صالح مسجد صدر:

صالح مسجد کراچی کی مصروف ترین جگہ صدر میں واقع ہے اور یہ صدر کی مرکزی مسجد ہے یہاں کی امامت و خطابت ہر ایک کے بس کی بات نہیں، چونکہ مسجد کے قرب و جوار میں بڑا بازار ہے اس وجہ سے ہر طرح کے لوگ وہاں آتے ہیں اور ہر ایک آدمی اپنے ذہن کے اعتبار سے ہر طرح کا مسئلہ امام سے دریافت کرتا ہے، لیکن قربان جائے مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ پر کہ اس طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے، ان کو ناصحانہ مشوروں سے نوازتے، ہر آدمی کو اس کے ذہن کے مطابق سمجھا دیتے اور صحیح دین کی بات اس کے ذہن میں ڈال دیتے، آپ کے جوابات سے ہر شخص خوشی سے نہال ہو جاتا آپ کی امامت و خطابت کا ایک نزالہ انداز تھا اس ترنم اور عشق و محبت سے قرآن کریم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے کہ سامعین ہمہ تن گوش ہو کر آپ کی تلاوت سے محفوظ ہوتے۔ آپ کا ۱۹۸۸ء بمطابق ۱۴۰۸ھ میں اکابرین جامعہ کے حکم سے اس مسجد میں بطور امام و خطیب تقرر ہوا تھا، تادم آخر آپ اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی نبھاتے رہے، اس پورے عرصے میں امام اور مقتدیوں کے درمیان کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا بلکہ وہاں کے لوگ بے انتہاء آپ کے گرویدہ تھے آپ کی شہادت کے موقع پر مقتدیوں کی طرف سے جس غم و افسوس کا اظہار کیا گیا اس سے اس بات کا واضح اندازہ ہو جاتا ہے۔

وفاق کی امتحان کمیٹی کے رکن:

آپ کو وفاق کی طرف سے امتحان کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا وہاں بھی آپ نے جامعہ اور وفاق کی ترقی کے لیے جی جان سے کوشش فرمائی، مولانا امداد اللہ صاحب لکھتے ہیں:

”شیخ عطاء الرحمن شہیدؒ کا مزاج ایک طرف انتہائی نازک اور حساس تھا، مگر دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ ہر معاملے میں جوڑ اور ربط پر زور دیتے تھے، بالخصوص جامعہ اور وفاق المدارس کے قابل مشورہ مسائل میں ہمیشہ اپنا وزن اس پلڑے میں ڈالتے تھے جس میں جوڑ اور اجتماعیت کی شکل نکلتی ہو، وفاق کے معاملات میں اگر کوئی معترض بن کر آتا تو اُسے یہی جواب دیتے کہ: ”وفاق“ کیا ہے؟ وفاق ہمارے اور آپ کے مدرسہ کا نام ہے، اس پر اعتراض کی بجائے اپنا مدرسہ سمجھ کر اس کی بہتری اور ترقی کے لئے مفید مشورے اور تجویز دیں، اپنے آپ کو وفاق کا فریق ثابت نہ کریں، بلکہ رفیق ثابت کریں“۔ شیخ عطاءؒ کی یہ گفتگو شہادت والے جمعہ سے پہلے جمعرات کے دن مختلف مواقع پر ہوتی رہی، پھر اسی رات کو تقریباً گیارہ بجے تک جاری، یہ ہماری طویل نشستوں میں آخری نشست تھی، جس میں اتفاق سے وفاق المدارس ہی کے بعض موضوعات زیر مشورہ تھے، کیونکہ آپ کے سفری پروگرام میں وفاق کی امتحانی و نصابی کمیٹی میں شرکت بھی شامل تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وفاق المدارس کے حوالہ سے اپنے اس مزاج کے برعکس اعتراضات پر اعتراضات کرنے لگے اور میں وفاق کے دفاع میں دلائل دیتا رہا، گفتگو کے آخر میں فرمانے لگے کہ: میں وفاق پر اعتراض نہیں کر رہا تھا، بلکہ آپ سے ان اعتراضات کے جوابات نگوانا چاہتا تھا اور میرا مقصد پورا ہو گیا، الحمد للہ! مجھے ”وفاق“ کے حق میں مناسب مواد مل گیا جو بر موقع استعمال کر سکوں گا، ان شاء اللہ!“۔ (اشاعت خاص ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نمبر، ص: ۳۴)۔

مولانا ولی خان المظفر لکھتے ہیں:

”اور وفاق المدارس کے امور سے متعلق مشاورت و مصاحبت کا تعلق رہا، جو روز بروز گہرا اور بڑھتا ہی رہا، وفاق المدارس کے امتحانی معاملات، امتحان کمیٹی، نصاب کمیٹی، شوریٰ و عاملہ کی مجالس مختلف مراکز امتحان میں ایک ساتھ نگرانی، مختلف مراکز کے دورے ایسے بہت سے امور تھے اُن میں صحبت کے مواقع نصیب ہوئے، مجال ہے کبھی اُن کی پیشانی پر بل نظر آئے ہوں ہر وقت ”قربان زلب یار گے غنجے گے گل“ کی تصویر بنے ہوتے شفقت، مہربانی، اور حوصلہ افزائی جیسی صفات تو اُن کے خمیر کا حصہ تھیں“۔ (اداری صفحہ روزنامہ اسلام، ۱۲۴ اپریل ۲۰۱۲ء)۔

مولانا عطاء الرحمنؒ جس شعبہ میں بھی گئے اور جو ذمہ داری اکابر کی طرف سے آپ کو دی گئی واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اس ذمہ داری کا حق ادا کر دیا اور وفاق کی ذمہ داری آنے کے بعد یہاں بھی آپ کا وہی وصف برقرار رہا مولانا امداد اللہ صاحب اور مولانا ولی خان المظفر کے اقتباسات اس بات کی واضح

دلیل ہیں۔

نکاح اور اولاد:

۱۹۷۹ء بمطابق ۱۳۹۹ھ میں جب آپ درجہ رابعہ سے فارغ ہو کر گھر پہنچے تو والدین نے آپ کی شادی کر دی، آپ کی پھوپھی صاحبہ اور مولانا انعام اللہ صاحب کی والدہ کے ہاں آپ کی شادی ہوئی اور یہاں بھی صرف دین داری کو دیکھا گیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو چار فرماں بردار بیٹوں سے نوازا، سب سے بڑے مولوی مسیح الرحمن ہیں جو ماشاء اللہ جامعہ کے فاضل اور متخصص ہیں اور اپنے گاؤں میں دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اُن سے چھوٹے مولوی فصیح الرحمن ہیں جو اس وقت جامعہ میں تخصص سال دوم میں زیر تعلیم ہیں، اُن سے چھوٹے مولوی جمیل الرحمن ہیں جو جامعہ میں درجہ سادسہ کے طالب علم ہیں، سب سے چھوٹے حافظ ملیح الرحمن ہیں جو جامعہ میں درجہ ثانیہ کے طالب علم ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کے علم و عمل میں برکت نصیب فرمائے اور والد کا صحیح جانشین بنائے۔

حج و عمرہ اور حرمین سے تعلق:

انسان کا خمیر عشق و محبت سے اٹھایا گیا ہے، ہر انسان میں اللہ تعالیٰ نے ایک دھڑکنے والا دل رکھا ہے، حواسِ ظاہرہ کے ساتھ اسے ایک اور حاسہ بھی عطا کیا گیا ہے جسے ہم حاسۃ الفت اور عشق و محبت سے تعبیر کر سکتے ہیں اسلام عشق و محبت کے اس فطری جذبے کو مزید بڑھاتا اور پروان چڑھاتا ہے، انسان کے دل میں آتش شوق مزید بڑھاتا ہے تاکہ وہ معرفت کی اس بلندی پر جا پہنچے جہاں ظاہری چیزیں بے حقیقت اور ہیچ نظر آنے لگیں، اہل محبت اور عشاق کے واقعات، اہل درد و معرفت کی تاریخ اسی فطرت کا اظہار اور اسی سوزِ دروں و شوقِ جنوں کی مرہونِ منت ہے، اسلام کی تمام عبادات میں یہی جذبہ عشق و محبت کا فرما نظر آتا ہے کہ ایک بندہ مؤمن سرِ پائے تسلیم و انقیاد بن کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے، کبھی وہ اس جذبہ کی تسکین اللہ تعالیٰ کے دربار میں دست بستہ کھڑے ہو کر اور اس کے سامنے جبینِ نیاز جھکا کر نماز کی شکل میں تلاش کرتا ہے، تو کبھی بھوکا پیاسا رہ کر روزہ کی صورت میں اور کبھی اس کے لیے اپنا مال و دولت خرچ کر کے زکوٰۃ و صدقہ کی شکل میں تلاش کرتا ہے مگر اس عشق و محبت کا سب سے بڑا مظاہرہ حج و عمرہ میں نظر آتا ہے۔

حج و عمرہ ایک عاشقانہ عبادت ہے کہ ایک بندہ ظاہری تکلفات اور مصنوعی وضع داری سے آزاد ہو کر ایک فقیرانہ لباس پہن کر اپنی زندگی کی لگام عقل سے لے کر دل کے حوالے کر دیتا ہے اور عشاق و محبین کی طرح بادہ پیمائی اور صحرا نووردی کرتے ہوئے لبیک لبیک کی صدائیں بلند کرتا ہوا اپنے محبوب کے گھر پہنچتا ہے، اور دیوانہ وار کبھی اس کے گھر چکر لگاتا ہے کبھی اس کی چوکھٹ سے لپٹ کر روتا ہے کبھی اس کے غلاف کے آنچل میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، کبھی دیوانہ وار اس کے گھر سے چمٹتا اور لپٹتا ہے، کبھی اس کے بوسے لیتا ہے، اس عشق و محبت کے اظہار کا مرکز اللہ تعالیٰ نے اسی بیت اللہ کو بنایا ہے، جو تجلیاتِ الہی کا خاص مرکز و منبع ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کا احترام اس گھر کی حاضری کا شوق رکھا ہے یہ کسی میں کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ، لیکن ہوتا ضرور ہے، حج بیت اللہ میں اللہ تعالیٰ نے غضب کی جاذبیت و کشش رکھی ہے، وہاں قدم قدم پر عشق و محبت کی پر بہار منزلیں طے ہوتی ہیں، یوں تو ہر عبادت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اظہار ہوتا ہے اور ہر عبادت اللہ تعالیٰ کی رضا و رضوان کے حصول کا موجب ہے لیکن اس بندگی اور عبدیت و اطاعت کا سب سے زیادہ اظہار حج میں نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اہل قلوب ”اولیاء اللہ“ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے جن کو اللہ تعالیٰ سے خاص قرب و تعلق ہوتا ہے وہ ہمیشہ اس موسم حج کے انتظار میں شب و روز گزارتے ہیں اور جب یہ موسم عشق و محبت آ جاتا ہے تو وہ لبیک لبیک کا ترانہ پڑھتے ہوئے اپنے رب کے حضور جا پہنچتے ہیں۔

جس طرح بانی جامعہ حضرت بنوریؒ، اور دیگر اکابر حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکنیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ، حضرت مولانا عبد القیوم چترائیؒ، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئیؒ، حضرت مفتی محمد جمیل خانؒ، حضرت مولانا سعید احمد جلالپوریؒ وغیرہم حضرات کو حرمین سے والہانہ عقیدت و محبت اور حج و عمرہ سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا وہاں کی حاضری ان حضرات کے لیے صرف سعادت ہی نہیں بلکہ روحانی توانائی کا کام دیتی تھی بعینہ یہی حال حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کا بھی تھا آپ بھی حرمین شریفین سے خاص تعلق رکھتے تھے متعدد مرتبہ حرمین کی حاضری کی سعادت حاصل کی اور آخر کے سالوں میں تو تقریباً ہر سال بلکہ بعض دفعہ سال میں دو دو مرتبہ یہ سعادت حاصل کی، مولانا کا یہ یقین تھا کہ یوں تو اللہ تعالیٰ نے ہر عبادت کے لیے قدم قدم پر رحمت و عنایت اور اجر و ثواب کے وعدے کر رکھے ہیں لیکن تمام عبادات میں حج بیت اللہ کی شانِ نزالی ہے، حج گویا دبستانِ عبدیت کا آخری نصاب ہے، جس کی تکمیل پر بارگاہِ خداوندی سے رضا و خوشنودی کی آخری سند عطاء کی جاتی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”حج

مہرور کا بدلہ تو بس جنت ہی ہے، یعنی حج مہرور ایک ایسی شاندار عبادت ہے کہ جنت کے علاوہ اس کا اور کوئی بدلہ ہو ہی نہیں سکتا مگر حج مہرور کیا ہے؟ حج مہرور یہ ہے کہ اس میں گناہ کی آلودگی اور ریا کا شائبہ نہ ہو، پورے سفر حج میں اللہ کی نافرمانی سے بچا جائے، محض اللہ کی رضا کی خاطر حج کیا جائے، بے شک اس شرط کا نبھانا مشکل ہے، مگر ہمارے مولانا عطاء الرحمنؒ حج اسی طرح کا ہوتا تھا آپ محض اللہ کی رضا کے لیے حج کرتے، ریاکاری سے بچتے، جوں جوں ماہ مبارک قریب آتا، آپ کے دل میں حاضری کے شوق میں اضافہ ہو جاتا، دیا ر محبوب کی آرزو میں دل مچلنے لگتا، اور پھر جب حج کا زمانہ آ جاتا تو احرام کی چادریں پہنتے ہی تڑپ میں اضافہ ہو جاتا، حاضری کے لیے بے تاب بیٹھ جاتی، وصال کی آتش شوق بھڑک اٹھتی، ایک عاشق زار کی طرح قلب تپاں اور دل سوزاں لے کر ارحم الراحمین کی دعوت پر شاہی دربار میں حاضری دے کر اپنے لیے تسکین قلب تلاش کرتے اور اپنے جگر کی پیاس بجھاتے۔ دیگر اوصاف و کمالات:

خود داری، نازک مزاجی اور حساسیت حد درجہ آپ کے اندر تھی مگر طلباً اور اساتذہ میں آپ بے حد مقبول تھے حالانکہ اس طرح کے لوگ خود بھی دوسروں سے شاکر رہتے ہیں اور دوسرے بھی ان کی شکایتیں کرتے نظر آتے ہیں مگر یہاں شکوہ شکایت کی بجائے ہر دل عزیزی غالب تھی اور اس ہر دل عزیزی میں آپ کی تواضع اور منکسر المزاجی کا بہت بڑا دخل تھا، آپ نے اپنے کو کئی پردوں میں چھپا رکھا تھا مگر آپ کی شہادت جو کہ ۲۰/ اپریل ۲۰۱۲ء بمطابق ۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بروز جمعہ شام کے وقت طیارہ حادثہ میں ہوئی اس پر جو اظہار رنج و غم ہوا جس طرح ایک دنیائے اسے اپنا غم سمجھا اور آپ کے جنازے میں ایک خلقت کا ہجوم اور بے تابانہ شرکت نے یہ پردہ بھی چاک کر دیا اور آپ کے مرتبہ و مقام کو واضح کر دیا اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے، کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آپ کے درجات کو بلند فرمائے، آپ کی مساعی جلیلہ کو قبول فرمائے۔

شہادت:

۲۰/ اپریل ۲۰۱۲ء بمطابق ۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بروز جمعہ مولانا نے اپنے تمام کام معمول کے مطابق پورے کیے آپ کی شام کی فلائٹ تھی اسلام آباد کے لیے، وہاں سے پھر مردان جانا تھا ہمشیرہ کو چھوڑنے کے لیے، لیکن جہاز کا حادثہ ہو گیا اور مولانا عطاء الرحمنؒ اپنے معاون مفتی عرفان حمید مینؒ اور اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ شہادت کا مرتبہ پا کر مکین غلہ آشتیاں ہو گئے، جیسے ہی مولانا کی شہادت کی اطلاع ملی جامعہ بنوری ٹاؤن میں لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا، جس کو دیکھو غمگین اور روتا ہوا نظر آ رہا تھا پورا جامعہ سوگ وار تھا، درود یوار اداس تھے، اور ایک مرتبہ پھر مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ، مفتی عبدالسمیعؒ، مولوی سید محمد بنوریؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئیؒ، مفتی محمد جمیل خانؒ، مولانا سعید احمد جلاپوریؒ اور مولانا ارشاد اللہ عباسیؒ کے خدمات کی یاد تازہ اور پچھلے زخم پھر سے ہرے ہو گئے، جامعہ ایک بار پھر سے ویران ہو گیا، دارالحدیث کی رونقیں ماند پڑ گئیں، مسند مدیر التعليم روتی ہوئی نظر آئی، صالح مسجد کے ممبر و محراب مولانا کی راہ تکتے ہوئے نظر آئے، لیکن بہر حال خدائی فیصلوں سے کسی کو مفر نہیں۔ نماز جنازہ و تدفین:

شہادت کے اگلے دن بروز ہفتہ مسجد فاروق اعظم اسلام آباد میں آپ کی نماز جنازہ حضرت مولانا فضل الرحمنؒ نے پڑھائی جب کہ اسی رات آپ کا دوسرا جنازہ مردان بابوزئی مدرسہ خلفائے راشدین میں ہوا جس کی امامت حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب نے فرمائی دونوں جنازوں میں ایک خلقت جمع تھی، ہر آنکھ اشک بار تھی، ہر شخص مغموم تھا، بعد ازاں آپ کو مولانا داماد اللہ صاحب کا قائم کردہ ادارہ مدرسہ خلفائے راشدین کے قریب آبائی قبرستان کے احاطے میں مفتی عرفان حمید مینؒ اور آپ کی ہمشیرہ سمیت سپرد خاک کر دیا گیا۔ اللھم اغفر لھم و ارحمھم۔

آپ کی شہادت، آپ کی موت ایک بے بسی اور عاجزی و لاچاری کی موت تھی اور ایسی موت پر صبر آہستہ آہستہ ہی آتا ہے، لیکن آپ کے والد، آپ کے گھر والے، آپ کی اولاد اور آپ کے بھائیوں نے اس موقع پر جس صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا وہ یقیناً دین سے محبت اور دینی تربیت کا ہی ثمرہ ہے، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو صبر جمیل اور اس صبر پر اجر جزیل عطا فرمائے ان کی اولاد اور ان کے گھر والوں کی خزانہ غیب سے کفالت فرمائے، آمین۔

بے پناہ قوت حافظہ کے مالک، مالی معاملات میں زبردست احتیاط کرنے والے، اعلیٰ درجہ کے تقویٰ والے، جامعہ سے بے پناہ وفاداری کرنے والے، تواضع و عاجزی اور دنیا سے بے رغبتی رکھنے والے، اکابر کے مسلک و مشرب پر متصلب، اخلاص و للہیت کے حامل، تحقیقی مزاج رکھنے والے، طلباً پر بے حد مشفق و مہربان، سنجیدگی و وقار اور رعب و کشتش والی شخصیت کے مالک، خود داری، نازک مزاجی اور حساسیت حد درجہ کی رکھنے والے مولانا عطاء الرحمنؒ ایک عظیم انسان تھے ان مختصر اوراق میں ہم ان کے ہمہ جہتی کمالات کا تذکرہ نہیں کر سکتے، بہر حال یہ تو ان کی حیات مستعار کی ایک جھلک تھی جو ذکر کردی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کاروان بنوری ٹاؤن کی متاع عزیز مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کا سوانحی خاکہ

حضرت مولانا مفتی رفیق احمد بالا کوٹی

(رئیس شعبہ تخصص فی الفقہ و استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن)



۱۹۶۰ء ۶ اگست کو بابوزئی مردان میں محترم جناب الحاج مشفق الرحمن صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاصہ سے نوازتے ہوئے ایک فرزند ارجمند عطا فرمایا، اس رحمت خاصہ کے شکر و امتنان میں اس نومولود کا نام ”عطاء الرحمن“ رکھا گیا۔

۱۹۶۳ء کو ۳ سال کی عمر میں گہوارہ مادر سے گہوارہ علم میں آنا جانا شروع کیا، خاندان اور گھرانے کی دینی روایت کے مطابق محلہ کی مسجد میں اپنے والد گرامی اور دادا جان سے قاعدہ، ناظرہ اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۶۴ء میں گھر سے ذرا فاصلہ پر واقع اسکول میں داخل ہوئے، اسکول میں بھی گھر کا دینی اثر نمایاں رہا، اسکول کی تمام دینی سرگرمیوں میں سب سے آگے آگے رہے، بلکہ تلاوت، نعت یا نظم اور نماز تک تمام دینی امور کی ذمہ داری تکوینی طور پر آپ کے حصے میں رہی۔ یہ سلسلہ ہائی اسکول کے زمانے تک جاری رہا، بلکہ اس کے ساتھ خاندانی خداداد قابلیت و لیاقت کی بناء پر دیگر تعلیمی سرگرمیوں کا نمایاں مقام بھی آپ کے لئے خاص رہا۔

۱۹۷۱ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بابوزئی سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔ بعد ازاں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے تک عصری تعلیم پرائیویٹ حیثیت میں حاصل کی، انگریزی اور جدید تعلیم کے حامل ہونے کے باوجود الحمد للہ! انگریزیت اور جدیدیت کی آلودگی سے پاک صاف رہے جو اکابر جامعہ کی کرامت اور آپ کی گھریلو دینی تربیت کا اثر تھا۔

۱۹۷۷ء میں اپنے دادا جان حضرت مولانا عبدالسبحان عرف باباجی رحمہ اللہ، فاضل سہارنپور کی ہدایت اور اپنے والدین ماجدین کی دینی آرزو و عملی جامعہ پہننے کے لئے اپنے علاقہ کے ایک نامی گرامی عالم دین حضرت مولانا امین گل صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کے پاس درس نظامی کا آغاز کرنے کے لئے دارالعلوم شیرگڑھ مردان میں داخلہ لیا، ابتدائی درجات وہاں پڑھنے کے بعد کراچی کا رخ کیا، جس میں دارالعلوم شیرگڑھ کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا غلام تکی صاحب دامت برکاتہم کی رائے اور مشورہ بھی شامل تھا، انہوں نے آپ کے دادا جان کی دارالعلوم شیرگڑھ آمد پر مشورہ دیا کہ یہ بچہ بہت ذہین ہے اسے کراچی کا تعلیمی ماحول ملنا چاہئے۔

۱۹۷۹ء کو آپ درجہ رابعہ کا امتحان دے کر گھر گئے اور اولاد میں بڑے ہونے کی بناء پر بڑوں نے آپ کی شادی خانہ آبادی کا فیصلہ فرمایا، چنانچہ آپ کے گھرانے کی لائق تقلید روایت کے مطابق نہایت سادگی کے ساتھ آپ کی ایک پھوپھی صاحبہ (مولانا انعام اللہ صاحب مدظلہ کی والدہ مرحومہ) کے ہاں آپ کی شادی ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس سادہ اور بے تکلف شادی کو ”اعظم النکاح بروکۃ ایسرھا مؤنۃ“ کا مصداق بنایا۔

آپ کی اہلیہ محترمہ، ہماری استانی صاحبہ کو اللہ تعالیٰ نے صبر، شکر، حوصلہ و ہمت، کفایت شعاری، خدا ترسی اور پارسائی کے اعلیٰ اوصاف کی مالکہ بنایا ہے، جس کا واضح اثر آپ کی اولاد کے کردار و عمل میں محسوس ہوتا ہے حضرت شیخ عطاء رحمہ اللہ کی شہادت کی خبر جب انہیں ملی تو انہوں نے نسوانی فطری کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آہ و بکا اور جزع و فزع کے بجائے با وضو ہو کر مصلیٰ بچھایا اور انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ نماز، دعا اور تلاوت میں مصروف ہو گئیں، جب کہ اس سخت مرحلے میں بڑے بڑے حوصلہ مند مردوں کے ضبط بھی ٹوٹ جایا کرتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ہماری استانی صاحبہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی ”الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ“ کا عملی مصداق بننے کا اعزاز بخشا۔ دکھ درد کی دنیا میں یہ اعزاز شاید ہی کسی ماں، بہن یا بیٹی کو نصیب ہوا ہو۔ یہ اعزاز طبعی و وہابی بھی ہو سکتا ہے، مگر اسے اس عملی تربیت کا نتیجہ بھی کہا جاسکتا ہے جس کا مجسم نمونہ اسی (۸۰) سالہ ضعیف العمر صاحب فراش بزرگ والد کی صورت میں ان کے گھر میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی اور عافیت سے نوازے۔ آمین

۱۹۸۳ء ۱۱ اپریل کو آپ کے ہاں پہلے صاحبزادے کی ولادت ہوئی، جن کا نام مسیح الرحمن رکھا گیا، جو جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے فاضل و متخص ہیں، مولانا مسیح الرحمن جب فاضل ہوئے تھے، اس وقت حضرت استاذ محترم، ناظم تعلیمات اور استاذ الحدیث تھے۔ مسیح الرحمن صاحب دورے کے بعد تخصص کرنا چاہتے تھے، مگر ساتھ ہی بیرون ملک کسی اسلامی یونیورسٹی میں داخلے کے لئے کاغذات بھی بھیج چکے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر باہر داخلہ ہو گیا تو تخصص چھوڑ کر باہر چلے جائیں گے، ورنہ تخصص مکمل کر لیں گے، انتظار میں سال ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔ مسیح نے اس رائے پر اپنے دادا جان سے تائید بھی لے لی تھی، مگر جامعہ کے ضابطہ کے مطابق اس طرح کرنا معیوب ہی نہیں، ممنوع بھی تھا، اس لئے ناظم تعلیمات صاحب نے اپنے

بیٹے کے مقابلے میں جامعہ کے ضابطہ کا پاس رکھتے ہوئے بڑی سختی سے انہیں منع کر دیا اور فرمایا کہ جامعہ کو ”انتظار گاہ“ کے طور پر استعمال کرنا میرے نزدیک جرم ہے، میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اتفاق سے مسیح الرحمن کا بیرون ملک جانے کا پروگرام نہ بن سکا، ادھر جامعہ میں تخصص کے داخلہ کا مقررہ وقت بھی گزر چکا تھا، اس لئے اس سال حضرت ناظم تعلیمات صاحب کے صاحبزادے تخصص میں داخلہ سے محروم ہوئے اور اگلے سال تک گھر بیٹھ کر انتظار کرنا پڑا، مجھے یقین بلکہ مشاہدہ بھی ہے کہ اگر یہ معمولی تاخیر کسی اور استاذ کے صاحبزادے سے ہوتی، یا مسیح الرحمن کی جگہ اس جیسا شریف و خلیق کوئی بھی غیر معروف اور بے تعلق طالب علم ہوتا تو حضرت ناظم تعلیمات صاحب اس کے لئے اللہ فی اللہ سفارشی ہوتے اور اسے اپنے اختیارات کے ذریعہ نہیں، بلکہ سفارش کے ذریعہ تخصص میں داخلہ دلوادیتے، مگر مسیح الرحمن کے بارے میں ”شطر کلمہ“ بھی زبان پر نہ لائے، آپ کا یہ طرز عمل ایک ضابطہ حیات کا نتیجہ تھا، وہ یہ کہ آپ نے اپنی صاف شفاف عملی زندگی کو کبھی ”اقربا پروری“ کی ہوائیں لگنے دی، ”اقربا پروری“ سے دوری اور خود داری حضرت استاذ محترم کے نمایاں اوصاف تھے، آپ کے ان دواصولوں کا واضح اور نمایاں اثر آپ کی اولاد کے رہن سہن، رویوں اور برتاؤ سے بھی جھلکتا ہے، جامعہ کی عملی زندگی میں ہم نے آپ کے بچوں کو اس احساس سے ہمیشہ خالی بلکہ کوسوں دور پایا کہ وہ ہمارے کسی بڑے ذمہ دار یا استاذ کے صاحبزادے ہیں۔ ادب و احترام، اخلاق و مروت اور شرم و حیاء میں حضرت استاذ محترم کی اولاد خاندانی شرافت کی آئینہ دار ہے۔ ہم دعا اور آرزو کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمام اساتذہ کے بچوں کو ادب و احترام، نیکی و صلاح اور اخلاق و مروت میں حضرت الشیخ مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بچوں کی طرح بنادے۔ آمین

۱۹۸۶ء ۲۸ جنوری کو حضرت شیخ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے صاحبزادے فصیح الرحمن کی ولادت ہوئی، جو گذشتہ سال (۱۴۳۲ھ) دورہ حدیث کے سالانہ امتحان میں وفاق المدارس میں اول آئے ہیں، اس وقت وہ درجہ تخصص فقہ اسلامی سال اول میں زیر تعلیم ہیں، ان کا تعارف، ان کی تعلیمی و عملی کارکردگی ہے، میں بحیثیت استاذ اور سخت گیر منتظم، الحمد للہ فصیح الرحمن سے مطمئن اور خوش ہوں، اس سے زیادہ کچھ کہنا فی الحال مناسب نہیں ہے۔

۱۹۹۱ء ۵ جنوری کو حضرت استاذ محترم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تیسرے بیٹے کی ولادت ہوئی، جن کا نام جمیل الرحمن رکھا گیا، وہ اس وقت درجہ خامسہ میں زیر تعلیم ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں بھی اپنے بھائیوں کی طرح کامیاب طالب علم اور کامران فاضل بنائے۔ آمین

۱۹۹۵ء ۲۸ ستمبر کو حضرت استاذ محترم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں چوتھے بیٹے بلج الرحمن کی پیدائش ہوئی، جو گذشتہ سال حفظ قرآن کریم مکمل کرنے کے بعد اس وقت درجہ اولیٰ میں زیر تعلیم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے تعلیمی مراحل بحسن و خوبی مکمل فرمائے اور انہیں اعلیٰ کامیابیوں سے ہم کنار فرمائے۔ آمین

۱۹۸۳ء - ۱۴۰۳ھ میں حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ سے فراغت کی فضیلت، فاضلانہ حیثیت سے حاصل فرمائی اور اپنی بہترین تعلیمی کارکردگی کی بنیاد پر اپنے مشائخ کے منظور نظر ثابت ہوئے۔ آپ کے نامور اساتذہ میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن خان ٹوکی، حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن، حضرت مولانا محمد سواتی، حضرت مولانا بدیع الزمان، حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید، حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہ، حضرت مولانا محمد امین اور کرنی شہید، حضرت مولانا عبدالقیوم جتوئی رحمہم اللہ اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر، حضرت مولانا مفتی رضاء الحق، حضرت مولانا محمد انور بدخشانی ادام اللہ فیضہم جیسے جبال العلم شامل ہیں۔

۱۹۸۴ء - ۱۴۰۴ھ کو مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن خان ٹوکی رحمہم اللہ سے تخصص فقہ اسلامی کا کورس پڑھا، علم حدیث کی طرح علم فقہ و فتویٰ میں بھی حضرت مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی و فنی مہارتوں کو اپنے اندر جذب کرنے میں کامیاب رہے اور عرصہ تک حضرت مفتی صاحب رحمہم اللہ کے زیر نگرانی دارالافتاء میں فتویٰ نویسی کا کام انجام دیتے رہے، حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکی رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ عقیدت و محبت کا سرمایہ گراں مایہ بھی خوب سمیٹا، یہاں تک کہ آپ کے علوم و فنون کے علاوہ آپ کی عادات اور اداؤں کا گہرا عکس بھی اپنے ساتھ لے لیا، جس سے زندگی بھر خود بھی لطف اندوز ہوتے رہے اور اپنے تلامذہ کو بھی محظوظ فرماتے رہے۔

تخصص کے تعلیمی دورانیہ کے اختتام پر اپنے علاقے کی طرف روانہ ہوئے، مگر اپنے مشائخ کی نگاہ انتخاب کے سامنے ہی رہے، چنانچہ اس گورہ نایاب کو جامعہ کے علمی و تدریسی افتق پر درخشاں ستارہ محسوس کرتے ہوئے اکابر نے جامعہ میں آپ کے تقرر کا غائبانہ فیصلہ صادر فرمایا اور بذریعہ خط اس کی اطلاع آپ کو بھجوائی گئی، اکابر کے فیصلے بلکہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اگلے تعلیمی سال میں واپس جامعہ آئے۔

۱۹۸۵ء / ۱۴۰۵ھ کو ابتدائی مشورے کے مطابق آپ کا تقرر جامعہ کی پہلی اور قدیم شاخ مدرسہ تعلیم الاسلام گلشن عمر سہراب گوٹھ کے لئے ہوا، مگر اس پر عمل سے پہلے ہی اکابر کو یہ توارد ہوا کہ یہ ”عطاء خداوندی“ شاخ سے زیادہ مرکز کے لئے سبقت اور چھتی ہے، یہ توارد مستقبل اور غیب کا علم رکھنے والے کی

طرف سے گویا الہام تھا کہ مرکز (بنوری ٹاؤن) کو آگے چل کر مرکزیت کے حامل ایسے چہروں کی ضرورت ہوگی، چنانچہ شیخ عطاء رحمہ اللہ جس سچ دھج سے اس مرکز علم و عرفان کا مرکز و محور بن کر رہے، وہ آفتاب نیمروز کی مانند آسمان علم پر ثبت ہے۔

بہر حال آپ نے تدریس اور انتظام کی بعض ذمہ داریوں کے ساتھ جامعہ میں عملی زندگی کا آغاز فرمایا، اعداد و اوقات سے لے کر دورہ حدیث تک درس نظامی کے مختلف علوم اور فنون، کمال مہارت اور عمدہ محنت سے پڑھائے، تدریس کے منفرد جاذب انداز اور حاذق و نباض منتظم ہونے کی بنا پر ہر دور میں اپنے اکابر و مشائخ کے منظور نظر اور معتمد خاص رہے، اسی بناء پر شروع ہی سے آپ جامعہ کی مجلس تعلیمی کے فعال رکن کے طور پر جامعہ کے تعلیمی نظم میں دخل رہے اور اپنے مشائخ کے دست و بازو بنے رہے۔

۱۹۸۸ء میں شہر کے مرکزی مقام صدر کی جامع مسجد صالح میں آپ کا بحیثیت امام و خطیب تقرر ہوا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جامعہ کی طرف سے منتظمین کے لئے بیرون جامعہ کسی قسم کی مصروفیت اختیار کرنا سخت ممنوع تھا، مگر آپ کا انتخاب اور تقرر اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے خود فرمایا تھا، چنانچہ اس امامت و خطابت کے باوجود آپ جامعہ کی طرف سے اپنی مفوضہ انتظامی ذمہ داریوں اور تدریس کے لئے ہمیشہ پابندی کے ساتھ پہنچتے رہے، اور اب تک یہ ساری آمد و رفت بالعموم لوکل بس کے ذریعہ رہی، گزشتہ چند سالوں سے آپ کے بعض خاص خدام طلباء پھر فضلاء کبھی کبھی موٹر سائیکل پر لانے لے جانے کی خدمت انجام دیدیا کرتے تھے، جن میں آپ کے دنیوی و اخروی ہم سفر مولانا محمد عرفان شہیدؒ کے علاوہ مولانا عبد الغفار صاحب، مولانا سہیل یوسف صاحب خصوصی اعزاز یافتہ ہیں۔

۱۹۹۸ء صالح مسجد میں اسکول و کالج کے طلباء کے لئے گرمیوں کی چھٹیوں میں چالیس روزہ دینی و اخلاقی تربیتی کورس کی بنیاد رکھی، جو محدود عرصہ میں شہر کراچی پھر ملک کے مختلف شہروں اور پھر بیرون ملک تک پھیل گیا۔ یہ کورس اپنی افادیت کے علاوہ حضرت شیخ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص و للہیت کا مظہر بھی ہے۔

۱۹۹۹ء - ۲۰۱۹ھ کو جامعہ کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور اپنے دور اندیشانہ مشوروں سے جامعہ کی علمی و روحانی ترقی میں اپنا وافر حصہ ملائے رہے۔

۲۰۰۵ء - ۱۴۲۵ھ حضرت مولانا عبد القیوم چترالی نور اللہ مرقدہ کی مستقل علالت کے بعد جامعہ کی مجلس شوریٰ نے زبردست اصرار کے ساتھ آپ کو جامعہ کے ناظم تعلیمات کے عہدہ کے لئے منتخب کیا، زبردست اصرار کی نوبت اس لئے آئی کہ لفظ عہدہ اور منصب آپ کے مزاج پر کدوہ گراں ہوتا تھا، انہیں بغیر عہدہ اور نام کے کام کرنا ایسے ہی پسند تھا جیسے عام لوگوں کو بغیر کام کے عہدہ اور نام پسند ہوا کرتا ہے۔ بہر حال مجلس شوریٰ کے فیصلے اور حضرت ڈاکٹر صاحب دامت برکاتہم کے شدید تاکید حکم کے سامنے آپ نے سر تسلیم خم کیا اور ناظم تعلیمات کے طور پر فرائض انجام دینا شروع کر دیئے، اب اگلا مسئلہ یہ تھا کہ آپ کے مزاج کے مطابق، مفوضہ امور کسی مخصوص نشست کے بغیر بھی انجام دیئے جاسکتے ہیں، چنانچہ وہ ایک عرصہ تک ناظم تعلیمات کے لئے مقررہ نشست پر بیٹھنے کے لئے رضا مند نہ ہوتے تھے، کیوں کہ اس وقت مولانا عبد القیوم رحمہ اللہ شدید علالت کے باوجود بقید حیات تھے۔

حتیٰ کہ بسا اوقات حضرت ڈاکٹر صاحب دامت برکاتہم استاذ کے روپ میں جا کر بیٹھنے کے لئے فرماتے تو امتثال امر کے لئے کچھ دیر بیٹھ جاتے، پھر حضرت مولانا عبد القیوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب کی خوشی اور دلجوئی کے لئے حضرت ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں کچھ دیر بیٹھتے اور قریبی احباب سے فرماتے کہ ”میں یہاں بیٹھتا ہوں تاکہ حضرت ڈاکٹر صاحب خوش ہوں“ بعد میں اس سے آسان تدبیر یہ اختیار کی کہ جب بھی حضرت ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں دفتر تشریف لاتے تو سیدھے حضرت ڈاکٹر صاحب کے سامنے جا کر بیٹھ جاتے، کچھ دیر راز و نیاز بھری گفتگو ہوتی اور گھنٹہ شروع ہونے پر اجازت لے کر گھنٹے میں چلے جاتے۔

۲۰۰۵ء / ۱۴۲۶ھ میں حضرت الشیخ الشامزی شہید رحمہ اللہ کی شہادت باسعادت کے بعد دورہ حدیث کا درسی خلا پر کرنے کے لئے مجلس تعلیمی نے حضرت الاستاذ مولانا عطاء الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہ کا انتخاب فرمایا، اتفاق کی بات ہے کہ حضرت مفتی ولی حسن ٹوکنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلا کو پر کرنے کے لئے جب حضرت شامزی شہید رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب ہوا تھا تو آپ کو بھی دورہ حدیث میں صحیح مسلم کا سبق دیا گیا تھا اور حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے بعد حضرت شیخ عطاء الرحمن رحمہ اللہ نے دورہ حدیث کے اسباق کا آغاز بھی اسی صحیح مسلم سے فرمایا، جو آپ کا حدیث شریف کا مستقل سبق تھا، اس کے علاوہ بعض مشائخ حدیث کی غیر موجودگی میں ان کے اسباق بھی پڑھاتے رہے، علاوہ ازیں جامعہ کے شعبہ بنات میں صحیح بخاری شریف کا سبق بھی آپ کے زیر درس تھا۔ بلاشبہ آپ کہنہ مشق استاذ اور لائق و فائق مدرس تھے۔ گوناگوں انتظامی مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود بڑے شغف کے ساتھ سبق میں

جاتے، مدرسہ میں ہوتے ہوئے کبھی سبق کا ناعد نہ فرماتے۔

۲۰۱۲ء/۱۴۳۳ھ رواں تعلیمی سال میں پچھلے کچھ عرصہ میں اتفاق سے متعدد اساتذہ کرام رخصت پر تھے، جن میں درجہ عالیہ اور درجہ عالمیہ کے کئی اساتذہ بھی شامل تھے، حضرت ناظم تعلیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اسباق کے علاوہ ان اساتذہ کرام کے اسباق بھی خود پڑھائے، اس سال اتفاق سے مجھے حضرت استاذ محترم کا ارادی اور غیر ارادی طور پر بہت ہی قرب رہا، جامعہ کی مصروف عملی زندگی کے باوجود، دن میں متعدد بار دیر تک ملاقات اور صحبت میسر آتی رہی، میں آپ کے اسباق کی کثرت اور آپ کی ہمت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا تھا، کہ ہم اپنی محدود انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ محدود اسباق کے لئے اتنی پابندی نہیں کر پاتے جتنی کہ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اپنے اسباق کی پابندی فرما رہے ہوتے تھے۔ جب آپ دوسرے اساتذہ کرام کے اسباق پڑھا رہے تھے تو بسا اوقات ایک ہی گھنٹے میں دو دو درسا گاہوں میں جانا ہوتا، اس بے پناہ تدریسی مصروفیت کے بارے میں اب یہ حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے محاوروں کے مطابق انسان اپنی اجل قریب آنے پر جلدی جلدی اپنا رزق سمیٹتا ہے، اسی طرح حضرت الشیخ استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن نور اللہ مرقدہ کی اجل قریب آ کر جھانکنے لگی تھی، اس لئے وہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنی روحانی ذریت میں اضافہ کرتے ہوئے اپنی پیچھے ”علم ینتفع بہ“ کے سلسلہ خیر، کا خاص تکیوینی ہدف، پورا کرنا چاہ رہے تھے۔ یہ گویا تکیوینی معاملہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی باقیات صالحات کے روحانی سلسلے میں جن جن طلباء و طالبات کو شامل کرنا تھا، بہت کم وقت میں اس کے مواقع پیدا ہوئے۔ ایسے تمام طلباء و طالبات اس تکیوینی سعادت مندی پر مبارک باد اور حضرت الاستاذ کے داغ مفارقت پر تعزیت کے مستحق بھی ہیں۔

فعظم الله اجرهم واجرونا واحسن عزاء هم وعزاءنا واغفر لشيخنا ومرافقيه مغفرة ظاهرة و باطنة لا تغادر ذنباً.

۲۰۱۲ء/۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بروز جمعرات جامعہ کے ششماہی امتحان کے نتائج کے اعلان کا دن تھا، حسب معمول ابتدائی گھنٹے آج بھی پڑھائے، عام طور پر صبح مدرسہ آتے ہوئے اکثر راستے میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی، مگر پچھلے کچھ عرصہ سے مجھے بروقت مدرسہ پہنچنے میں دیر سویر ہونے لگی تھی، لیکن حسن اتفاق کہ آج حضرت شیخ رحمہ اللہ، مدرسہ میں داخل ہونے کے لئے دروازے سے داخل ہو رہے تھے کہ میں بھی دروازے پر پہنچ آیا، حسب عادت شفقت بھری دلکش مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہا، پھر بعض امور سے متعلق کچھ ارشادات اور کچھ ہدایات دیتے ہوئے جامعہ کے احاطہ میں واقع کلینک تک آئے اور وہاں سے درجہ رابعہ میں ”شرح الجامی“ کا سبق پڑھانے چلے گئے، پڑھا کر واپس آئے تو دوبارہ ملاقات ہوئی، پھر ایک قضیہ کی بابت کچھ ہدایات اور مشورے دیئے، پھر دفتر میں آئے، پھر دارالحدیث چلے گئے، جہاں نتائج کے اعلان کے سلسلے میں اساتذہ کا اجتماع تھا، جاتے ہوئے فرمایا کہ آپ حضرات (چند ذمہ دار اور راقم) یہ قضیہ حل کریں، آپ لوگوں کو اساتذہ کے اجتماع میں آنے کی ضرورت نہیں۔

اساتذہ کے اجتماع سے فارغ ہو کر پھر ایک مشاورتی سلسلے میں جامعہ کے تاریخی مہمان خانہ (جہاں کئی اکابر نے اپنے آخری سفر سے پہلے قیام فرمایا تھا) میں دیر تک بیٹھے رہے، زیر بحث قضیہ کے پس منظر، پیش منظر اور مختلف اطراف و جوانب پر سیر حاصل نا صحنہ گفتگو فرمائی، جس میں ماضی کی کئی یادیں اور مستقبل کے کئی راہ نما اصول پنہاں تھے، پھر یہاں سے گھر کی طرف نکلے، آہستہ آہستہ چلتے رہے، کئی واقعات اور حقائق یوں بتاتے گئے جیسے کوئی انسان پیغام یا امانت پہنچا رہا ہو، جو موضوع باقی تھا اس کو میرے گھر کے باہر سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے پورا فرمایا، یہ معمول صرف آج کی الوداعی ملاقات کا نہیں، بلکہ سال بھر تقریباً یہی معاملہ رہا، جس کی تفصیل مستقل نشست کی متقاضی ہے۔

میں حضرت استاذ محترم کی ان لمبی لمبی باتوں اور ملاقاتوں کی حکمت سمجھنے کی اب جو کوشش کرتا ہوں تو ان کے سلسلہ گفتگو کا ایک جملہ معترضہ فوراً سامنے آجاتا ہے ”مولوی صاحب! یہ باتیں جامعہ کی امانت ہیں، آپ لوگوں کو معلوم ہونی چاہئیں“۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی باتیں جامعہ کی امانت ہی نہیں، بلکہ آپ کی طرف سے وصیت بھی تھیں۔ فإنا لله وإنا إليه راجعون. اللہم اجعلنا خیر خیر خلف لخیر سلف.

۲۰۱۲ء/۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ جمعہ کا دن تھا، جمعہ کا وعظ فرمایا، سامعین کو اجل کی اچانک آمد کی حقیقت سمجھائی اور صالح مسجد صدر سے گھر آئے، آخری سفر سے پہلے مختصر سفر کے لئے پابہ رکاب ہوئے، دو نہایت ہی میٹھے رشتے بھی شریک سفر تھے، ایک طرف بہن جیسا مجسم محبت والفت رشتہ، دوسری طرف جاں فشانی اور جاں نثاری کی چلتی پھرتی تصویر، حقیقی معنوں میں شاگرد اور خادم سفر و حضر برابر میں مولانا مفتی محمد عرفان حمید صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جامعہ سے سفر پر رخصت ہوتے ہوئے آج خلاف معمول بے چینی، اضطراب اور حساسیت نمایاں تھی، یہی کیفیت ایئر پورٹ پر اندر جانے کے بعد بھی رہی، جو رخصت کرنے والے باہر بھی محسوس کر رہے تھے، شام تقریباً ۵ بجے جہاز کی روانگی کا مقررہ وقت تھا، نجی ایئر لائن کا ٹکٹ تھا، عام طور پر مقررہ وقت سے تاخیر ایسی ایئر لائنوں کا معمول ہے، مگر آج بھوجا ایئر لائن ۱۲/۱۲ انسانوں کو اپنے ”مشوّم شکم“ میں چھپاتے ہی مقررہ وقت سے ۵/۵ منٹ پہلے اڑا

اور اٹھارہ سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی زمینی رفتار سے اسلام آباد کی طرف فضا میں تیرنے لگا، اسلام آباد انٹیرپورٹ کی حدود صرف ۹ منٹ کے فاصلے پر رہ گئی تھیں کہ بھوجا انٹر لائن گہرے سیاہ بادلوں میں موت سے مقابلہ کرنے لگی، لیکن موت سے موت کے علاوہ کون مقابلہ کر سکتا ہے، آناً فاناً موت کے ایک تھپڑ نے بھوجا انٹر لائن کو آسمان سے زمین کی طرف لڑھکا دیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ”من كان اخر كلامه لا إله إلا الله دخل الجنة“۔ ان شاء اللہ! یہ قافلہ آخرت ”المصادق المصدوق“ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق سیدھا جنتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور ارشاد گرامی کے مطابق بلندی سے گر کر ریا آگ کی تکلیف سہہ کر جان جان آفرین کے سپرد کرنے والے مسلمان، شہداء امت ہیں۔ اور شہادت ہر مومن کا مقصود و مطلوب ہے، اس لئے ہم سمیت تمام مرحومین کے لواحقین کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات گرامی سرمایہ تسلی و صبر ہیں، کیوں کہ مومن کا جنت میں پہنچ جانا اور وہ بھی رتبہ شہادت کے ساتھ یہ اتنی بڑی کامیابی و سعادت مندی ہے کہ اس کے مقابلے میں فطری دکھ درد جتنا زیادہ بھی ہو وہ پیچ ہے، اس لئے ہم سب کو اپنے مرحومین کے حق میں وہی کلمات کہنے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائے اور بتائے ہیں، پس ان ارشادات کی روشنی میں ہم یہ دعا کرتے ہیں: ”اللہم اغفر لشیخنا ومرافقیہ، وارفع درجاتہم فی المہتدین، واخلفہم فی عقبہم فی الغابرین واغفر لنا ولہم یا رب العلمین وافسح لہم فی قبورہم و نور لہم فیہا۔ آمین۔“

۲۰۱۲ء بروز ہفتہ ۱۲ بجے دن جامع مسجد فاروق اعظم آئی نائن، اسلام آباد میں حضرت شیخ عطاء الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ ادا کی گئی، جس میں مقامی علماء و مشائخ کے علاوہ دور دراز سے آپ کے تلامذہ اور عوام بھی شریک ہوئے، جو ہزاروں کا مجمع تھا، یہاں آپ کی نماز جنازہ قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم نے پڑھائی، پھر آہوں اور سسکیوں کے ساتھ یہ اجتماع منتشر ہوا۔ کراچی سے پہنچے ہوئے کئی اساتذہ، متعلقین اور سیٹروں فضلاء و طلباء اپنے محبوب استاذ کے جسد خاکی کے پیچھے پیچھے بوجھل قدموں اور تر آنکھوں کے ساتھ بابوزئی مردان کی طرف روانہ ہوئے، تقریباً شام ۵ بجے استاذ محترم کے آبائی گاؤں پہنچے، جہاں اسلام آباد کے اجتماع سے کئی گنا بڑا اجتماع موجود تھا، دور دراز سے بڑے بڑے قافلے پرائیویٹ گاڑیوں کے علاوہ ویکنوں اور بسوں میں بھر بھر کر پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے اور یہ سلسلہ مزید جاری تھا۔ گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے روڈ اور قریب کے کھیت نا کافی ہو رہے تھے، علماء صلحاء طلباء اور عوام کا جم غفیر ایسا کہ تاحد نگاہ انسانی سر بلکہ سفید ٹوپیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں، اس جم غفیر نے ۶ بجے شام استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہ کی نماز جنازہ ادا کی، حضرت مولانا شیر علی شاہ صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) نے نماز جنازہ کی امامت کروائی اور آج کا سورج غروب ہوتے ہی علم و عمل، شفقت و محبت اور فدائیت و فنائیت کے پیکر، بزم بنوری کی ایک روشن قندیل کا جسد خاکی اپنے آخری مسکن میں پہنچ کر ہم سے اوجھل ہو گیا اور اپنی پیچھے کئی تاریکیاں اور ان تاریکیوں میں بس اپنی یادوں کے اجالے چھوڑ گیا۔

فَإِنَّ اللَّهَ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أُعْطِيَ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى .

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)

حیات شہید اک نظر میں

محمد زین العابدین



☆ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی پیدائش بروز پیر ۶ اگست ۱۹۶۰ء بمطابق ۱۲ صفر ۱۳۸۰ھ بابوزئی مردان میں ہوئی۔
☆ آپ کے والد محترم جناب مشفق الرحمن صاحب ایک دین دار شخصیت کے حامل جب کہ دادا حضرت مولانا عبد السبحان باقاعدہ عالم دین اور سہارن پور انڈیا کے فاضل تھے۔

☆ ۱۹۶۳ء بمطابق ۱۳۸۳ھ کو ۳، سال کی عمر میں محلہ کی مسجد میں اپنے دادا اور والد سے قاعدہ، ناظرہ اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

☆ ۱۹۶۴ء بمطابق ۱۳۸۴ھ میں اسکول میں داخل ہوئے۔

☆ ۱۹۶۶ء بمطابق ۱۳۹۶ھ میں گورنمنٹ ہائی اسکول بابوزئی مردان سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔

☆ ۱۹۷۷ء بمطابق ۱۳۹۷ھ میں دارالعلوم شیرگڑھ مردان میں داخلہ لیا اور درس نظامی کے ابتدائی درجات پڑھے۔

☆ ۱۹۷۸ء بمطابق ۱۳۹۸ھ: درجہ ثالثہ پڑھنے کے لیے جامعہ بنوری ٹاؤن میں داخل ہوئے۔

☆ ۱۹۷۹ء بمطابق ۱۳۹۹ھ: درجہ رابعہ سے فراغت پر آپ کی شادی ہو گئی۔

☆ ۱۹۸۳ء بمطابق ۱۴۰۳ھ: جامعہ بنوری ٹاؤن سے دورہ حدیث امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔

☆ ۱۲/۱۲/۱۹۸۳ء بمطابق ۱۴۰۳ھ: آپ کے پہلے بیٹے مفتی مسیح الرحمن صاحب کی ولادت ہوئی۔

☆ ۱۹۸۴ء بمطابق ۱۴۰۴ھ: جامعہ بنوری ٹاؤن میں تخصص فی الفقہ میں داخلہ لیا۔

☆ ۱۹۸۵ء بمطابق ۱۴۰۵ھ: تخصص فی الفقہ سے فارغ ہوئے۔

☆ اساتذہ کرام: جناب مشفق الرحمن صاحب، حضرت مولانا عبد السبحان، حضرت مولانا امین گل، حضرت مولانا محمد احمد، حضرت مفتی ولی حسن خان ٹوکی، حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی، حضرت مفتی احمد الرحمن، حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہ، حضرت مولانا محمد بدیع الزمان، حضرت مولانا محمد سواتی، حضرت مولانا عبد القیوم چترالی، حضرت مولانا محمد امین اور کرنی شہید، حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید رحمۃ اللہ علیہم اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر، حضرت مولانا عبد الرزاق لدھیانوی، حضرت مولانا مفتی رضاء الحق مردانی، حضرت مولانا محمد انور بدخشانی، حضرت مولانا مولیٰ بخش دامت برکاتہم۔

☆ مزید اجازت حدیث: حضرت الشیخ عبدالفتاح ابو غندہ اور امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہما۔

☆ ۱۹۸۵ء بمطابق ۱۴۰۵ھ کو آپ کا جامعہ میں بحیثیت مدرس تقرر ہوا اور تادم زیت آپ نے جامعہ میں تدریس فرمائی۔

☆ ۲۸/ جنوری ۱۹۸۶ء بمطابق ۱۴۰۶ھ: آپ کے دوسرے بیٹے مفتی فصیح الرحمن صاحب کی ولادت ہوئی۔

☆ ۲۴/ مارچ ۱۹۸۷ء بمطابق ۱۴۰۷ھ: آپ تین مہینے کا کورس کرنے کے لیے جامعہ ازہر مصر تشریف لے گئے۔

☆ ۱۹۸۸ء بمطابق ۱۴۰۸ھ: جامع مسجد صالح جہانگیر پارک صدر کراچی کی امامت و خطابت کے لیے آپ کا انتخاب ہوا جس کو تادم آخر نبھاتے

رہے۔

☆ ۲/ فروری ۱۹۸۹ء بمطابق ۲۴/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ بروز پنج شنبہ پونے بارہ بجے آپ کے استاذ محترم، ماہنامہ بینات کے مدیر مسئول، اور

جامعہ کے استاذ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحلت فرما گئے۔

☆ ۵/ جنوری ۱۹۹۱ء بمطابق ۱۴۱۱ھ: آپ کے تیسرے بیٹے مولوی جمیل الرحمن کی ولادت ہوئی۔

☆ ۳۱/ جنوری ۱۹۹۱ء بمطابق ۱۴/ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ رات چار بجے آپ کے استاذ محترم، ماہنامہ بینات کے مدیر مسئول، حضرت بنوریؒ کے داماد ربیع اور

جامعہ کے مہتمم ثانی و استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن وفات پا گئے۔

☆ ۱۹۹۳ء بمطابق ۱۴۱۳ھ: حضرت الشیخ عبدالفتاح ابو غندہ نے آپ کو حضرت الشیخ امام کوثریؒ کی طرف سے اجازت حدیث عطاء فرمائی۔

☆ ۳/ فروری ۱۹۹۵ء بمطابق ۲/ رمضان ۱۴۱۵ھ شپ جمعہ بوقت سحر آپ کے استاذ محترم، جامعہ کے دارالافتاء کے رئیس، شعبہ تخصص فی الفقہ کے

نگران اور شیخ الحدیث مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن خان ٹوکیؒ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

☆ ۲۸/ ستمبر ۱۹۹۵ء بمطابق ۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ کو آپ کے چوتھے اور آخری بیٹے حافظ بلح الرحمن کی ولادت ہوئی۔

☆ ۴/ نومبر ۱۹۹۵ء بمطابق ۱۰/ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۶ھ آپ کے استاذ محترم، جامعہ کے شیخ الحدیث و ناظم تعلیمات حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہؒ

راہی آخرت ہوئے۔

☆ ۲/ نومبر ۱۹۹۷ء بمطابق یکم رجب المرجب ۱۴۱۸ھ بروز اتوار بارہ بج کر چالیس منٹ پر آپ کے استاذ محترم، ماہنامہ بینات کے مدیر مسئول، حضرت

بنوریؒ کے سب سے چھوٹے داماد اور جامعہ کے مہتمم و شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختارؒ کو جامعہ کے استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی عبد

السمیع سندھیؒ کے ہمراہ شہید کر دیا گیا اور یہیں سے شہادتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

☆ ۲۶/ مئی ۱۹۹۸ء بمطابق ۱۹/ ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ بروز منگل دوپہر کے وقت حضرت بنوریؒ کے بڑے صاحبزادے، ماہنامہ بینات کے مدیر منتظم و نگران، جامعہ کے

نائب مہتمم و استاذ جناب مولوی سید محمد بنوریؒ کو شہید کر دیا گیا۔

☆ ۱۹۹۸ء بمطابق ۱۴۱۹ھ: جامع مسجد صالح صدر کراچی میں عصری طلباء کے لیے چالیس روزہ دینی نصاب مرتب کیا جو بفضلہ تعالیٰ آج ملک بھر میں پڑھایا جاتا ہے۔

☆ ۱۹۹۹ء بمطابق ۱۴۱۹ھ جامعہ کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے۔

☆ ۱۲/۸ اگست ۱۹۹۹ء بمطابق ۲۹/ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ صبح دس بج کر پندرہ منٹ پر آپ کے بزرگ، جامعہ کے شعبہ تخصص فی الحدیث کے نگران حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ انتقال فرما گئے۔

☆ ۳/فروری ۲۰۰۰ء بمطابق ۲۶/شعبان ۱۴۲۰ھ بروز جمعرات بعد نماز عصر آپ کے استاذ محترم، جامعہ کے استاذ الحدیث حضرت مولانا محمد بدیع الزمان فوت ہو گئے۔

☆ ۱۸/مئی ۲۰۰۰ء بمطابق ۱۳/صفر ۱۴۲۱ھ بروز جمعرات صبح دس بجے آپ کے بزرگ، جامعہ کے استاذ الحدیث، ماہنامہ بینات کے مدیر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کو شہید کر دیا گیا۔

☆ ۳۰/مئی ۲۰۰۲ء بمطابق ۱۰/ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ بروز اتوار صبح آٹھ بجے آپ کے بزرگ دوست، اور جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئیؒ کو شہید کر دیا گیا۔

☆ ۹/اکتوبر ۲۰۰۴ء بمطابق ۲۳/شعبان ۱۴۲۵ھ بروز ہفتہ شام پونے چھ بجے آپ کے بے تکلف دوست، جامعہ کے سابق استاذ حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خانؒ کو شہید کر دیا گیا۔

☆ ۳۰/اگست ۲۰۰۵ء بمطابق ۲۵/رجب ۱۴۲۶ھ آپ کے شاگرد رشید، حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہؒ کے فرزند، جامعہ کے استاذ حضرت مولانا سید عنایت اللہ شاہؒ شہید ہو گئے۔

☆ ۲۰۰۵ء بمطابق ۱۴۲۵ھ جامعہ کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ کی مستقل علالت کے بعد آپ کو قائم مقام ناظم تعلیمات مقرر کیا گیا جب کہ اسی سال حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئیؒ کی شہادت کے بعد آپ کو استاذ الحدیث کا منصب دے کر مسلم شریف کا درس حوالہ کیا گیا بعد ازاں آپ کو بنات میں صحیح بخاری بھی دے دی گئی جو تادم آخر آپ پڑھاتے رہے۔

☆ ۱۶/اپریل ۲۰۰۷ء بمطابق ۲۷/ربیع الاول ۱۴۲۸ھ بروز پیر صبح ساڑھے نو بجے آپ کے استاذ محترم، جامعہ کے استاذ و ناظم تعلیمات حضرت مولانا عبدالقیوم چترائیؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا ان کی وفات کے بعد آپ کو مستقل ناظم تعلیمات کا عہدہ دے دیا گیا جس کی ذمہ داری آپ تادم آخر ادا کرتے رہے۔

☆ ۱۴/اپریل ۲۰۰۸ء بمطابق ۷/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ بروز پیر صبح ساڑھے پانچ بجے آپ کے شاگرد رشید، مدرسہ عربیہ اسلامیہ ملیرشاخ جامعہ کے استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی سید سعید احمد اخوندزادہ مردائیؒ کو شہید کر دیا گیا۔

☆ ۲/جولائی ۲۰۰۸ء بمطابق ۲۷/جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ بروز بدھ آپ کے شاگرد رشید، شعبہ حفظ و ناظرہ جامعہ اور شاخہائے جامعہ کے نگران حضرت مولانا قاری محبوب الرحمنؒ انتقال کر گئے۔

☆ ۱۳/ستمبر ۲۰۰۸ء بمطابق ۲۲/رمضان ۱۴۲۹ھ بروز ہفتہ آپ کے استاذ محترم، جامعہ کے استاذ الحدیث حضرت مولانا محمد سوائیؒ سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

☆ ۱۱/جون ۲۰۰۹ء بمطابق ۱۴/جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ آپ کے استاذ محترم جامعہ کے سابق ناظم تعلیمات و استاذ الحدیث حضرت مولانا محمد امین اور کزنٹی کو شہید کر دیا گیا۔

☆ ۱۱/مارچ ۲۰۱۰ء بمطابق ۲۵/ربیع الاول ۱۴۳۱ھ شب جمعہ رات دس بجے جامعہ کے سابق استاذ، ماہنامہ بینات کے مدیر اور آپ کے بے تکلف دوست حضرت مولانا سید احمد جلاپوریؒ کو صابزادہ سمیت شہید کر دیا گیا۔

☆ ۸/ستمبر ۲۰۱۰ء بمطابق ۲۷/رمضان ۱۴۳۱ھ بروز منگل رات گیارہ بجے آپ کے شاگرد رشید، مدرسہ تعلیم الاسلام گلشن عمر شاخ جامعہ کے استاذ التفسیر حضرت مولانا انعام اللہ کو شہید کر دیا گیا۔

☆ ۲۹/اپریل ۲۰۱۱ء بمطابق ۲۵/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ بروز جمعہ صبح نماز فجر سے قبل آپ کے شاگرد رشید، جامعہ کے استاذ التفسیر حضرت مولانا

ارشاد اللہ عباسیؒ کو شہید کر دیا گیا۔

☆ ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بمطابق ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ بروز جمعہ شام چھ بج کر چالیس منٹ پر طیارہ حادثہ میں حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ اپنے معاون خاص مولانا مفتی محمد عرفان حمید مبینؒ اور اپنی ہم شیرہ سمیت شہید ہو گئے۔

☆ اگلے دن آپ کا پہلا جنازہ مسجد فاروق اعظم آئی نائن فور اسلام آباد میں قائد جمعیت مولانا فضل الرحمن صاحب نے پڑھایا۔

☆ دوسرا جنازہ جامعہ خلفائے راشدین بابوزئی مردان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب نے پڑھایا۔

☆ تینوں شہداء کی تدفین جامعہ خلفائے راشدین بابوزئی مردان کے قریب مولانا شہید کے آبائی قبرستان کے احاطے میں کر دی گئی۔

☆ نماز جنازہ میں شرکت: مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب، مولانا فضل الرحمن صاحب، مفتی ذاکر حسن نعمانی، مفتی نجم الرحمن، مفتی تحمید اللہ جان، مولانا محمود رشید، صاحبزادہ اشرف علی، مولانا عبدالقدوس محمدی، مولانا ضیاء الحق مردانی صاحب، مولانا امداد اللہ صاحب، مولانا محبت اللہ صاحب، مفتی محمد عاصم زکی صاحب، مولانا انعام اللہ صاحب، مولانا سید سلیمان بنوری صاحب، مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب، مفتی رفیق احمد بالا کوٹی صاحب، مولانا عمران عیسیٰ صاحب، مولانا محمد عادل صاحب، مولانا سعید خان صاحب، مولانا عبدالغفار۔



استاذ محترم کا مختصر سوانحی خاکہ

مولانا مفتی محمد شعیب حقانی

فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن



اللہ تعالیٰ جل جلالہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کے احادیث مبارکہ پڑھانے والے اس عظیم مدرس کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین۔
اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب کو ایسے کمالات عطاء فرمائے تھے کہ حضرت کے رحلت کے بعد ہر آنکھ ان کی جدائی کے غم میں اشک بار ہے۔

ایک طرف استاذ محترم عشق رسول ﷺ کے جذبے سے سرشار تھے، پورا قصیدہ حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو زبانی یاد تھا اور جب مخصوص انداز میں پڑھتے تو مجمع پر سکتہ طاری ہو جاتا، تو دوسری طرف عشق صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ان کے دل میں راسخ تھا، ایک طرف وہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن جیسے عظیم دینی مرکز کے ناظم تعلیمات کے منصب پر فائز تھے، تو دوسری طرف ایک بہت بڑی جامع مسجد (صالح مسجد جہانگیر پارک کراچی) کے امامت و خطابت کے فرائض بخوبی سرانجام دے رہے تھے۔ ایک طرف جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے دورہ حدیث کی درسگاہ میں تشنگان علوم نبوت کو ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ سے سیراب فرما رہے تھے، تو دوسری طرف طلبہ میں قرآن و حدیث اور عربی کی صحیح سمجھ پیدا کرنے کیلئے علم الخوکی مشکل کتاب ”شرح جامی“ کی نہایت ہی سہل انداز میں درس فرمایا کرتے تھے۔ ایک طرف ان کو عربی کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے، تو دوسری طرف فارسی اور اردو کے اشعار میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ ایک طرف وہ دینی مدارس کے نمائندہ تنظیم ”وفاق المدارس العربیہ پاکستان“ کی نصابی کمیٹی کے رکن تھے، تو دوسری طرف وہ عصری علوم کے حامل افراد میں دینی فہم پیدا کرنے کیلئے سکول و کالج کے گرمیوں کی چھٹیوں میں ”چالیس روزہ تربیتی کورس“ کے بانی تھے۔ ایک طرف انہوں نے اس شہر (کراچی) اور جامعہ کے ساتھ آخری سانس تک وفاداری کر کے شہر کراچی میں جامعہ کے تمام شاخوں کی نگرانی فرمائی، کیونکہ اسی شہر اور اسی جامعہ میں انہوں نے علوم دینیہ حاصل فرمائے تھے، تو دوسری طرف انہوں نے پورے ملک میں مختلف مدارس کی سرپرستی اور نگرانی فرمائی۔ ایک طرف استاذ محترم اتنے سارے کمالات کے حامل اور اتنے اہم مناصب پر فائز تھے، تو دوسری طرف عاجزی، انکساری اور گوشہ نشینی کا یہ حال تھا کہ اکثر افراد کو ان کے کمالات ان کے جانے کے بعد معلوم ہونے لگے۔ بندہ اس قابل نہیں کہ اپنے استاذ محترم کے احسانات کا بدلہ اتار سکے یا قلم کی نوک پر لاسکے، لیکن دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے سانحہ پر بھی اپنے استاذ محترم کی عظمت کو سلام نہ کروں، تو پھر استاذ اور شاگرد کا وہ عظیم تعلق کہاں؟ لہذا استاذ محترم کی یہ مختصر سوانح مرتب کی ہے۔ یہ عطاء رحمن ہی تو ہے کہ حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ کا نام ان کے جانے کے بعد بھی روشن ہے۔ دُعا ہے کہ وہ ”رحمن ذات“ استاذ محترم کو اپنی رحمت سے جنت الفردوس میں جگہ عطاء فرمائے۔ آمین

﴿مختصر حالات زندگی﴾

- نام ﴿ حضرت مولانا عطاء الرحمن ﴾
- تاریخ پیدائش ﴿ 1960ء ﴾
- جائے پیدائش ﴿ ضلع مردان، علاقہ بابوزئی ﴾
- والد کا نام ﴿ جناب ماسٹر مشفق الرحمن صاحب ﴾
- دادا کا نام ﴿ حضرت مولانا عبد السبحان صاحب ﴾
- ابتدائی تعلیم ﴿ اپنے والد جناب مشفق الرحمن صاحب کے زیر سایہ بابوزئی میں حاصل کی۔ مزید تعلیم دارالعلوم شیرگڑھ میں حاصل کی۔
- بنوری ٹاؤن آمد ﴿ میٹرک کرنے کے بعد 1975ء میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا۔
- سن فراغت ﴿ 1983ء میں جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن سے فراغت ہوئی۔
- تخصص فی الفقہ ﴿ 1985ء میں جامعہ ہی میں تخصص کا کورس مکمل کیا۔
- اساتذہ کرام ﴿ استاذ محترم کے اساتذہ و شیوخ: مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی ولی حسن خان ٹونکی، حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی، حضرت مولانا محمد بدیع الزمان، حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہ، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن، حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید، حضرت مولانا فضل محمد سواتی، حضرت مولانا امین اورکزئی شہید، رحمہم اللہ تعالیٰ اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم العالیہ، جیسے جبال العلم ہیں۔
- تلامذہ ﴿ استاذ محترم کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے، صرف پاکستان میں نہیں بلکہ بیرون دنیا، دبئی، افریقہ، ترکی، آسٹریلیا، ویسٹ انڈیز، تھائی لینڈ، بنگلہ دیش، افغانستان، سری لنکا، سمیت مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔
- اسفار ﴿ استاذ محترم نے کئی بار سعودی عرب حج و عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کیلئے سفر فرمایا، جبکہ جہاد میں حصہ ڈالنے کے لیے 1998ء میں افغانستان کا بھی سفر فرمایا، اس کے علاوہ شاید دنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جہاں استاذ محترم نے دینی، تبلیغی سلسلہ میں سفر نہ فرمایا ہو۔ بیرون دنیا میں بنوری ٹاؤن کے زیر نگرانی مختلف مدارس اور جامعات کام کرتے ہیں، ان کے پروگرامات میں استاذ محترم کو اکثر بلایا جاتا تھا، ان ممالک میں، ملائیشیا، انڈونیشیا، ترکی، دبئی، بنگلہ دیش، سری لنکا، افریقہ، ویسٹ انڈیز، آسٹریلیا، یمن اور بحرین وغیرہ شامل ہیں۔
- عملی زندگی ﴿ 1985ء سے 20 اپریل 2012ء تک جامعہ کے اندر درجہ اولیٰ سے لے کر دورہ حدیث تک کے کتب کا احسن طریقہ سے درس دیتے رہے۔
- مناصب ﴿ ☆ استاذ الحدیث و ناظم تعلیمات جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ☆ امام و خطیب صالح مسجد جہانگیر پارک کراچی ☆ رکن نصابی کمیٹی وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور اس کے علاوہ اسکولوں اور کالج کے طلبہ کیلئے چالیس روزہ کورس کے بھی بانی تھے ☆ جامعہ بنوری ٹاؤن کے مجلس عاملہ کے رکن ☆ ماہنامہ بینات کی مجلس ادارت کے رکن۔
- تاریخ شہادت ﴿ 20 اپریل 2012ء بروز جمعہ المبارک بوقت بعد نماز عصر۔
- مقام شہادت ﴿ اسلام آباد کے قریب حسین آباد کے علاقہ میں بھوجا انیر لائن کے حادثے میں شہید ہوئے۔
- رفقائے شہادت ﴿ استاذ محترم کے ساتھ چند دیگر اہل علم، شاگرد اور معاون خاص مولانا عرفان میمن اور استاذ محترم کی ہمیشہ بھی شہید ہوئی۔
- نماز جنازہ ﴿ 21 اپریل 2012ء بروز ہفتہ، دوپہر کے وقت اسلام آباد میں قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب اور اسی شام استاذ محترم کے آبائی گاؤں مردان بابوزئی میں جامعہ ”خلفائے راشدین“ کے اندر حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب نے پڑھائی۔
- جائے تدفین ﴿ جامعہ خلفائے راشدین، مردان بابوزئی میں تدفین ہوئی، جبکہ مولانا عرفان میمن صاحب نے بھی آخر تک ساتھ نبھایا اور ان کے قریب ہی ان کی مرقد بنی۔
- پسماندگان ﴿ لاکھوں شاگرد اور معتقدین، والد، والدہ، تین بھائی، (مولانا لطف الرحمن، مولانا حفظ الرحمن، احمد الرحمن) تین بہنیں، بیوہ، چار بیٹے (مولانا مسیح الرحمن، مولانا فصیح الرحمن، جمیل الرحمن، ملیح الرحمن)



عادات و خصائل

مولانا محمد کامران اجمل

مدرس جامعہ بنوری ٹاؤن



اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف طبائع عطا کیں اور ہر شخص کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا، کسی میں ایک خوبی رکھی تو کسی کو دوسری خوبی کے ذریعہ ممتاز کیا، کسی پر اپنا خاص فضل فرما کر کئی خوبیوں سے نوازا اور یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کے لئے مشکل نہیں کہ اپنے کسی خاص بندے کو تمام خوبیوں سے نواز دے۔

وَلِيْسَ عَلَى اللَّهِ بِمُسْتَنَكِرٍ

أَنْ يَجْمَعَ الْعَمَالُ فِي وَاحِدٍ

تمام صفات و کمالات سے متصف ذات تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اس کے علاوہ مختلف خوبیوں سے متصف اشخاص کو اللہ تعالیٰ مختلف اوقات میں پیدا فرماتے رہتے ہیں اور ان سے اپنے دین کے مختلف شعبوں میں کام لیتے ہیں، انہیں اشخاص و رجال کا میں سے ایک ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ بھی تھے، جنہیں خدا تعالیٰ نے بہت سے کمالات سے نوازا، بہت خوبیاں عطا کیں، جن کی زندگی قابل رشک تھی، جن کی شہادت سے بہت سی آنکھیں اشک بار ہوئیں، بہت سے دماغوں پر اس غم نے اثر کیا، بہت سے دل ابھی تک اسے تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔

استاذ محترم سے چھیس، ستائیس سال کے عرصے میں ایک بہت بڑی جماعت نے استفادہ کیا، بہت بڑی کھیپ ان کے دورِ تدریس و نظامت میں تیار ہوئی، ہزاروں طالبانِ علوم نبوت نے ان کے سامنے بیٹھ کر فرامینِ رسول کو سیکھا، سینکڑوں خطباء و مقررین پیدا ہوئے، ان حضرات و اشخاص کی تعداد بھی کم نہیں، جنہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے تحریک لی، اپنے مضامین کی نوک پلک سنواری، اپنے قلموں کے ذریعے دعوتِ دین کا کام سرانجام دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ان کے دنیا سے جانے کے بعد بہت سارے حضرات نے ان پر لکھا اور لکھ رہے ہیں، درج ذیل تحریکی مضمون یا خاص سوانح نہیں، بلکہ چند منتشر واقعات کو جمع کر کے ان سطور میں جمع کیا ہے، گو مرتب نہیں، لیکن خود اپنے ساتھ بیٹے ہوئے چند واقعات یا اصل راویوں سے سنے ہوئے چند قصے ہیں، جن میں ان کی چند صفات کا بیان ہے۔ استاذ محترم کی صفات بہت زیادہ تھیں، کسی کی صفات کو کما حقہ بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا، بلکہ علامات و دلائل سے ان کی صفات پر استدلال کیا جاتا ہے اور واقعات و قصص ان صفات کی طرف اشارہ کرتے اور دلیل بنتے ہیں، اسی لئے ذیل میں صرف چند واقعات ان کی مختلف صفات پر بیان کئے جا رہے ہیں۔

قوتِ حافظہ:

اللہ تعالیٰ نے استاذ محترم کو بے پناہ حافظہ عطا فرمایا تھا، اکثر باتیں انہیں اچھی طرح یاد رہتیں، کئی کام کافی سال گزرنے کے بعد بھی یاد رہتے اور ضرورت پڑنے پر یاد دلاتے تھے، بلکہ بسا اوقات صاحبِ واقعہ وہ بات بھول جاتا اور استاذ محترم کو یاد رہتی تھی۔ مکہ مسجد کے ایک فاضل مولانا حمید الرحمن صاحب کہتے ہیں کہ: ”جب میں مکہ مسجد میں درجہ رابعہ میں پڑھتا تھا اس وقت دانت کی تکلیف کی وجہ سے جامعہ آیا تھا، کلینک میں مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے تکلیف کا پوچھا، میں نے دانت کے درد کا ذکر کیا، پھر مزید چار سال میں نے مکہ مسجد میں پڑھا، جب تخصصِ علوم حدیث کے لئے جامعہ آیا تو داخلہ کے کچھ عرصہ بعد استاذ جی سے ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے: ”حمید! تمہارے دانت کا درد کیا ہے؟“

ایک مرتبہ جامعہ کے ایک فاضل دینی جانا چاہتے تھے، استاذ محترم نے اپنے چھوٹے بھائی کو بتلایا کہ جامعہ کا فاضل آ رہا ہے، ان کا ذرا خیال رکھیں، پھر کسی وجہ سے وہ صاحب وہاں نہ جاسکے، اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے، صاحبِ واقعہ کے بھائی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ پرانا ہونے کی وجہ سے ہمیں یاد بھی نہ تھا، لیکن استاذ جیؒ نے شہادت سے کچھ عرصہ پہلے پوچھا کہ تمہارے بھائی دینی جانا چاہتے تھے، پھر گئے تھے یا نہیں؟ صاحبِ واقعہ کہتے ہیں کہ میرے ذہن سے یہ بات نکل چکی تھی اور مجھے صحیح یاد بھی نہ تھی، لیکن استاذ محترم کو بخوبی یاد تھی۔ دورانِ درس اکثر گزشتہ اسباق کا حوالہ دے کر فرماتے: ”یہ بات آپ نے فلاں کتاب میں پڑھی ہے، وہاں یوں مذکور ہے“ وغیرہ۔ کسی طالب علم کو دیکھ لیتے، نام معلوم کر لیتے تو برسوں وہ نام یاد رکھتے تھے اور بسا اوقات نام لے کر مخاطب کرتے تھے۔

احتیاط و ورع:

ہاں سے پلیٹوں میں کوئی چیز آئی، پلیٹیں دیکھیں تو وہ جامعہ کے مطعم کی پلیٹوں سے مشابہ تھیں (اگرچہ جامعہ کی نہ تھیں لیکن) فرمانے لگے: یہ پلیٹیں فوراً جن کی ہیں، انہیں بھجوا دو۔

ایک طالب علم تخصص میں داخلہ کا خواہشمند تھا، اور امتحان دے کر کامیاب بھی ہو چکا تھا، استاذ محترم کو یہ معلوم تھا کہ یہ طالب علم داخلہ کا خواہشمند ہے، لیکن یہ علم نہ تھا کہ اس کا داخلہ ہو چکا ہے، اس طالب علم نے استاذ جی کے جوتے اٹھا کر ان کے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو استاذ محترم نے منع فرمایا اور پھر پوچھا: داخلہ ہو گیا؟ طالب علم نے بتایا کہ: ہاں! ہو گیا، تب اسے جوتے دیئے اور فرمایا: ”اصل میں بعض طلبہ جوتے اٹھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمارا داخلہ ہو جائے گا، اس لئے میں نہیں دینا چاہتا تھا، اب چونکہ تمہارا داخلہ ہو چکا ہے، لہذا اٹھا لو۔ ایک بار ایک طالب علم نے مطالعہ کے لئے کتاب استاذ محترم کو دی، مطالعہ کرنے کے بعد کسی طالب علم کے ہاتھ بھجوائی، پھر ملاقات کے وقت کئی بار پوچھا کہ آپ کو آپ کی کتاب مل گئی یا نہیں؟ اور ایسا کئی ملاقاتوں میں کیا۔

وفاداری:

حضرت استاذ محترم مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کا ایک خاص وصف جو ہر خاص و عام جانتا تھا ان کی وفاداری تھی، وفاداری میں تو گویا استاذ جی ضرب المثل تھے، چھوٹے سے چھوٹے سفر میں بھی اگر کوئی ساتھ ہوتا اس کا پورا خیال رکھتے اور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک نکاح میں شرکت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، ایک طالب علم سواری لے کر حاضر ہوا، نکاح پڑھانے کے بعد کچھ کھانے کا انتظام تھا، استاذ محترم نے فرمایا: ”آپ کی جو ترتیب ہے، ذرا جلدی کریں، میرے اس ساتھی کو کہیں جانا ہے۔“ صاحب خانہ نے آسانی کی غرض سے کہا کہ: ”اگر یہ جانا چاہتے ہوں تو چلے جائیں، آپ آرام سے کھانا کھالیں، سواری کا بندوبست ہے، آپ کو گھر پہنچا دیں گے۔“ استاذ محترم غصہ ہوئے، فرمانے لگے: ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ یہ میرا ساتھی ہے، میں اس کو ویسے ہی نہیں چھوڑ سکتا، میں اس کے ساتھ آیا ہوں، اسی کے ساتھ جاؤں گا۔“

ایک مرتبہ تعلق والے کی دعوت میں شرکت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، ایک طالب علم کو بھی وہیں جانا تھا، اسے بھی ساتھ لے لیا، دعوت والی جگہ پہنچ کر دیکھا تو اساتذہ بیٹھے تھے اور استاذ محترم کو ساتھ بٹھانا چاہتا تو فرمایا: ”آپ بیٹھیں“ اور ایک الگ جگہ جا کر اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے جن کے ساتھ آئے تھے اور اس طالب علم کو بھی ساتھ بٹھایا اور واپسی میں بھی ساتھ لے گئے۔

ایک دفعہ مولانا عرفان شہیدؒ پڑا کو نے پستول رکھی اور موٹر سائیکل چھیننے کا ارادہ کیا، استاذ محترم نے دیکھا تو فوراً اس ڈاکو پر جھپٹ پڑے، آپ کو منع بھی کیا گیا، لیکن استاذ جی پیچھے نہ ہٹے، اس شخص نے پستول استاذ جی کی طرف پھیر کر ٹریگر کو دبایا بھی، لیکن گولی نہ چل سکی۔ غرض وفاداری میں اپنی زندگی بچانے کی فکر کے بجائے اپنے ساتھی کا ساتھ دیا، اگرچہ موت بالکل سامنے تھی۔

استاذ محترم حج و عمرہ پر جانے کو خوب پسند کرتے بھی تھے اور ہر سال کوشش بھی فرماتے، جس سال نہ جاسکتے تو پریشان اور مغموم رہتے تھے، لیکن وفاداری کی صفت کا اس قدر غلبہ تھا کہ بسا اوقات اپنی محبوب ترین چیز حج و عمرہ کو بھی قربان کر دیتے۔ آخری یعنی موجودہ سال حج پر اس وجہ سے نہ جاسکے کہ ایک فاضل نے استاذ جی کا پاسپورٹ لے کر ویزے کی کوشش کی، لیکن ویزہ نہ لگ سکا، پھر استاذ محترم نے ان کا پاسپورٹ لے کر خود ویزہ لگوانے کی کوشش کی تو جواب ملا کہ آپ کا ویزہ الگ جائے گا، دوسرا نہیں لگ سکتا، چونکہ اس فاضل نے پہلے استاذ جی کے لئے کوشش کی تھی، اس لئے استاذ جی نے فرمایا کہ: میرے ایک نہیں دو پاسپورٹ ہیں، دونوں کے ویزے لگ سکتے ہیں تو جاؤں گا، ورنہ نہیں۔ اس فاضل نے بہت اصرار کیا کہ استاذ جی! آپ کا ویزہ الگ رہا ہے تو آپ چلے جائیں، میں پھر چلا جاؤں گا، لیکن استاذ جی نے فرمایا کہ: نہیں! جب تک دونوں ویزے نہ لگے ہوں، نہیں جاؤں گا اور بالآخر نہیں گئے۔ (اگرچہ مغموم بہت تھے، لیکن وفاداری کی وجہ سے نہیں گئے)۔

سنجیدگی و وقار:

اللہ تعالیٰ نے حضرت شہیدؒ کو سنجیدگی و متانت سے بھی خوب نوازا تھا، بہت زیادہ خوشی کا موقع ہو یا انتہائی غمگین معاملہ ہو، کبھی غیر سنجیدہ نہ ہوئے، اگرچہ ہنسی کے موقع پر کھل کھلا کر ہنس بھی لیتے تھے، لیکن کبھی کوئی خلاف وقار کام آپ سے سرزد ہوتے نہ دیکھا گیا۔ ایک سال کلاس میں اپنے مخصوص انداز میں شعر سنائے، کچھ طلبہ نے داد دینے کے لئے سبحان اللہ کہا، بہت غصہ ہوئے اور فرمانے لگے: ”یہ درس گاہ ہے، اس کے وقار کو خراب نہ کرو، کوئی جلسہ گاہ نہیں کہ تم داد دے رہے ہو، تم میں سے بہت سارے ویسے ہی سبحان اللہ کہہ رہے ہیں اور وہ اس شعر کا معنی تک نہیں سمجھ رہے ہوں گے۔“ غرض انتہائی ناراضگی کا اظہار کیا، پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے گھٹنے میں اس قسم کی آواز نکالے۔

حضرت مفتی ڈاکٹر نظام الدین شامزئی شہیدؒ کی شہادت کے موقع پر بہت سارے صبر و تحمل کے پہاڑ بھی اس جانکاہ حادثے کی وجہ سے ٹڈال تھے، لیکن استاذ محترم مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اس موقع پر بھی صبر و تحمل سے رہے اور اس موقع پر بھی غیر سنجیدہ یا جذباتی کوئی بات نہ کی، البتہ انتہائی شدید صدمہ ہونے کی وجہ سے صرف اس قدر دیکھا کہ مہمان خانے کے باہر بیچ پر بیٹھے اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹیکے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے آنے کی صورت میں طلبہ میں بد نظمی کو بالکل برداشت نہ کرتے، بلکہ یہی تلقین کرتے کہ باوقار رہو، اس طرح کسی کے سامنے گم گھٹا بنانا وقار کے خلاف ہے۔ ٹھیک ہے مہمان کی محبت و عظمت ہو، لیکن اس طرح نہیں کہ انسان بے وقاری کا مظاہرہ کرے۔

رعب و کشش:

انتہائی سنجیدگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رعب بھی اس قدر عطا فرمایا تھا کہ ہر کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے کسی قسم کی حرکت کرے، البتہ جو استاذ محترم کے قریب ہو جاتا وہ اس قدر محبت میں سرشار ہو جاتا کہ پھر ان کے پاس سے ہٹنے کو دل نہ چاہتا تھا، انہیں دیکھ کر وہ منظر بالکل سامنے ہوتا تھا کہ ”من راہ بداهۃ ہابۃ و من خالطہ معرفۃً أحبۃ“۔ یعنی جو انہیں دور سے دیکھتا تو مرعوب ہوتا اور جو طلبہ ان کے قریب جاتے وہ ان سے اس قدر محبت کرتے کہ گھنٹہ ختم ہوتے ہی استاذ جی کو تلاش کر کے ان کے پاس جانے کی کوشش کرتے۔

حضرت لدھیانوی شہیدؒ کی شہادت کے موقع پر کچھ لوگ جہانگیر روڈ کی ٹریفک بند کر رہے تھے، استاذ محترم دیگر اساتذہ سمیت گاڑی میں طلبہ کو جامعہ بھیجنے کے لئے چکر لگا رہے تھے، جب گاڑی جہانگیر روڈ پہنچی تو ایک صاحب نے ڈنڈے کے ذریعے ان کی گاڑی روکنے کی کوشش کی اور سامنے آ کر کھڑے ہو گئے، بندہ نے جب دیکھا تو اسے بتایا کہ: جامعہ کے اساتذہ ہیں، کہنے لگا: سب کے لئے ایک حکم ہے، جب اس نے گاڑی روکی، شیخ عطاءؒ گاڑی سے اترے اور اسے کہا کہ: گاڑی میں بیٹھو، اس شخص نے جب استاذ محترم کو دیکھا تو بہت گھبرایا اور معافی مانگنے لگا، تب حضرت شہیدؒ نے فرمایا: ”میری ضمانت پر بیٹھ جاؤ“ بعد میں جب اسے دیکھا تو ایسا پرسکون تھا گویا کچھ دیر پہلے والا شخص نہیں۔ بہر حال خدائے تعالیٰ نے استاذ محترم کو رعب و کشش عطا فرمائی تھی، وہ انہیں کا خاصہ تھا، بہت سارے لوگ ان کی کشش کی وجہ سے ان کی طرف کھینچے چلے جاتے تھے، ایک مرتبہ قریب آئے تو پھر اسی محفل کے ہو کر رہ گئے اور یوں گویا ہوتے:

تری آباد محفل میں جو ہم نے دن گزارے تھے

قلم لکھنے سے قاصر ہے وہ لمحے کتنے پیارے تھے

ایک بار مسجد علیؑ میں استاذ محترم مولانا عادل صاحب مدظلہ کے کمرے میں تشریف فرما تھے، کسی نے آ کر جب دور سے دیکھا کہ حضرت شہیدؒ موجود ہیں تو واپس چلا گیا، ایک چھوٹے بچے نے آ کر حضرت شہیدؒ سے کہا: ایک آدمی آپ کو دیکھ کر بھاگ گیا، فرمانے لگے: ”ہاں غلط آدمی میرے سامنے آنے سے ڈرتا ہے، جو آدمی صحیح ہو گا وہ مجھ سے بھاگے گا نہیں“، گویا نہ جاننے والا اس قدر گھبراتا تھا کہ:

یذیب الرعب منه کل عصب

فلولا الغمد یمسکہ لیسلاً

اخفاء حال و اخلاص:

استاذ محترم حضرت شہیدؒ پر اخفاء حال کا بے حد غلبہ تھا کہ نام و نمود کو بالکل برداشت نہیں کرتے تھے، کبھی کسی نے سابقہ لاحقہ کے ساتھ نام لینا چاہا تو سختی سے منع فرما دیتے تھے، عبادات و ادعیہ کو اس طرح چھپایا تھا کہ ”أسمعت من ناجیت“ کا اس زمانہ میں ایک عملی نمونہ تھے، کبھی عبادات کو نہ ظاہر کرتے اور نہ کسی سے اس کے بارے میں سننا پسند کرتے، اس قدر اپنے آپ کو چھپایا کہ کبھی کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ تصوف، اہل تصوف اور سلوک کی راہوں سے بھی کچھ تعلق ہے یا نہیں؟ بلکہ بارہ تیرہ سال ان کی شفقتیں محبتیں دیکھ کر اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کسی سے بیعت بھی کی ہے یا نہیں؟

چالیس روزہ کورس کی نصابی کتابوں کے نگرانی کے لئے رات دیر تک بیٹھے رہتے اور اپنی زیر نگرانی تمام کتابیں مکمل کروائیں، لیکن اپنا نام تک نہ دیا، بلکہ تقریظ یا پیش لفظ تک خود نہ لکھا، اس سے بڑھ کر یہ کہ جب مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ نے تقریظ میں استاذ جی کا نام لکھا تو وہ نام کٹوا دیا۔

اخفاء حال کا اس قدر غلبہ تھا کہ ایک اللہ والے کے بقول: ”ساری زندگی، میں دو آدمیوں کے تعلق مع اللہ کے بارے میں شک میں رہا، لیکن جب عمرہ کے سفر میں انہیں دیکھا، ان کی عبادت و ریاضت دیکھی، تب معلوم ہوا کہ یہ دونوں حضرات اللہ تعالیٰ سے کس قدر تعلق رکھنے والے تھے، ان میں سے ایک مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ تھے اور دوسرے مولانا فضل الرحمن صاحب۔

تواضع:

تواضع و انکساری اس قدر تھی کہ جامعہ بنوری ٹاؤن جیسے عالمی ادارے کا ناظم تعلیمات ہونے کے باوجود عام بسوں میں یا موٹر سائیکل وغیرہ پر سفر فرماتے تھے، کبھی یہ مطالبہ نہیں کہ کوئی گاڑی ہو یا کوئی پروٹوکول۔ ایک بار وفاق المدارس کی طرف سے مراکز کے دوروں کے لئے روانہ ہوئے تو ایک استاذ کو ساتھ لیا اور ایک بس کے ذریعے ایک مرکز پہنچے، وہاں سے نکل کر دوسری بس میں سوار ہوئے، اسی طرح مختلف مراکز کا دورہ بسوں کے ذریعے کیا اور آخر میں جامعہ فاروقیہ کے قریب پہنچ کر فرمایا: کچھ کھا لیتے ہیں اور پھر عام لوگوں کی طرح کچھ امرود وغیرہ لے کر وہیں بیٹھ کر کھائے اور یہ ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ کوئی بڑے عالم ہیں یا جامعہ کے ناظم تعلیمات۔

دنیا سے بے رغبتی:

مولانا کے دل میں دنیا سے بے رغبتی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اگر وہ چاہتے تو اپنے لئے بہت کچھ بنا سکتے تھے، اپنے منصب اور جاذبیت کے باوجود ان کا طرز زندگی اُن کی دنیا سے بے رغبتی پر واضح دلیل ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی دنیا سے بے رغبتی ہی ایسی چیز تھی، جس نے ان کو اتنا جاذب نظر انسان بنایا تھا، سچ ہے: ”ازھد فی الدنیا یحبک اللہ و ازھد فیما عند الناس یحبک الناس“۔ ہمیشہ مسافروں کی سی زندگی گزاری، کراچی میں پینتیس سال سے زیادہ قیام، صدر کی مرکزی جامع مسجد میں امامت اور نظامت تعلیم کے باوجود اپنے لئے کوئی عالی شان مکان نہ بنوایا، بلکہ کراچی میں کوئی مکان بنایا ہی نہیں، اور گاؤں میں بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ رہا کرتے تھے، بلکہ طلبہ اور اپنے صاحبزادوں کو یہ سمجھایا کرتے تھے کہ: ”یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ہمارے والدین نے ہمارے لئے کچھ چھوڑا نہیں۔“

ایک مرتبہ بندہ صبح مدرسہ کے لئے آ رہا تھا، جہاں گلیروڈ پر دیکھا کہ استاذ محترم اکیلے سڑک کے کنارے کھڑے ہیں، بندہ نے جا کر پوچھا کہ: استاذ جی! کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ فرمانے لگے: ”ایک جاننے والے کے رشتہ دار کا سہراب گوٹھ میں انتقال ہوا ہے، ان کی تعزیت کے لئے جا رہا ہوں“ میں نے عرض کیا: ”استاذ جی! گاڑی؟“ فرمانے لگے: ”یہ ساری گاڑیاں ہماری ہی تو ہیں، ابھی W-11 آ جائے گی اور بیٹھ کر چلا جاؤں گا۔ ایک عزیز کے بقول: استاذ جی کے والد محترم مدظلہ العالی نے زمین خریدی، تو عزیز کے سامنے استاذ جی نے فرمایا: ”مجھے یہ چیزیں سمجھ نہیں آئیں، بس جس وقت جس چیز کی ضرورت ہو وہ ملے، باقی یہ زمینیں وغیرہ مجھے سمجھ نہیں آتیں“۔ ایک استاذ صاحب فرمانے لگے: استاذ جی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: ”ہم ناظموں کا کیا ہے؟ ادھر اپنے کپڑے اور سامان وغیرہ اٹھایا اور چل دیئے اور ہماری ہے ہی کیا چیز؟“۔

استغناء:

یہی دنیا سے بے رغبتی تھی جس کی وجہ سے استاذ محترم کسی سے مرعوب نہ ہوتے اور کسی سے کسی چیز کی توقع اور امید نہ رکھتے، بلکہ استغناء کا معاملہ رکھتے تھے، باوجود سب کچھ کے اپنی وضع قطع ایسی رکھی تھی کہ بالکل انکے بارے میں پتہ نہ چل سکتا تھا، کبھی کسی مال والے کی طرف جھکاؤ نہ کرتے، بلکہ ہمیشہ مخلصین کا چناؤ فرماتے، چاہے وہ مالدار ہو یا غریب۔

طلبہ و متعلقین پر شفقت:

شفقت کی صفت استاذ جی کی ذات میں علی وجہ الائم پائی جاتی تھی، کبھی کسی طالب علم یا متعلق کو پریشانی میں مبتلا دیکھتے تو فوراً اس کی مدد کی کوشش کرتے، کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا یا کسی دوسری پریشانی میں مبتلا ہوتا کوشش یہی کرتے کہ کسی طرح اس کا یہ مسئلہ حل ہو جائے، اور یہ راحت و سکون پالے۔ بندہ کا جب جامعہ میں تقرر ہوا تو یہاں تک پوچھا کرتے تھے کہ کس راستے سے آتے ہو؟ فلاں راستے کے بجائے اگر فلاں راستہ اختیار کرو تو زیادہ بہتر ہے، آتے کس طرح ہو؟ کس کے ساتھ آتے ہو؟ راستہ میں احتیاط سے آیا کرو اور دعاؤں وغیرہ کا خوب اہتمام کیا کرو، راستوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے، کس وقت سے کس وقت تک جامعہ میں ہوتے ہو؟ غرض ایک ایک چیز کے بارے میں خبر گیری فرماتے اور جہاں کوئی خیر خواہی و ہمدردی کی بات ہوتی تو اپنی پدرانہ شفقت کی بناء پر صحیح طریقہ اور ترتیب سمجھاتے تھے۔

استاذ محترم کے ایک شاگرد کے ساتھ سفر میں چوری کا حادثہ ہوا، استاذ جی کو اس ساتھی کے والد کے ذریعے علم ہوا، گھنٹہ بعد اسے فون کر کے ارشاد فرمایا کہ: پولیس یا دیگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں فلاں استاذ سے بات کر چکا ہوں، انہیں فون کر لیں، وہ تمہیں ترتیب سمجھا دیں گے، یعنی صرف سن کر تسلی ہی نہیں دی، بلکہ اس کے لئے کوشش بھی کی، جب رابطہ وغیرہ کر چکے تب اپنے شاگرد کو فون کیا۔

ایک طالب علم کے والد کا کسی کے دھکا دینے سے انتقال ہوا، اس طالب علم کا استاذ محترم سے کوئی خاص تعلق بھی نہ تھا، بلکہ مدرسہ میں اس کا پہلا سال تھا

اور حضرت شہیدؒ سے کچھ پڑھا بھی نہ تھا، لیکن جب استاذ محترم کو معلوم ہوا فوراً اس کے ساتھ تعاون کے لئے مدرسہ کے امور متفرقہ کے ایک ذمہ دار شخص کو فون وغیرہ کر کے باخبر کیا اور ان کے ذریعے پولیس وغیرہ کی کارروائی بھی مکمل کروائی اور آخر تک تمام مراحل میں اس طالب علم کے بارے میں معلوم کرتے رہے۔

کبھی کسی طالب علم کی چھٹی کا مسئلہ ہو یا اس میں صلاحیت دیکھیں اور اس کے داخلے کا مسئلہ ہو تو اس کے لئے کوشش فرماتے تھے، اور بسا اوقات مصروف ہونے کی صورت میں کسی کے ذمے لگاتے کہ اس کے ساتھ رہو اور داخلے وغیرہ کا طریقہ کار بتلاؤ، جب اس کا داخلہ ہو جائے تب مجھے بتلانا۔ شاگردوں کی حوصلہ افزائی:

حضرتؒ اپنے شاگردوں میں کوئی صلاحیت دیکھتے تو انہیں اس کام میں آگے بڑھانے کی مکمل کوشش کرتے، ایسا بھی ہوا کہ طالب علم میں صلاحیت دیکھی اور اسے ترغیب دے کر اس کی حوصلہ افزائی کی اور وہ استاذ محترم کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے بہت آگے ترقی کر گیا۔ اپنے ساتھیوں میں اکثر دیکھا کہ جب کسی باصلاحیت ساتھی کو استاذ محترم نے دیکھا، اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ آج بھی بعض بہت قابل اور باصلاحیت اساتذہ کے بارے میں معلوم کیا جائے تو شیخ عطاءؒ کی شجیع اور آگے بڑھانے کی کوشش کا فرمانظر آئے گی۔ ایک استاذ محترم کے بقول جب ہم فارغ ہوئے اور سال کے لئے جماعت میں گئے تھے تو حضرت شہیدؒ لائے ونڈ تشریف لائے اور فرمایا: اگلے سال کیا کرو گے؟ میں نے عرض کیا: جیسا آپ حضرات فرمائیں، فرمانے لگے: جامعہ میں درخواست دے دو، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ تقرر وغیرہ کے لئے کوشش بھی فرمائی تھی۔

بے تکلفی:

اپنی بے حد حساسیت کے باوجود ہمیشہ بے تکلف رہا کرتے اور بے تکلفی کو پسند فرماتے تھے، استاذ کے ساتھ ملنے کا معاملہ ہو، راستے پر چلنے کا معاملہ ہو، کھانے پینے کا معاملہ ہو، حتیٰ کے اٹھنے بیٹھنے کا معاملہ ہو، ہر چیز میں بے تکلفی کو پسند کرتے تھے، کسی کو تکلف کرتے ہوئے دیکھتے تو بے حد بوجہ محسوس کرتے تھے، اسی سال کی ابتداء میں ٹیبل پاڑہ میں مولانا عادل صاحب مدظلہ کے چچا کے جنازے میں شرکت کے لئے تشریف لائے، نماز جنازہ پڑھائی، طلبہ جنازہ کے بعد استاذ جیؒ کے پاس جمع ہو گئے بندہ سے پوچھا: جامعہ جاؤ گے؟ بندہ نے عرض کیا: جاؤں گا، فرمانے لگے: بس میں تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا، باقی ساتھیوں سے فرمایا: آپ حضرات تکلف نہ کریں، بس قبرستان کی طرف جانا ہو تو جائیں، بندہ کا ابتداء ارادہ تھا کہ قبرستان چلا جائے، لیکن استاذ جی کی وجہ سے ارادہ ملتوی کر لیا، استاذ جی نے بھانپ لیا، ایک اور فاضل جامعہ ہی کی طرف جارہے تھے، بندہ سے فرمایا: آپ قبرستان چلے جائیں، میں نے عرض کیا: میں آپ کے ساتھ چلا جاتا ہوں، فرمانے لگے: تکلف کی ضرورت نہیں، یہ اسی طرف جارہے ہیں، میں ان ساتھ چلا جاتا ہوں، آپ بے تکلف قبرستان چلے جائیں۔

ایک بار فجر کی نماز میں استاذ جیؒ سے ملاقات کے لئے جامعہ گیا، اتفاق سے استاذ جی ہی کے ساتھ نماز میں کھڑا ہونے کا موقع ملا، نماز کے بعد ادباً تھوڑا سا پیچھے ہٹا تو فرمایا: آگے ہو جاؤ، بندہ آگے ہوا تو رخ تھوڑا سا استاذ جی کی طرف پھیرا، پھر فرمایا: سیدھے بیٹھو۔ اس قدر تکلف کو بھی اپنے بارے میں برداشت نہیں فرماتے تھے۔ جب طلبہ مسجد میں بطور مہمان جاتے اور بیٹھنے میں ذرا احتیاط کے انداز میں بیٹھتے، فرماتے: بے تکلف ہو کر بیٹھو! گویا اپنی زندگی میں صحابہ کرامؓ کی خاص صفت ”اقلہم تکلفاً“ پر خوب عمل پیرا تھے اور اپنے عمل سے گویا یہ ظاہر فرماتے کہ۔

اے ذوق! تکلف میں ہے تکلیف سراسر

اچھے ہیں وہ لوگ جو تکلف نہیں کرتے

تحقیقی مزاج:

اللہ تعالیٰ نے تحقیقی مزاج خوب عطا فرمایا تھا، چالیس روزہ کورس کی کتابوں کے مرتب کرتے وقت دعاؤں، ان کے الفاظ کے تلفظ اور ان کی صحت کا خوب التزام فرماتے اور تحقیق کروا کر لکھواتے۔ دورانِ درس بہت مواقع ایسے آئے جہاں پر استاذ محترم کسی لفظ یا بحث کی تحقیق فرماتے تو اسے خوب واضح دلائل کے ساتھ ثابت فرماتے تھے، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ اس بحث کی تحقیق ذہن میں مختصر نہ ہوتی اور کوئی اشکال پیدا ہو جاتا تو جب تک وہ حل نہ ہو جاتا سکون نہ ملتا اور اس کا بار بار تذکرہ فرماتے رہتے، بلکہ ایسا بھی اکثر دیکھا گیا کہ سبق پڑھایا اور پڑھانے کے بعد بھی اس پر خوب غور فرماتے رہے، اگلے دن آکر دوبارہ اس سبق میں مزید مثالوں سے سمجھاتے، اگر غور و فکر و مزید تحقیق کے بعد اپنی بات درست معلوم نہ ہوتی اور کلاس کے کسی طالب علم نے صحیح رائے ذکر کی ہو تو اگلے دن آکر اس سے دوبارہ پوچھتے اور فرماتے: اس نے جو بتایا تھا، وہی صحیح تھا اور اس کی صحت کی وجہ بتاتے۔ شہادت سے کچھ

عرصہ قبل دورانِ درس حدیث ایک روایت میں ذکر آیا کہ: ”ایمن غلام حضرت عائشہؓ کے پاس گھر گیا“، استاذ محترم نے اس کی تحقیق کی کہ یہ ایمن غلام کون ہے؟ صاحب فتح الباری نے ان کے بارے میں کوئی خاص بات اس حدیث کے ضمن میں ذکر نہیں کی، البتہ علامہ عینیؒ نے ذکر کی ہے کہ یہ تابعی ہیں اور ”ابن ابی عمرو المحرقی القرشی“ کے مولیٰ ہیں۔ اس پر اشکال یہ تھا کہ جب حضرت عائشہؓ کے محرم نہ تھے تو ان کے پاس جانے کا ذکر کیسے ہے؟ اس کا جواب علامہ عینیؒ نے یہ دیا ہے کہ: ”ودخول ایمن علی عائشہؓ إمامہ کان قبل آیۃ الحجاب أو من وراء الحجاب“۔ حضرت استاذ فرماتے کہ: یہ آیۃ الحجاب سے پہلے کیسے ممکن ہے؟ جبکہ ایمنؒ مذکور کو علماء نے تابعی لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ آیۃ الحجاب کا نزول حضور ﷺ کے زمانے میں ہوا تو پھر ایک تابعی کا آیۃ الحجاب سے پہلے جانے کا کیا مطلب ہے؟ اور عمر کے لحاظ سے بھی وہ چھوٹے ہیں، محض مین میں سے بھی نہیں۔ غرض ابھی اس کی تحقیق پوری نہ ہو سکی اور طلبہ کے ذمہ بھی لگا رکھا تھا کہ آپ حضرات بھی معلوم کریں، ابھی استاذ محترم کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تھی کہ داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اسی طرح دعاؤں وغیرہ میں بھی جن الفاظ کے بارے میں فرماتے کہ: یہ الفاظ احادیث کی کتابوں میں نہیں ملے، بہت تلاش کے باوجود بھی بندہ کو وہ الفاظ نہ مل سکے اور بات وہی صحیح پائی جو استاذ محترم نے فرمائی تھی۔

دروود شریف کا اہتمام:

حضرت شہیدؒ سے پڑھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ سبق کے دوران جب آقائے نامدار ﷺ کا نام گرامی لیتے تو اس پر کیف اور پر لطف انداز سے لیتے کہ پوری درس گاہ ان کی آواز سے گونج اٹھتی اور درود شریف کے پڑھنے کا انداز اتنا عمدہ ہوتا کہ سامنے والا درود شریف کے پڑھنے پر گویا مجبور ہوتا۔ اکثر درس گاہ میں فرماتے تھے کہ: ”مجھ سے درود کا پڑھنا سیکھ لو، درود صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھا کرو، جلدی کی وجہ سے درود کا حلیہ نہ بگاڑو۔“ اس بات پر اکثر تنبیہ فرماتے کہ: ”ابھی صحیح نہیں پڑھو گے تو پھر فارغ ہو جاؤ گے اور صحیح درود پڑھنا بھی نہیں آئے گا۔“۔ درود شریف کا اس قدر اہتمام تھا کہ کمپیوٹر میں پہلے سے محفوظ شدہ درود لکھنے سے منع کرتے، بلکہ فرماتے کہ درود پورا لکھا کرو۔ یہ پہلے سے محفوظ شدہ درود نہ لکھا کرو، یہ درود جب تک لکھا رہے گا، تمہارے لئے باعثِ اجر و ثواب ہوگا، ہم نے حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ سے یہی سیکھا ہے۔

اکابر پر اعتماد:

اکابر پر اعتماد جو حضرت شہیدؒ کے ہاں دیکھا وہ قابلِ رشک و تقلید تھا، ہر وقت اکابر پر اعتماد کی ترغیب دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے: ”اکابر پر اعتماد کرنا سیکھو۔“ بات بات میں تنبیہ فرماتے کہ خدارا! شنو و اختیار نہ کرو، اپنی باتوں کے منوانے کے چکر میں نہ رہو، بلکہ یہ اکابر جو کہیں ان کی مانو، بہت سارے فتنوں سے نجات پاؤ گے، یقیناً یہ بات صحیح ہے: ”البرکۃ مع اکابر کم“۔ ان کی عادت مسلم شریف میں یہ تھی کہ ”حدثنا“ سے پہلے جہاں لفظ ”قال“، ”نہیں لکھا ہوتا وہاں لفظ ”قال“ نہ پڑھتے تھے، بندہ نے ایک بار تذریب الراوی کی وہ بحث جہاں ”قال“ کے وجوب کا ذکر ہے، استاذ محترم کو مسجد کے برآمدے میں جا کر دکھائی، فرمانے لگے: ”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ہم نے اپنے اساتذہ سے نہیں سنا ہے، اس لئے نہیں پڑھتا۔“ جب بندہ تخصص فی علوم الحدیث میں داخل ہوا تب معلوم ہوا کہ اس پر ”محمد بن احمد بن حنبل“ نے مستقل رسالہ ”رسالة فی جواز حذف قال عند قولهم حدثنا“ لکھا ہے جو ”خمیس رسائل فی علوم الحدیث“ میں چھپ چکا ہے۔ سبحان اللہ! اکابر پر اعتماد دکھانے کا کتنا انوکھا انداز تھا؟! یقیناً یہ کتاب استاذ محترم کی نگاہوں سے گزری ہوگی، مگر بجائے کتاب کا نام لینے کے نسبت اساتذہ کی طرف کی کہ: ”ہم نے اپنے اساتذہ سے نہیں سنا۔“

چہرہ شناسی و فراست:

ویسے تو بندہ حضرت استاذ محترم کے بارعب چہرہ، گرج دار آواز، وجیہ شخصیت سے درجہ حفظ سے ہی آگاہ تھا، لیکن اس زمانے میں صرف اس قدر جانتے تھے کہ امتحان کے نتائج کے موقع پر نتائج کا اعلان کرنے والے ہیں، اس کے علاوہ نہ ان کا نام آتا تھا، نہ کچھ اور خبر تھی۔ جب درجہ اولیٰ میں داخلہ لینے آیا تو سب سے پہلی صفت جو استاذ جی کی دیکھی وہ ان کی چہرہ شناسی اور فراست تھی، داخلہ وقت دار الحدیث کے پہلے دروازے کے قریب استاذ جیؒ اور مولانا عادل صاحب مدظلہ ایک ساتھ بیٹھے جائزہ لے رہے تھے، دار الحدیث کے اندر اور درس گاہ سے باہر ایک لمبی قطار داخلہ کے خواہشمند طلبہ کی لگی تھی، بندہ جب جائزہ دینے کے لئے قریب بیٹھا اور جائزہ دینے لگا تو خادم کو آواز دی اور دو بیٹھے ایک خواہشمند کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ: اس کا سرٹیفکیٹ لے آؤ، خادم صاحب جب اس لڑکے کے قریب پہنچے تو استاذ محترم کا اشارہ دیکھنے کی وجہ سے فوراً بھاگ گیا، استاذ محترم نے فرمایا: ”میں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ اس کی سند جعلی ہے۔“ پھر ایک اور کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے بھی لے آؤ، جب اس سے سند لائی گئی تو اس سے کہا: سچ بتاؤ، یہ سند جعلی نہیں؟ اس

نے کہا کہ: اصلی ہے۔ خادم سے کہا: اسے روکے رکھو، وہ بھی بھاگ گیا، پھر فرمایا: اسے سند دے دو اور لائن میں بیٹھنے مت دو۔ ایک بار بندہ دفتر میں استاذ محترم کے پاس بیٹھا تھا، ایک شخص دفتر میں داخل ہوا، استاذ محترم نے دیکھتے ہی فرمایا: ”فلاں مسلک سے تعلق رکھنے والا ہے“ (حالانکہ اس کے چہرے سے مکمل طور پر واضح نہ تھا) قریب بیٹھے دوسرے استاذ صاحب نے فرمایا کہ: یہ کیسے کہا آپ نے؟ استاذ جی نے بندہ سے فرمایا: جا کر وہ قریب بیٹھے ہوئے استاذ سے پوچھ آؤ، استاذ نے بتایا: ”فلاں مسلک کی کسی تنظیم کے سربراہ ہیں“۔ اور یہ اسی مسلک کا ذکر کیا جو استاذ جی نے فرمایا تھا، اس پر حضرت شہید رحمہ اللہ فرمانے لگے کہ: ”جب یہ دفتر سے داخل ہوا، میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ فلاں مسلک سے تعلق رکھتا ہے“۔

داخلوں کے ایام میں ایک داخلے کا خواہشمند طالب علم استاذ جی کے پاس آیا اور چالیس روزہ کورس کے بارے میں پوچھنے لگا، حضرت شہیدؒ نے ایک طالب علم کو بلوا کر فرمایا: اس کی بات سنو اور اسے کورس کے بارے میں سمجھاؤ، جب یہ شخص طالب علم کے ساتھ بیٹھا، طالب علم نے اسے سمجھانا شروع کیا تو یہ توجہ نہیں دے رہا تھا، پھر خود ہی اس طالب علم کو بتایا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ میں کورس کی بات کر کے استاذ جی کے قریب ہو جاؤں گا اور پھر اپنے داخلے کی بات کروں گا، وہ طالب علم بھی اس سے رخصت ہو گیا، جب استاذ محترم سے ملاقات ہوئی تو استاذ جی نے اس شخص کے بارے میں پوچھا تو طالب علم نے اس کا مقصد بتایا، استاذ محترم نے فرمایا: ”میں سمجھ گیا تھا، اسی لئے آپ کے حوالے کیا تھا“۔ ایک بار کسی نے عاملوں کا ذکر کیا کہ وہ ماں کا نام پوچھ کر اس شخص کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتے ہیں، فرمانے لگے: ”مجھے ماں کا نام مت بتاؤ، اس شخص کو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دو، میں اس کے بارے میں بتاتا ہوں کہ کیا کیا کرتا ہے“۔

جامعہ کے ساتھ خلوص:

جامعہ کے ساتھ اس قدر خلوص و محبت کا تعلق تھا کہ جامعہ کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے تھے اور ہر اس فرد و شے سے محبت کرتے جس کا جامعہ سے تعلق ہو۔ ایک بار استاذ محترم جامعہ کے شرعی دروازے سے بنات کے مدرسہ میں پڑھانے تشریف لے جا رہے تھے، بندہ بھی ساتھ ہو گیا، ایک شخص نظر آئے، استاذ جی نے انہیں سلام کیا، پھر ان کی سختی کا ذکر کیا، پھر فرمانے لگے: ”یہ شخص مجھ سے بسا اوقات سخت لہجہ میں بھی بات کرتا ہے اور بڑے انداز سے ملتا ہے، لیکن یہ شخص چونکہ جامعہ کے ساتھ مخلص ہے، اس لئے مجھے محبوب ہے، اور جو شخص جامعہ کے ساتھ مخلص ہو، مجھ سے اگرچہ اس کا رویہ اچھا نہ ہو، میں پھر بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔“

اقرباء پروری سے اجتناب:

حضرت شہیدؒ کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ مولانا اقرباء پروری سے مکمل اجتناب فرماتے تھے، جبکہ دیگر بعض عام طلبہ کے کاموں میں بڑی خوش دلی سے کوشش فرماتے۔ اقرباء پروری سے اجتناب کی ایک واضح مثال ان کی اولاد، ان کے سب سے قریبی ساتھی اور بھائی وغیرہ ہیں، ان کے ہر وقت حاضر باش رفقاء اور دوست مولانا عرفان شہیدؒ، مولانا سہیل صاحب اور مولانا آصف صاحب وغیرہ جامعہ کے فضلاء ضرور ہیں، لیکن طویل رفاقت کے باوجود جامعہ کے باقاعدہ اساتذہ نہ تھے۔ خود استاذ محترم کے بھائی اور اولاد اس قدر قابل ہیں کہ جامعہ میں تقرر سے کوئی مانع اور رکاوٹ موجود نہ تھی (جبکہ ہر فاضل کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے ادارے سے تادم آخر منسلک رہے، لیکن ان حضرات میں سے کوئی بھی جامعہ میں استاذ یا کسی شعبہ میں نہیں، ان کے بھائی مولانا لطف الرحمن صاحب اور حفظ الرحمن صاحب باقاعدہ پوزیشن لینے والے طلبہ میں سے تھے، ان کے صاحبزادے مولانا مسیح الرحمن صاحب اور مولانا فصیح الرحمن صاحب بھی قابل طلبہ میں سے تھے، لیکن اب تک ان میں سے کوئی بھی جامعہ کا استاذ نہیں بنا، بڑے صاحب زادے مولانا مسیح الرحمن صاحب کو گاؤں میں اپنے والد صاحب کی خدمت میں لگایا، وہ وہیں دادا محترم کی خدمت اور تدریس میں مصروف ہیں۔

تربیت:

حضرت شہیدؒ تربیت طلبہ کا اس قدر اہتمام فرمایا کرتے تھے گویا خدا نے اسی غرض سے پیدا کیا ہو، لباس و پوشاک سے لے کر، اٹھنے بیٹھنے، بلکہ خدمت تک کے بارے میں معمولی غفلت پر فوراً تنبیہ فرماتے اور تربیت کا ایسا انداز اختیار فرمایا کرتے تھے کہ زندگی بھر وہ بات بھولتی نہ تھی، جامعہ کے تمام اساتذہ و طلبہ ان کی تربیت کے شاہد عدل ہیں، سب ہی ان کی صفت سے بخوبی واقف ہیں۔ یہاں ان کی تربیت کرنے کے چند واقعات پیش خدمت ہیں:

۱..... سلام کے معاملے میں آج کل عموماً کوتاہی ہوتی ہے، طلبہ، عوام و خواص اکثر ہی سلام کے معاملے میں مختلف قسم کی غفلتوں میں مبتلا ہیں، بعض سلام ہی نہیں کرتے، بعض سلام مصافحہ کو سمجھتے ہیں، بعض سلام کے الفاظ میں کوتاہی کرتے ہیں۔ حضرت استاذ جیؒ اس پر سخت تنبیہ فرماتے، کئی بار بیان میں اس رواج کی تردید و تشنیع کی اور صحیح انداز میں سلام کرنے کا حکم دیا، فرمایا کرتے تھے کہ: یہ طلبہ مصافحہ کرتے ہیں، سلام نہیں کرتے، بسا اوقات صرف مصافحہ

کرنے والے کا ہاتھ پکڑ کر فرماتے کہ: زبان سے سلام بھی کرو۔

۲..... ایک بار عمرے کا سفر تھا، بندہ کو علم ہوا کہ فجر کے بعد استاذ جی تشریف لے جائیں گے، بندہ فجر کی نماز میں جامعہ حاضر ہوا، حسن اتفاق سے صف میں استاذ جی کے ساتھ کھڑے ہونے کا موقع ملا، نماز کے بعد ادباً معمولی سا پیچھے ہوا، تاکہ بیٹھنے میں برابری نہ ہو، ہاتھ کے اشارے سے آگے ہونے کا فرمایا، جب میں آگے ہوا تو رخ ادباً استاذ جی کی طرف پھیرا، اس پر پھر قبلہ کی طرف رخ کرنے کا فرمایا، دعا ہو جانے کے بعد کہا: ”شاید آپ ملنے آئے ہوں گے“ اور مصافحہ اور دعا وغیرہ کر کے رخصت فرمایا: بندہ جب مسجد سے باہر آیا تو دیکھا کہ کافی طلبہ انتظار میں کھڑے ہیں، جب استاذ محترم مجلس کے دروازے کے قریب پہنچے تو طلبہ نے ملنا شروع کیا اور معافہ کرتے رہے، بندہ کے دل میں حسرت پیدا ہوئی کہ یہ طلبہ تو یہیں کے رہائشی ہیں، میں تو دور سے ملاقات کے لئے آیا ہوں اور مجھے مصافحہ کر کے رخصت کر دیا، میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ استاذ محترم نے آواز دی اور اپنے پاس بلایا، بندہ نے جلدی سے جا کر معافہ کیا، حضرت شہیدؒ فرمانے لگے: ”اس وقت معافہ اس لئے نہیں کیا کہ لوگ سوچتے کہ یہ کہاں جا رہا ہے؟ وہ لوگ بھی ملنے آتے، ان پر بوجھ ہوتا، اس لئے وہاں نہیں ملا“۔

۳..... درجہ ثانیہ میں بندہ ہدایۃ النحوی کا پی موڑ کر لکھ رہا تھا، جس سے گتے پر بھی اثر پڑ رہا تھا، استاذ محترم نے کچھ کہنے کے بجائے ہاتھ سے کا پی لی اور سیدھا کر کے فرمایا: ”اب لکھو، موڑ و مت“ استاذ محترم کا انداز اس قدر دل نشین تھا کہ اب تک دوبارہ کا پی موڑنے کی نوبت نہیں آئی۔

۴..... کچھ طلبہ مجلس دعوت و تحقیق کے راستے کے بیچ میں کھڑے گفتگو کر رہے تھے، استاذ محترم گاڑی میں تشریف لائے اور اپنے مخصوص انداز میں انہیں فرمایا: ”بیچ میں کھڑے ہو کر گفتگو کر لو“ یہ سن کر وہ طلبہ تو فوراً ہٹ گئے، لیکن وہاں سے گزرتے ہوئے یہ منظر ہمارے لئے اتنا مؤثر مری ثابت ہوا کہ اب راستہ کے بیچ میں کھڑے ہو کر گفتگو کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

۵..... ایک طالب علم گیلے ہاتھ استاذ محترم سے ملانے لگا تو فرمایا: ”ہاں دو چار سے مزید ملا لو، تاکہ تمہارے ہاتھ سوکھ جائیں“۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ اب کسی کے ساتھ تر ہاتھ نہیں ملا سکتے۔

۶..... خدمت کرنے والے سے چائے اگر سارس میں گر جاتی یا ٹرے میں، تو تنبیہ فرماتے اور اسے اٹھا کر کسی چیز سے صاف کرنے کا فرماتے۔ ان کی تربیت کے اس قدر واقعات ہیں کہ خود مستقل ایک رسالہ اس پر لکھا جائے تب جا کر کچھ حصہ سامنے آئے، ان کے شاگرد اساتذہ ہوں یا طلبہ سب ہی کی ہر وقت تربیت فرماتے تھے، آج اساتذہ اور طلبہ کو اپنے ایک محسن و شفیق استاذ کے جانے کے غم کے ساتھ ساتھ اپنے مربی و مصلح شیخ اور والد کے گم ہونے کا غم بھی ہے۔

چالیس روزہ کورس:

حضرت استاذ شہیدؒ کے جہاں اپنے شاگردوں پر احسانات ہیں، وہیں پر عوام اور عصری طلبہ پر بھی بہت احسانات ہیں، جس طرح انہوں نے جامعہ میں رہ کر درجہ اولیٰ سے دورہ حدیث تک کتابیں پڑھا کر طلبہ کی ضروریات کو پورا کیا، اسی طرح چالیس روزہ تعلیم و تربیت کورس شروع کر کے اسکول و کالج کے طلبہ کی دینی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش فرمائی، جس طرح جامعہ میں پڑھنے والے ان کے شاگرد حضرت الاستاذ کے لئے صدقہ جاریہ ہیں، اسی طرح چالیس روزہ تعلیم و تربیت کورس بھی ان کے لئے ان شاء اللہ صدقہ جاریہ رہے گا۔ جو انہوں نے اسکول، کالج کے طلبہ کی چھٹیوں کو ضائع ہونے سے بچانے اور مسلمانوں کو ان کی بنیادی تعلیمات کی طرف توجہ دلانے کے لئے شروع کیا، اس کورس کی کتابوں کے لکھنے، اس کورس کے مرتب کرنے اور اپنی مسجد صالح میں اسے شروع کرنے اور کتابوں کے چھپوانے کے تمام مراحل کی خود نگرانی کی اور اخلاص کے ساتھ یہ کورس شروع کیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کورس اس قدر پھیلا کہ نہ صرف کراچی، پاکستان بلکہ بعض ممالک میں یہ کورس شروع ہوا اور ہزاروں تشنگانِ علم نے اس چشمہ فیض سے اپنے آپ کو سیراب کیا اور بہت سارے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا۔

اللہ تعالیٰ اس کورس کو تاقیامت جاری و ساری رکھیں اور استاذ محترم کے لئے صدقہ جاریہ بنائیں اور استاذ محترم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں اور ہم سب پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرما کر ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔



حضرت عطاء شہیدؒ کا تحقیقی ذوق

مولانا مفتی محمد عمران ممتاز

فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن



جمعہ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰/۱۲/۲۰۱۲ء کو راولپنڈی کے مضافات میں واقع حسین آباد (کورال چوک) نامی دیہات میں رونما ہونے والے فضائی حادثے نے جہاں کئی آنکھوں کا اشک بار چھوڑا ہے وہاں اس حادثے کی نذر ہونے والی کئی ہستیوں کی یادوں کے اُجالے بھی تادیر باقی چھوڑے ہیں۔

استاذِ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ ایک جامع شخصیت تھے، جن کی ہر صفت کو اگر زیب قرطاس کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، ایسا کیوں نہ ہو؟ علم اور اہل علم کی محبت، اللہ اور اُس کے حبیب ﷺ سے والہانہ عشق و محبت، طلبہ کے ساتھ خصوصی شفقت، حضرت بنوریؒ سے بے پناہ عقیدت اور جامعہ سے فدایت اور فنایت کا تعلق، دنیا کی بے ثباتی پر یقین اور زہد کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونا، تربیت کا عمدہ انداز، جیسی کیسا صفات، اُن کا طرہ امتیاز تھا، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور کئی قابل تقلید اوصاف کے جامع تھے:

ولیس علی اللہ بمستنکر أن یجمع العالم فی واحد

استاذِ محترم تحقیق و تدقیق کے میدان میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے، اس فن میں ان کا منفرد انداز تھا، وہ آج کل کے ایسے روایتی محققین کی من گھڑت اور خود ساختہ تحقیقات سے ناخوش تھے، جو دین کو زمانے کے رنگ میں رنگنا دین کی خدمت سمجھتے ہیں، درس کے دوران بسا اوقات ان لوگوں پر نکیر فرماتے جو اپنی جیبوں میں اپنے من پسند فیصلوں کے لیے آیات یا احادیث کی فوٹو کاپیاں لیے پھرتے ہیں اور تحقیق کے نام پر لوگوں بلکہ علماء کے دلوں میں شکوک و شبہات کے ایسے بیج بوتے ہیں، جو مناسب موقع پر مناسب تدابیر اختیار نہ کرنے کی وجہ سے تناور درخت کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ جب استاذِ محترم درس پڑھانے سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ کے دروازہ سے نکل رہے تھے تو ایک ایسے شخص نے ان کی طرف اپنی لکھی ہوئی تفسیر بڑھائی جو تفسیر قرآن کے لئے ضروری علوم پر بھی قادر نہ تھے، حضرت استاذؒ نے پہلی سورت (سورۃ الفاتحہ) کے پہلے لفظ (الحمد للہ) سے متعلق ان سے پوچھا کہ آپ نے اس کا ترجمہ کیا ہے؟ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، اس میں لفظ ”تمام“ کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ اس پر وہ صاحبِ لا جواب ہو گئے استاذِ محترم نے فرمایا کہ اگر آپ مدرسہ میں جا کر اس فن کے ادنیٰ طالب علم سے بھی یہ سوال پوچھیں گے تو وہ آپ کو جواب دے دے گا، اس مناقشہ سے ان کی غرض صرف لا جواب کرنا نہیں تھا بلکہ مذکورہ بالا فاسد نظریہ اور لادینی کی تحریک کا انسداد مقصود تھا۔

حضرت جس علم یا فن میں بات کرتے تحقیق و تدقیق کے ساتھ سیل رواں کا مظہر بن جاتے، تفسیر و حدیث کے درس کے دوران عشقِ الہی اور عشقِ نبوی (ﷺ) میں ڈوبتے ہوئے وہ نکات بیان فرماتے جو کسی بھی شرح میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے، کبھی کبھار وجد میں آ کر فرماتے یہ بحث کسی شرح میں نہیں ملے گی یہ صدر کی شرح سے ہے حضرت کو فقہ سے بھی حظ وافر عطاء ہوا تھا جس کا اندازہ ان فقہی دقائق سے ہوتا تھا جو وہ دورانِ درس بیان فرماتے تھے، اردو اور عربی ادب میں اُن کی مہارت اپنی مثل آپ تھی، علومِ آلیہ میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے، جس کی گواہی ہر وہ شخص دے سکتا ہے جسے ان سے استفادہ کا موقع نصیب ہوا ہو، بندہ کو چونکہ استاذِ محترم سے فقہ العرب، شرح جامی، بیضاوی، بخاری اور مسلم پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، لہذا استاذِ محترم کی مختلف علوم میں مختلف تحقیقات کا ذخیرہ دل و دماغ میں موجود ہے جس میں سے کچھ نمونے ”مشتہ نمونہ از خروارے“ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

مشاجراتِ صحابہ ﷺ کے متعلق حضرت احادیث کی دل ربا تشریح فرما کر عموماً فرماتے: اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کو اس سے بچایا ہے، اللہ ہماری زبانوں کو بھی اس سے بچائے، فرماتے صحابہ ﷺ کے متعلق ہمیشہ اچھا خیال و گمان رکھیں حدیث واقعہ اک میں مذکور حضرت علیؓ کی رائے ”لَمْ یَضِیْقَ اللّٰہُ عَلَیْکَ وَالنِّسَاءُ سِوَاہَا کَثِیْرٌ“ کی پر حکمت توضیح کرنے کے بعد حضرت سعد بن معاذ، حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت اسید بن ہنیرؓ کے درمیان ہونے والی گفتگو جو بظاہر تلخ کلامی محسوس ہوتی ہے، کی تشریح ایسے عمدہ انداز میں پیش کرتے کہ ہر اشکال دم توڑ دیتا اور مثال میں یہ واقعہ پیش کرتے کہ مجھے ایک جگہ کسی خاندانی جھگڑے میں حکم بنایا گیا، ان میں ایک بڑے میاں تھے جو بے حد باوقار اور سنجیدہ انسان تھے، جس کا اندازہ ان کی گفتگو سے لگایا جاسکتا تھا، لیکن بات چیت کے دوران فریقِ مخالف میں سے ایک نوجوان اٹھا، جس نے قوم پرستی پر مبنی کوئی بات کہی، جس پر یہ بڑے میاں چراغ پا ہو گئے اور اسے برا بھلا کہا، مقصد اس کا یہ تھا کہ اگر یہ پوری قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے جواب نہ دیتے تو فریقین کے دست و گریباں ہونے کا اندیشہ تھا صحیح

روایتوں میں اس عمر کا ذکر ہے، جس سے استاذ بڑی عمدگی سے اس بات پر استدلال فرماتے کہ جس طرح عمرہ جعرا نہ حضرت ابن عمرؓ پر مخفی رہا تو اس میں کیا بعید ہے کہ رفع یدین کا نسخ بھی ان پر مخفی رہا ہو، جب کہ مسند حمیدی کے پرانے طبع میں (جو کہ جامعہ کے کتب خانہ میں موجود ہے) حضرت ابن عمرؓ کے عدم رفع یدین کا ذکر ہے اور حمیدیؒ، امام بخاریؒ کے استاذ بھی ہیں۔

حدیث (لا عدوی ولا طیرہ) کی روشنی میں ایسی دل نشین تشریح فرماتے کہ دل باغ باغ ہو جاتا، موجودہ زمانے کے بعض وہ متجدد دین جو قربانی کرنے کو مال کا ضیاع گردانتے ہیں اور اس کے بدلے مالی صدقے کو مسلمانوں اور خلق خدا کی صلاح شمار کرتے ہیں ان کے اعتراضات کو مد نظر رکھتے ہوئے قربانی کے معاشرتی، معاشی اور اقتصادی فوائد کو بیان کرتے کہ اس میں کن کن لوگوں کو روزگار کے مواقع میسر آتے ہیں اور اس کے گوشت سے غریبوں کی کن طریقوں سے مدد کی جاتی ہے حدیث میں مذکور ربیع قبل القبض کی نہی کی حکمت یہ بیان فرماتے کہ اگر خریدنے والا، قبضہ اور وزن کرنے سے پہلے اسی جگہ پر بیچے گا تو درمیان میں زیادہ واسطے آتے اور اسی جگہ بکنے کی وجہ سے وہ چیز اپنی حقیقی قیمت سے کئی گنا مہنگی بکے گی، حتیٰ کہ اصول فقہ کی بعض کتابوں میں یہ بحث ملتی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ غیر فقہ صحابیؒ کی روایت پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں اس کو بنیاد بنا کر بعض لوگ امام صاحبؒ پر بہت زبان طعن دراز کرتے ہیں استاذؒ بیان فرماتے کہ یہ امام صاحبؒ کا قول نہیں بلکہ عیسیٰ ابن ابان کی طرف منسوب ہے جب کہ اس نسبت میں بھی کلام ہے اور یہ اصول اپنے لفظی اور تعمیری ضعف کی وجہ سے پیچیدگی کا شکار ہوا ہے اس غلط بیانی اور غلط تشہیر کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جن کی عقلیں فقہ اور اصول فقہ کی باریکیوں کے ادراک سے عاری و عاجز ہیں۔

استاذ محترمؒ کو ادب عربی وارد دوسے گہرا لگاؤ تھا، جس کا ظہور درس کے دوران موقع بموقع ان اشعار سے ہوتا جنہیں استاذؒ استشہاد کے طور پر پڑھا کرتے تھے، وہ جدید لفظ کا ماخذ اور پھر اس کی لفظی مناسبت بھی بتاتے، مثلاً لفظ ”القافلة“ کے متعلق بتاتے کہ یہ ”المقفل“ سے ہے جس کے معنی واپس لوٹنے کے ہیں، قافلہ کو قافلہ نقلاً کہا جاتا ہے، روزمرہ کی گفتگو میں بولے جانے والے الفاظ پر بھی حضرتؒ کی گہری نظر ہوتی اور ان کی ایسی انوکھی مناسبت بیان فرماتے کہ عقلیں دنگ رہ جاتیں، لفظ ”نائی“ کے متعلق ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ یہ میرے خیال سے ”الناعمی“ سے ہے، نعیمی یعنی نعیمیا کے معنی ہیں موت کی خبر دینا یہ لوگ چونکہ عموماً گاؤں دیہات میں یہ فریضہ بھی انجام دیتے ہیں، لہذا انہیں ناعمی کہا گیا جس کی بگڑی ہوئی صورت لفظ نائمی ہے، اردو ادب میں تذکیر و تانیث، تلفظ و لہجہ کا خاص خیال رکھتے اور مزید توثیق کے لیے سر دست لغت دیکھتے، جس سے سامنے والا تحقیق کی عادت اپنانا سیکھتا، تقدم ذاتی اور تقدم زمانی میں فرق کو چابی اور ہاتھ کے گھمانے سے سمجھاتے کہ ذات کے اعتبار سے گھومنے میں مقدم ہاتھ ہے چابی مؤخر، لیکن زمانہ دونوں کا ایک ہے، عرض کے عدم انتقال کو عطر اور اس کی خوشبو سے سمجھاتے کہ خوشبو بغیر جوہر (عطر) کے دوسری شیشی میں منتقل نہیں ہو سکتی۔

جام شہادت نوش فرمانے سے کچھ عرصہ پہلے ہی مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے موجود روایت ”اذنک علی ان ترفع الحجاب“ پر تحقیق فرما رہے تھے عام شراح کے برعکس حضرتؒ اس کا معنی یہ بیان فرماتے ”اذنی ایسا کہ ان تسجد الحجاب مرفوعاً (ای لا تحتاج الی استئذان معتاد) بل یکفیک ان تری الحجاب مرفوعاً“، یعنی جب پردہ اٹھا ہوا ہو تو آپ کے لیے میری طرف سے اندر آنے کی اجازت ہے کسی اور طرح کی اجازت کی ضرورت نہیں لیکن اس صورت میں سوال یہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے تخصیص کیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیتے کہ باقی حضرات صحابہؓ تو پردہ اٹھا ہوا دیکھ کر بھی اجازت طلب کرتے جب کہ حضرت ابن مسعودؓ کو اس کی بھی ضرورت نہ تھی اس تقریر کے لیے درج ذیل دلائل پیش کرتے:

الف: مسلم شریف میں ایک نسخہ (یرفع) یاء کے ساتھ ہے جو اس تشریح کے لئے مؤید ہے۔

ب: علامہ نوویؒ نے اس پر عنوان قائم کیا ہے ”باب جواز جعل الاذن رفع حجاب او غیرہ من العلامات“، بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے۔

ج: علامہ ابی شارح مسلم کی شرح سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

بہر کیف حافظہ خیال کی مدد سے یہ چند مثالیں بطور نمونہ عرض کرنے کی کوشش کی گئی ہے ورنہ بلا ناغہ قرآن و سنت کا بھرپور شغف کے ساتھ درس دینے والے استاذ محترمؒ کے ایسے کئی علمی، تحقیقی و تدقیقی نکات مرتب ہو سکتے ہیں جن کے لیے شاید کئی دفاتر بھی کم ہوں، اللہ سے دعاء ہے کہ ہمارے استاذ محترم کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں ان کے سکھائے اور دکھائے ہوئے راستوں پر ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ شبانہ روز محنت سے آگے بڑھنے کی توفیق و ہمت مقدور فرمائے۔

حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ، ناظم تعلیمات علامہ بنوری ٹاؤن حیات و خدمات کا مختصر جائزہ

حضرت مولانا انعام اللہ صاحب

ناظم تعلیمات و استاذ الحدیث جامعہ محمدیہ اسلام آباد



ماہنامہ الحق کے خصوصی شمارہ بنام ”مشاہیر“ (مکتوبات) کے دو عدد نسخے مدیر الحق جناب مولانا راشد الحق سمیع حقانی صاحب کی جانب سے موصول ہوئے۔ فجزاہم اللہ خیرا و شکر مساعیہم السامیۃ و تقبل جحودہم المیمونۃ۔ اس شمارے کے ”نقش آغاز“ میں انہوں نے پاکستان میں پھیلے ہوئے مدارس دینیہ کے سلسلہ ذہبیہ میں سے حادثاتی اموات کے ذریعے الگ ہونے والے چار اساتین علم کی شہادت پر ادارتی نوٹس لکھے ہیں۔ ایک مہینے کی مختصر مدت میں داغ مفارقت دینے والے کہنہ مشق مدرسین اور اپنی اپنی دلچسپی کے دینی میدانوں کے شہسوار علماء کی شہادت مدارس دینیہ کی تاریخ کے ان کرناک انوکھے واقعات میں سے ہے، جس نے حالیہ سالوں میں عام مسلمانوں کو بالعموم اور تشنگان علوم دینیہ اور دیگر متعلقین مدارس دینیہ کو ایسے ناقابل برداشت صدموں سے دوچار کر دیا ہے، جو زندگی بھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ انہوں نے بالکل درست لکھا ہے کہ ”حالات کے جبر کا کیا کہنے، کہ ادارتی صفحات کا مسلسل پانچواں صفحہ علمائے حق کی جدائی میں خون دل سے لکھ رہا ہوں، گذشتہ ایک ماہ سے مسلسل علمی و دینی حلقے پے درپے حادثہ کے جام پئے جا رہے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا حادثہ فاجعہ سر پر تیار کھڑا ہے۔ سمجھ نہیں آ رہی کہ قیامت سے پہلے کیوں قیامت کی شروعات ہو گئیں ہیں“ پے درپے علماء حق کے اٹھ جانے سے پیغمبر صادق ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، لَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، فَإِذَا لَمْ يَبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوسًا جُهَلًا فَلْيَسْتَلُوا، فَأَفْتُوا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا﴾ (بخاری)

مولانا نے جن علماء کرام کی شہادت کے تذکرہ کو ماہنامہ الحق کے ادارتی نوٹ میں موضوع سخن بنایا ہے، ان میں حضرت مولانا عطاء الرحمن رحمہ اللہ بھی شامل ہیں جو کہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی، کے فارغ التحصیل تھے، اور عالم اسلام کے اس عظیم دینی مرکز میں استاذ الحدیث اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے دین حق کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کیے ہوئے تھے، نیز جامع مسجد صالح، صدر، کراچی، میں امامت و خطابت کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید اپنی ہمیشہ اور رفیق سفر و حضر (قبر) مولانا عرفان حمید مین شہید سمیت، بھوجا ایئر لائن کے حادثے میں جام شہادت نوش فرما گئے۔ مولانا شہید سے میرے کئی ایک خاندانی و روحانی رشتے تھے، آپ میرے ماموں زاد بھائی، سالے اور بہنوئی تھے، اور استاد و مربی بھی۔ مولانا راشد صاحب نے ان کی شہادت کے واقعہ کو حسب ذیل عنوان سے معنون فرمایا ہے: ”ایک گوہر نایاب انسان حضرت مولانا عطاء الرحمن کی المناک جدائی“ کیا عجیب توافق ہے، مولانا شہید کے والد محترم (میرے ماموں جان)، جن کو اللہ تعالیٰ نے ضعف اور بیماری کی حالت میں ایک عظیم بیٹے اور معصوم صفت بیٹی کی المناک جدائی کی آزمائش و ابتلاء کی بھٹی سے گزارنے کے لئے چنا ہے، واقعہ کے چند ہی دن بعد اچانک چھڑنے والی اپنی اولاد کو یاد کر کے حافظہ پوری کا یہ شعر پڑھنے لگے۔

اصلی گوہر زما دلا سہ پہ در یاب کے ڈوب شہ: کہ ڈک سید و نہ پسے اوچ کڑمہ پیدا بہ نشی۔

(گوہر نایاب میرے ہاتھ سے گر کر دریا برد ہو گیا، اب اگر بھرے دریاؤں کے پانی کو سکھا کر بھی میں اس کو تلاش کروں، تو ہاتھ نہیں آئے گا)

واقعہ مولانا شہید ایک گوہر نایاب تھے، نہ صرف اپنے والدین اور عزیز و اقارب کے لیے، بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے شاگردوں، مقتدیوں، مولانا راشد صاحب جیسے دوست احباب، متعلقین اور عامۃ المسلمین کے لیے بھی، جہی تو ان کے لیے غمزدہ والد محترم کی زبان ”اصلی گوہر“ کے الفاظ بولتی ہے، تو مولانا راشد کا قلم ”گوہر نایاب“ کے الفاظ لکھتا ہے۔ یہ توافق اسی لیے تو ہے کہ وہ واقعہ ”گوہر نایاب“ تھے، اور انہی الفاظ کے صحیح اور سچے مصداق۔ اس ”گوہر نایاب“ کو سانچے میں ڈھالنے کے لئے دست قدرت نے ہم سب کی مادر علمی ”جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کراچی“ جیسے علم و عرفان کے مرکز کا انتخاب کیا تھا، اور اس کو تراشنے اور واسطۃ العقد بنانے کے لئے وہاں کے جبال العلم جیسے اولیاء وقت اساتذہ کرام کی آغوش تربیت کو

جامعہ حقانیہ سے عقیدت و احترام کا ہمارا پرانا خاندانی تعلق رہا ہے، میرے والد صاحب کے ماموں اور میرے استاد مولانا شمس تبریز رحمہ اللہ، جامعہ حقانیہ کے غالباً پہلے یا دوسرے سال کے فضلاء میں سے ہیں، مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھ رہے تھے، کہ تقسیم ہند کا عمل رونما ہوا، اس لئے علوم دینیہ کی تکمیل پاکستان میں کی، اور دورہ حدیث کی سند فضیلت جامعہ حقانیہ سے حاصل کی۔ فرمایا کرتے تھے، کہ مدرسے کا آغاز تھا، مطح کا باقاعدہ انتظام نہیں تھا، اس لیے مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ طلباء کے لیے اپنے گھر ہی میں تندور پر روٹیاں پکوا لیتے تھے، اور روٹیوں سے بھری ٹوکری سر پر رکھ کر مدرسہ لے آتے تھے۔ ایک دن پڑوسیوں نے شکایت کی کہ طلباء ہمارے کھیتوں میں آ کر درختوں کی ٹہنیاں توڑتے ہیں، اور نقصان کرتے ہیں۔ آپ نے طلباء کو جمع کیا، اور سمجھاتے ہوئے فرمایا: تمہیں لکڑیاں توڑنے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟ تمہارے لیے تو میں اپنے گھر سے روٹیاں پکوا کر لاتا ہوں۔

جب ۱۹۷۶ء میں مولانا شہید نے میٹرک تک کی عصری تعلیم سے فراغت حاصل کی تو ان کو دینی تعلیم دلوانے اور راشد صاحب کے الفاظ میں ”گوہر نایاب“ بنانے کے لیے خاندان کے بزرگوں کی نگاہ انتخاب جن مدارس پر پڑی، جامعہ حقانیہ اس تعلق کی وجہ سے ان میں سرفہرست تھا۔ ماموں جان (مولانا شہید کے والد محترم) بتلاتے ہیں، کہ میں اور مولانا شمس تبریز صاحب رحمہ اللہ داخلہ کے بارے میں معلومات لینے کے لیے جامعہ حقانیہ کوڑہ خٹک گئے، دفتر میں مولانا سمیع الحق صاحب (مدظلہ العالی) سے ملاقات ہوئی، حاضری کا منشاء بتایا کہ بچے کے داخلے کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔ آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور جامعہ کے اس وقت کے ناظم صاحب کو بلوا کر داخلہ کے متعلق ان کی رائے معلوم کی، جناب ناظم صاحب نے تاخیر سے آنے اور رہائش کے لیے جگہ کی قلت کی انتظامی رکاوٹ کا تذکرہ کیا، ہم نے بڑے درجوں کے ایک طالب علم کے حوالے سے رہائش کا انتظام ہونے کی بات کی۔ اس طالب علم کو بلوایا گیا اور ان سے وضاحت طلب کی گئی، غرض مولانا سمیع الحق صاحب داخلہ کی گنجائش نکالنے کی کوشش کرتے رہے، اور ناظم صاحب انتظامی رکاوٹوں کا تذکرہ فرماتے رہے اور یوں یہ داخلہ نہ ہو سکا۔ ادھر بچے کے دادا جان (بابا جی رحمہ اللہ) کی مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ سے بھی شناسائی اور تعلق تھا، اور اپنے سفر کراچی میں مولانا بنوری کی بعد از عصر اصلاحی مجالس میں شرکت فرماتے رہتے تھے، اسی شناسائی اور تعلق کی بنیاد پر اس بچے کو ”گوہر نایاب“ بنانے کے لیے قدرت کی نگاہ انتخاب بنوری ٹاؤن پر پڑی، اور یوں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں داخلہ ممکن ہو گیا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مولانا راشد نے ان کو ”گوہر نایاب“ کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ مولانا شہید چونکہ ہمیشہ نظامت کے منصب پر فائز رہے، پہلے ناظم دارالاقامہ تھے، اور بعد میں ناظم تعلیمات، اس لیے نظامت کے نشیب و فراز، باریکیوں اور تلخ و شیرین تجربات سے خوب واقف تھے، اسی لیے جب بھی کسی مجلس میں اپنے والد محترم کی زبانی یہ واقعہ سنتے، تو تبسم آمیز خوبصورت انداز میں بات کو ٹالتے ہوئے مولانا انوار الحق صاحب (نائب مہتمم، جامعہ حقانیہ، کوڑہ خٹک) کا تذکرہ چھیڑ دیتے، اسفار حرمین کی ملاقاتوں یا پھر وفاق المدارس کی میٹنگوں میں ہونے والی ملاقاتوں کا تذکرہ فرماتے اور مولانا انوار الحق صاحب سے سنی ہوئی دلچسپ باتوں کو انہی کے انداز میں نقل فرماتے، اور یوں پوری مجلس کشت زعفران بن جاتی۔ اور کبھی آپ مولانا راشد کا بھی تذکرہ فرماتے، بالخصوص بیرون ملک اسفار کا حوالہ دیتے ہوئے دلچسپ واقعات سناتے۔ مولانا نے بھی اپنے ادارتی نوٹ میں طویل ہوائی اسفار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے ”سفر میں ساتھی کی ایک چیز کا خیال رکھنا اور ہر ممکن سہولت فراہم کرنا ان کا خاصہ تھا“ اور ”آپ جہاز میں اکثر برادر مہتمم عتیق الرحمن صاحب اور میرے ساتھ والی سیٹ پر تشریف رکھتے۔“ اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز گفتگو میں روداد سفر سناتے ہوئے ہم نے متعدد بار مولانا کی زبانی اس کا تذکرہ سنا۔ اس کا ظاہری سبب تو بہر حال مولانا راشد صاحب جیسے حضرات کا عزت و تکریم اور محبت و شفقت پر مبنی باہمی تعلق تھا، لیکن مولانا کی گفتگو کے بین السطور سے جو وجہ ہمیں سمجھ میں آتی، بلکہ ہمیں بھی غیر محسوس انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے، وہ یہ تھی کہ آپ کے اندر تواضع کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر قسم کی بھی ٹھاٹ بھاٹ اور تکلفانہ طور طریقوں سے تو گویا آپ کو نفرت تھی، مناصب جلیلہ پر فائز ہوتے ہوئے ان دونوں باتوں کی رعایت کرنا ایک مشکل کام ہے، جس کے لیے حکمت و تدبیر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ عزت پسندی یا غیر سنجیدگی کا الزام اپنے سر نہ دھرایا جائے۔ اس لیے آپ اپنے مرتبہ اور مقام کی رعایت کرتے ہوئے بڑوں سے تعظیم و احترام کے ساتھ ملتے، حال احوال پوچھتے، علمی گفتگو فرماتے، لیکن طویل اور بے تکلفی کی نشستوں کے لیے اپنے ہم عمر یا کم عمر ساتھیوں کا انتخاب فرماتے، اور شفقت و محبت، عزت و دلجوئی، حوصلہ افزائی و تشجیع پر مبنی رویہ کا اظہار فرماتے۔

۲۹ رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ کی وہ بابرکت رات مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب حرم پاک میں ختم القرآن کے موقع پر امام حرم کی طویل رقت آمیز دعاؤں میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ہم تقریباً رات ایک بجے بیت اللہ شریف کے طواف کی سعادت حاصل کر رہے تھے، کہ ملتزم کے بالکل سامنے آپ مولانا راشد کے والد محترم مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ العالی کے ساتھ ملاقات ہوئی، اسی لمحے جماعت اسلامی کے راہنما جناب محمد حسین محنتی (مولانا شہید کے مقتدی) بھی طواف کرتے ہوئے اسی جگہ پہنچ گئے۔ طواف روک کر ایک دوسرے سے ملے، حال احوال معلوم کیا، میں نے ازراہ

تفنن کہا: گویا مطاف میں ایم ایم اے کا اجتماع ہوا۔ تینوں حضرات بڑے محفوظ ہوئے، مولانا شہید رحمہ اللہ نے دونوں حضرات کو اس جملے کی طرف دوبارہ بارہ متوجہ کیا۔ طواف کے بعد میز اب رحمت کے سامنے بیٹھ گئے، اور جب تک مولانا راشد کے والد گرامی وہاں تشریف فرما رہے، مولانا شہید بھی نہیں اٹھے، حالانکہ پروگرام کے مطابق ہمیں جلدی کمرے میں جانا تھا۔ لیکن انکی مروت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ بڑوں کو چھوڑ کر مجلس سے اٹھ جائیں۔

وفاق المدارس کے تحت منعقد ہونے والے سالانہ امتحانات میں بحیثیت نگران اعلیٰ جامعہ حقانیہ میں مولانا شہید رحمہ اللہ کی ڈیوٹی تھی، اس سال مولانا راشد الحق بھی امتحان دے رہے تھے۔ جمعرات کو پرچے کے اختتام کے وقت میں بھی اسلام آباد سے اکوڑہ خٹک پہنچا۔ مولانا شہید نے مجھے امتحان ہال میں بلایا، اور اپنی گفتگو کے آغاز ہی میں مولانا راشد کی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ راشد الحق صاحب نے امتحانی نزاکتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارا بہت خیال رکھا، اور کسی طالب علم کو انگلی اٹھانے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ چونکہ مولانا کی طبیعت بہت حساس تھی، کسی بھی طالب علم کی طرف سے اشارہ، کنایہ ایسی بات، جس سے کسی دوسرے طالب علم کے ساتھ ترجیحی رویے کی بو آتی ہو، آپ کو پریشان کر دیتی، اور کبھی کبھار تو الزام لگانے والے کی خوب اصلاح فرماتے۔ اس لیے مولانا راشد صاحب کا جب بھی تذکرہ فرماتے، اس امتحان کا حوالہ ضرور دیا کرتے۔ اور بصراحت فرماتے، کہ جناب راشد الحق صاحب نے امتحان میں ایسا اچھا رویہ اپنایا، کہ کسی کو بھی بات کرنے کا موقع ہاتھ نہیں آیا۔

مجھے یاد ہے کہ اس امتحان سے فراغت کے بعد جامعہ سے رخصت ہونے سے پہلے مولانا مغفور اللہ صاحب کی خدمت میں حاضری دی، دعائیں لیں اور رخصت ہوتے وقت اپنی عادت شریفہ کے مطابق جیب میں موجود قلم مولانا کو ہدیہ دیا۔ کمرے سے باہر آ کر فرمانے لگے کہ ہدیہ تو معمولی تھا، لیکن مجھے یقین ہے کہ مولانا مغفور اللہ صاحب اس قلم کو جب بھی استعمال میں لائیں گے، تو استاد حدیث ہونے کے ناطے ضرور حدیث کے الفاظ یاد و دشریف کے کلمات تحریر فرمائیں گے، اور یوں خدمت حدیث میں ہمارا بھی حصہ ہو جائے گا، جو قیامت کے دن شفاعت نبوی ﷺ کے حصول کا ذریعہ بنے گا۔ یاد رہے کہ مولانا مغفور اللہ صاحب سے آپ کا رشتہ محض یہی تھا کہ مولانا ایک بزرگ انسان ہیں، قال اللہ اور قال الرسول میں ان کی زندگی کے قیمتی لحاظ گزر رہے ہیں، غالباً ان سے مولانا کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ مولانا شہید مردم شناس بھی بہت تھے، پہلی ہی ملاقات بلکہ ٹیلیفونک گفتگو میں بھی آدمی کو پہچان لیتے، اور اس کے مطابق تعلق رکھتے۔ مولانا مغفور اللہ صاحب سے کس حد تک عقیدت تھی؟ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب رواں سال برادر مر مولانا امداد اللہ صاحب نے حسب روایت الجامعۃ الاسلامیہ بابوزنی کی افتتاحی تقریب میں حافظ شوکت علی صاحب، مدرس جامعہ حقانیہ کی وساطت سے مولانا مغفور اللہ صاحب کو مدعو کیا، تو مولانا شہید نے حسب معمول ترصیحی کلمات ارشاد فرمائے، اپنی گفتگو کا آغاز اس حدیث پاک سے کیا۔ (النَّاسُ كِبَابِلٌ مِائِةٌ، لَا تَكَادُ تَجِدُ فِيهَا رَاحِلَةً) (ابن ماجہ) پھر حدیث نبوی کی تشریح کرتے ہوئے جس عقیدت و احترام کے ساتھ مولانا مغفور اللہ صاحب کو اس حدیث شریف کا مصداق ٹھہرایا، کم از کم میں نے اس سے قبل مولانا شہید کا یہ انداز نہیں دیکھا تھا، آپ کا والہانہ انداز گفتگو اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ آپ دل کی گہرائیوں سے علم و تقویٰ کے اعتبار سے مولانا کو ایسی شخصیت سمجھتے ہیں، جو اپنی نظیر آپ ہیں، جن کا شمار رجالِ کاملین میں ہوتا ہے، اور جو ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ اور یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں، کہ مولانا شہید کے مزاج میں فصیح اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا، محض مجلس آرائی یا داد تحسین حاصل کرنے کی غرض سے کسی کی تعریف کرنا آپ کی ڈکٹری میں نہیں تھا۔

جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک، کے اکابر کے ساتھ عقیدت و احترام کے حوالے سے ایک اور معمولی سا واقعہ بھی عرض کیے دیتا ہوں، چند سال پہلے زروبی، صوابی، کے ہمارے ایک ساتھی کے والد صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ اس وقت مولانا شہید بھی گاؤں میں تھے، میں نے نماز جنازہ میں شرکت کے لیے زروبی جانے کا ارادہ ظاہر کیا، تو فرمایا: میں بھی ساتھ چلتا ہوں، جنازے میں شرکت بھی ہو جائے گی اور حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب (جو اس وقت تقریباً صاحبِ فراش تھے) کی زیارت بھی ہو جائے گی۔ نماز جنازہ سے فراغت کے بعد ہم لوگ مفتی صاحب کی مسجد میں غالباً عصر کی اذان کے بعد پہنچ گئے۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ کو اطلاع دی گئی کہ کراچی کے چند علماء زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں، آپ وہیل چیر پر بیٹھ کر مسجد تشریف لے آئے، وضو بنایا، مصافحہ کرنے اور حال احوال معلوم کرنے کے بعد فوراً جیب میں موجود کل سرمایہ تقریباً (تین سو روپے) نکال کر اپنے پوتے کو دیئے اور مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کی ہدایت کی، ہم نے دیر ہونے کا عذر پیش کیا، مفتی صاحب نے خلاف معمول ہمارا عذر قبول کیا، ان کے بیٹے نے بتایا کہ کچھ کھائے پیئے بغیر کسی مہمان کو اجازت دینا مفتی صاحب کی عادت نہیں ہے، آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اجازت مل گئی، تاہم مہمانوں کی خاطر تواضع نہ ہونے پر بعد میں ضرور ہماری تادیب ہوگی۔ مولانا شہید مفتی صاحب کے سامنے انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ بیٹھے رہے، جس طرح کوئی شاگرد اپنے استاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔ غیر محسوس طریقے سے مفتی صاحب کے ہاتھوں میں کچھ ہدیہ رکھ کر ہاتھوں پر بوسہ دیا، اور رخصت ہوئے۔ بظاہر یہ ایک معمول کی ملاقات

تھی، لیکن جب بھی یہ منظر یاد آتا ہے، غیر اختیاری طور پر نگاہوں کے سامنے ایک ایسا نقشہ بنتا چلا جاتا، جو تواضع و انکساری، شفقت و محبت، عقیدت و احترام، زہد و قناعت اور سخاوت و اکرام جیسے اعلیٰ اسلامی اخلاق و اوصاف سے مرصع ہو، جس کا تانا بانا اپنے وقت کی دوائیسی عظیم ہستیاں ہوں جن میں تقدم زمانی، عمر، جلالت قدر اور علم میں تفاوت کے باوجود کئی ایک چیزیں قدر مشترک تھیں۔ عالم اسلام کی دو عظیم جامعات (جامعۃ تھانیہ، اکوڑہ خٹک اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن) کی مسند درس و تدریس، بالخصوص مسند حدیث پر جلوہ افروزی، دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں شاگردوں کی عقیدت و احترام کے لیے دونوں کی شخصیتوں کی مرکزیت و محوریت، علی وجہ البصیرت مسلک حنفی و مشرب دیوبندی میں تہذیب و قناعت، نام و نمود اور تشہیر ذات کے نت نئے طریقوں سے کوسوں دوری، وہ مشترک باتیں ہیں، جو مفتی فرید صاحب رحمہ اللہ اور مولانا عطاء الرحمن شہید رحمہ اللہ کی شخصیتوں میں نمایاں طور محسوس کی جاسکتی ہیں۔ تاہم اس کا اندازہ ان لوگوں کو ہو سکتا ہے، جو دونوں کے قریب رہے ہوں، بات طول پکڑ رہی ہے، میں مزید وضاحت کے لیے صرف ایک چیز کا تذکرہ کرتا ہوں۔ جناب مفتی فرید صاحب کے شاگردوں سے سنا ہے، کہ جب ان کی تقریر ترمذی چھپنے کے مرحلے میں تھی، تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ انتہائی ہلکا کاغذ لگایا جائے، اور کل حقیقی اخراجات کو مطبوعہ نسخوں کی تعداد پر تقسیم کیا جائے، اور ہر نسخے کی وہی قیمت مقرر کی جائے، جو اس پر حقیقی خرچ آیا ہے، تاکہ بے وسیلہ تشنگان علوم دینیہ کے لیے خریدنا اور استفادہ کرنا ممکن اور آسان ہو۔ بحیثیت مفتی آپ ضرور جانتے تھے کہ چند پیسے زیادہ قیمت مقرر کر کے نفع کمانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، لیکن آپ کے فیاضانہ مزاج نے ازراہ مروت طلباء مدارس دینیہ سے نفع کمانا گوارا نہیں کیا۔ ادھر مولانا عطاء الرحمن شہید کا طرز عمل ملاحظہ کیجئے، ”چالیس روزہ دینی و اخلاقی تربیتی کورس“ کے لیے ”تعلیم و تربیت“ کے نام سے چھپنی والی تین حصوں/جلدوں پر مشتمل کتاب، جس کا چوتھا حصہ زیر طبع ہے، کو جس شبانہ روز محنت، عرق ریزی اور تحقیق و جستجو کے ساتھ منصہ شہود پر لائے، وہ واقفان حال ہی جانتے ہیں۔ لیکن حقوق طبع کس کے پاس محفوظ ہیں؟ کتاب کے ٹائٹل والے دو تین صفحات اس کے شاہد ہیں، جامع مسجد صالح، صدر کراچی کی سیڑھیوں کے نیچے چھوٹے سے کمرے سے شروع ہونے والی اس تحقیق و جستجو اور محنت کا دائرہ کراچی، صدر اور بندر روڈ کی پرہجوم اور تنگ گلیوں، باہوئی مردان کے کھیت کھلیانوں، نجی اور گھریلو محافل و مجالس، حرمین الشرفین کے اسفار و مقدس مقامات، افریقی ممالک (ساؤتھ افریقہ، زیمبا، کینیا وغیرہ) ویسٹ انڈیز، برازیل، لندن کے ہوائی اسفار، ایئر پورٹس کی انتظار گاہوں اور ان ممالک کے مدارس و مساجد میں منعقد ہونے والی نجی محافل و مجالس تک وسیع ہے۔) جو تھے حصے کا مسودہ حادثے پر منتج ہونے والے سفر میں برائے نظر ثانی ساتھ تھا، شاگردوں اور اساتذہ جامعہ کی پوری ٹیم کو اس محنت شاقہ میں آغاز ہی سے اپنے ساتھ شریک کار رکھا تھا۔ تحقیق و جستجو کی ان تمام محنتوں کو سمیٹ کر ”جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامۃ بنوری ٹاؤن، کراچی“ کی ”مجلس دعوت و تحقیق اسلامی“ کی جھولی میں ڈال دیا، اس لیے کہ آپ کا پکا ایمان و یقین تھا، کہ ہماری جھولیوں میں اگر کچھ ہے، تو وہ مادر علمی کے اس چشمہ صافی سے ملا ہے، اگر یہ رشتہ منقطع ہوا، تو ہم تہی دامن ہیں، کسی بھی شکل میں حقوق طبع جامعہ کے علاوہ کہیں محفوظ کراتے، تو اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے ان کو اندیشہ تھا کہ ﴿يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا﴾ کے مصداق نہ بن جائیں، بلکہ آپ تو ایک قدم اور بھی آگے بڑھے، تصنیف و تالیف کے اس مسلمہ اصول کو بھی نظر انداز کیا کہ کتاب کا مصنف معلوم ہونا چاہیئے، ورنہ جہالت مصنف کی وجہ سے تصنیف کا علمی و تحقیقی مقام غیر معتبر رہتا ہے، آپ نے کتاب کے کسی بھی صفحے پر اپنا نام لکھنا، لکھوانا گوارا نہیں کیا۔ خود فرمایا کرتے تھے، کہ حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہید رحمہ اللہ نے ”دعایہ کلمات“ کے عنوان سے اپنی تحریر میں میرا نام لکھا تھا، لیکن میں نے تحریر پڑھ کر عرض کیا کہ آج میں ایک بے ادبی کرتا ہوں، اور جامعہ کے دفتر میں مفتی صاحب کے سامنے بیٹھے بیٹھے میں نے ان کے ہاتھ سے تحریر کردہ اپنا نام کاٹ دیا، مفتی صاحب مسکرائے، اور میری اس ”بے ادبی“ کی تحسین فرمائی۔ اس انتظام کے باوجود آپ پھر بھی اس اندیشے کا اظہار فرماتے تھے کہ کہیں اس کتاب کو تجارت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ ”تعلیم و تربیت“ نامی اس کتاب کو جو مقبولیت ملی، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس بے اصولی کو بھی تکوینی طور پر ایک اصول کا مرتبہ حاصل ہوا۔ آج ہمارے سامنے صرف و نحو کی کئی ایک کتابیں زیور طبع سے آراستہ موجود ہیں، جن پر مصنف کے نام کے بجائے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے، مرتبین: اساتذہ جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔ مجھے نہیں معلوم، کہ آغاز میں یہ رائے کس نے دی؟ اور کس طرح جامعہ کے ارباب حل و عقد نے اس اصول سے اتفاق کیا؟ تاہم مجھے یقین ہے کہ اس میں مولانا شہید کی سوچ ضرور کارفرما ہوگی۔

مولانا شہیدؒ کے دل میں اکابر سے عقیدت و احترام اور اکابر پر اعتماد کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، یہی وجہ تھی، کہ کم عمر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اکابر سے مشابہت جیسی وہی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا، جس پر یہ شعر پورا پورا صادق آتا ہے: (این سعادت بزور بازو نیست: تانہ بخشد خدائے بخشندہ) یہی وجہ تھی کہ لباس اور ظاہری ہیئت میں انتہائی سادگی اختیار کرنے کے باوجود ان کی ذات اور شخصیت میں واقفان حال کو اکابر کی جھلک

نظر آ جاتی، چند سال پہلے کی بات ہے، مولانا کفایت اللہ صاحب، فاضل جامعہ حقانیہ و مدرس جامعہ فاروقیہ، حیات آباد، پشاور (استاد محترم مفتی رضاء الحق صاحب کے والد گرامی مولانا شمس الہادی صاحب رحمہ اللہ، سابق شیخ الحدیث، جامعہ اسلامیہ، اکوڑہ خٹک کے تلمیذ رشید اور خادم خاص) کے ہاں مولانا شہید کی معیت میں حاضری کا موقع ملا، مولانا کفایت اللہ صاحب کی مولانا شہید کے ساتھ یہ پہلی باقاعدہ ملاقات تھی، اس سے پہلے کوئی لمبا چوڑا تعارف یا شناسائی نہیں تھی، مولانا شہید بیٹھک (مہمان خانے) میں ایک جگہ پر تشریف فرما ہوئے، مولانا کفایت اللہ صاحب کافی دیر تک دیکھتے رہے، اور پھر بولے: شیخ صاحب (مولانا شمس الہادی صاحب) پشاور آمد کے موقع پر میرے گھر تشریف لاتے اور مجھے خدمت کا موقع فراہم کرتے، وفات سے چند دن پہلے آخری مرتبہ جب تشریف لائے تھے، تو اسی جگہ تشریف فرما تھے، جہاں آپ (مولانا شہید) تشریف فرما ہیں، آپ کو اس جگہ تشریف فرما دیکھ کر مجھے حضرت شیخ یاد آ گئے۔

مجھے یقین ہے کہ مولانا شہید کی حیات میں متذکرہ بالا باتوں کا اظہار ناممکن تھا، بالخصوص میری زبان یا قلم سے اظہار پر تو اچھی خاصی ناراضگی ہوتی اور اب بھی ان کی روح ان باتوں کے دھرانے پر خوش نہیں ہوگی، تاہم یہ جرأت اس لیے کر رہا ہوں کہ شاید مجھ جیسے بے ہمت شاگردوں کو بھی اپنی ذات کو اس طرح کے خفاء و غمool کے پردہ میں رکھنے، اپنی مادر علمی پر فدا ہونے اور اکابر سے عقیدت و احترام اور ان پر اعتماد کرنے کی ہمت ہو، اور اس وطیرہ حیات کو اختیار کر کے اس طریقے سے مولانا شہید کے لیے صدقہ جاریہ کی ایک شکل بن جائے۔ برادر م جناب راشد الحق صاحب! بات بہت طویل ہو گئی، جو عموماً باعث ملال ہوتی ہے، لیکن شاید اس لیے باعث ملال نہ ہو، کہ مولانا شہید کی ذات موضوع سخن ہے، اور:

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الاحدیث یار کہ تکراری کنم

نیز: أَعِدْ ذِكْرَ نِعْمَانٍ لَّنَا إِنَّ ذِكْرَهُ: هُوَ الْمُسْكِي مَا كَرَّرْتَهُ يَنْصَوُّعُ

(نعمان (ابو حنیفہ رحمہ اللہ) کا تذکرہ بار بار کیجیے، اس لیے کہ ان کا تذکرہ مانند مشک ہے، جتنی بار الٹ پلٹ کرو گے، خوشبو مہکتی رہے گی)

(ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک)



حصہ عربی

الشیخ عطاء الرحمن رحمہ اللہ و نبذہ من حیاتہ و مآثرہ

الشیخ المفتی محمد یاسر عبد اللہ

استاذ بالجامعہ بنوری تاؤن



اسمہ و نسبہ و مولدہ:

هو الشیخ عطاء الرحمن بن الشیخ مشفق الرحمن بن الشیخ العالم عبد السبحان بن الشیخ رحیم اللہ بن الشیخ شفیع اللہ۔ ولد شیخنا رحمہ اللہ يوم الاثنين اثنا عشر من شهر صفر عام ثمانين وثلاث مائة بعد الالف (۱۲ / ۱۲ / ۱۳۸۰) الموافق السادس من شهر اغسطس سنة ستين وتسع مائة بعد الالف (۱۶ / ۱۸ / ۱۹۶۰م) فی قرية بابوزئی من مديرية مردان۔ وکان یتمنی الی أسرة علمية و روحية، کان أبوه فاضلاً فی بعض العلوم الشرعية و ماهرًا فی العلوم الآلية و العصرية، و کان معلماً فی المدرسة، و اکثر اهل القرية تتلمذوا علی یدیه و تربوا بتوجيهاته، و کان جده الشیخ عبد السبحان رحمہ اللہ عالماً ورعاً و رجلاً روحياً، و كانت له صلة وثيقة بكبار علماء البلاد فی عصره، مثل الشیخ المحدث محمد یوسف البنوری صاحب معارف السنن و مؤسس جامعتنا هذه، و الشیخ المحدث عبد الرحمن الكامل بوری، و الشیخ المفتی ولی حسن خان التونکی المفتی العام فی هذه البلاد سابقاً و غیرهم رحمهم اللہ، و کان مرجعاً للعامة فی شئوونهم، و حکماً لهم فی خصوصاتهم لجلالة قدره و عظیم علمه، و المرجعية كانت ثابتة لهذا الأسرة من زمان۔

نشأ شیخنا رحمہ اللہ فی هذه البيئة فی بیت علم و عمل، و خبر و صلاح، و زهد و قناعة فی رعاية دقيقة، و تربية عجيبة، مع

مواهب فطرية عالية-

نشأته ودراسته:

بدأ الشيخ دراسته من أبيه وجده الحنون في مسجد الحارة حسب تقاليد أسرته، فقرأ القرآن الكريم وتعلم اللغة الفارسية، وكان في السنة الخامسة من عمره-

ثم بدأ يذهب الى المدرسة الابتدائية بقرب بيته، وكان فائقا على جميع اقرانه في الامور التعليمية والانشطة الخارجية، والتحق بالمدرسة الثانوية عام ١٩٧٦م، وفاز فيها بتقدير ممتاز-

ولما أتم السابع عشرة من عمره ذهب به جده لالتحاقه بدار العلوم شير كره (مردان) فبدأ فيها دراسته بقراءة الكتب العربية في الصرف والنحو والأدب، تفرس فيه مشائخ دارالعلوم التوقد والذكاء فأشاروا على جده أن يبعثه الى مدينة كراتشي التي كانت مرجعا للطلاب من البلاد الشاسعة لكبار علمائها وفقهائها وجامعاتها ومدارسها للعلوم الشرعية، فارتحل الشيخ رحمه الله بعد مشاوره اساتذته وجده الى كراتشي والتحق هنا بهذه الجامعة التي طار صيتها في الآفاق، وواصل دراسته فيها من الصف الثالث حتى أتم دراسته في العلوم الاسلامية والعربية سنة ١٤٠١هـ الموافق ١٩٨٣م-

ثم حاده حادى الشوق الى التخصص في الفقه والافتاء بالجامعة، فلازم الشيخ المفتي ولي حسن التونكي رحمه الله، وتمرن عنده في الافتاء لمدة سنتين، وكان يعد من انجب تلاميذه، وكان الشيخ التونكي رحمه الله قد تأثر بروحه ومشاعره لما آتاه الله من المعارف والنبوغ والذكاء وحسن الأدب، فلازم الشيخ ملازمة أكسبته الفضائل الفريدة، بل اجتذب منه خصائله وانعكست عليه سجاياه، فنهل منه وعلا، وفاز بسند الاتمام والفراغ من علوم الرواية والدراية في سنة ١٤٠٥هـ الموافق ١٩٨٥م، ولم يجاوز عمره آنذاك خمسا وعشرين عاما-

شيوخه:

قد تلقى الشيخ رحمه الله من جهابذة العلماء في هذه الديار، كانوا في سماء العلم والفضل شموسا وبدورا، واذكر جملة من أبرزهم كان للشيخ عناية خاصة بالانتساب اليهم والتلمذ عليهم:

الشيخ المفتي ولي حسن خان التونكي، رئيس قسم التخصص في الفقه والافتاء وشيخ الحديث بالجامعة والمفتي العام لباكستان سابقا،

الشيخ محمد ادريس الميرتي، من كبار اساتذة الجامعة ورئيس وفاق المدارس العربية والجامعات الاسلامية بباكستان سابقا،

الشيخ محمد بديع الزمان، أستاذ الحديث بالجامعة سابقا،

الشيخ مصباح الله شاه، استاذ الحديث بالجامعة سابقا،

الشيخ محمد امين اوركزئي الشهيد، صاحب نشر الازهار في شرح، شرح معاني الآثار للطحاوي، من كبار اساتذة الجامعة ومدير التعليم سابقا، ورئيس الجامعة يوسفية في شاهو وام هنغو،

الشيخ المفتي احمد الرحمن رئيس الجامعة سابقا ونائب الامير لعالمي مجلس تحفظ ختم نبوت وسواد الاعظم اهل سنت ووفاق المدارس العربية بباكستان سابقا،

الشيخ المحدث الدكتور محمد حبيب الله مختار الشهيد، صاحب كشف النقاب وغيرها من التاليف القيمة ورئيس الجامعة سابقا ركن ركين لمنظمة وفاق المدارس العربية والجامعات الاسلامية سابقا، رحمهم الله تعالى جميعا-

الشيخ الاديب الاريب الدكتور عبد الرزاق اسكندر رئيس الجامعة حاليا،

الشيخ محمد انور البدخشاني، استاذ الحديث بالجامعة حاليا،

الشيخ المفتي رضاء الحق استاذ الجامعة سابقا وشيخ الحديث بدارالعلوم زكريا بافريقيا الشمالية حاليا، حفظهم الله-

تدريسه:

نظر المزيّد تفوقه وبالع زكائه ونبوغه في العلوم عيّنه مشائخ الجامعة في مدرسة تعليم الاسلام جلشن عمر، فرع الجامعة، أولاً ثم عيّنه بعد اعادة النظر في الجامعة وذلك في نفس السنة التي أتم فيها دراسته.

فدرس الشيخ رحمه الله في الجامعة زهاء سبع وعشرين عاماً من الصفوف الاعدادية الى العليا جميع العلوم الدراسية من النحو والصرف، والأدب والبلاغة، والفقه وأصوله، والحديث وأصوله، والتفسير وأصوله، وتخرّج على يديه عدد كثير من الطلاب من الدول الاسلامية ومن دول الأقليات، وان معظم اساتذة الجامعة وفروعها سوى كبارهم من تلاميذه رحمه الله. وكان للشيخ أسلوب خاص في التدريس فكان يعتنى بجميع الطلاب أثناء الدرس، ويبدل أقصى جهده في افهام أدناهم، وينمي فيهم ذوقه العلمي والأدبي.

وكانت له معرفة تامة بالطلاب لكثرة مخالطة لهم وتفحصه عنهم وجلوسه بينهم، فكان يراقبهم أثناء الدروس وخارج الفصول، ويترصد جميع حركاتهم وتنقلاتهم، ويراعى أمورهم الدقيقة وينبه على أدنى فعل شنيع، وبالجملة كان رحمه الله عاملاً في هذا المجال بقول النبي صلى الله عليه وسلم في طلاب العلم "استوصوا بهم خيراً" وكان يقول: كتمان الحب مع الأولاد والتلاميذ أنفع لهم من ابدائه لهم.

مناصبه:

كان رحمه الله ركناً ركينا للجامعة وعضواً للمجلس الاستشاري كما فوض اليه منصب مدير التعليم بالجامعة، وكان رحمه الله بجانب ذلك عضواً لمنظمة وفاق المدارس العربية والجامعات الاسلامية في المنهج التعليمي. أوصافه الخلقية والخلقية:

قد أودعه الله تعالى مزايا نبيلة، ومواهب جليلة فطرية وكسبية، من العلم والعمل، والزهد والقناعة، وحسن الصورة والسيرة، والامانة والديانة، والمواساة والاخوة، والمهابة والجلالة، وكياسة الذهن، والصبر والمكاره، وظرافة الطبع مع عظيم الوقار، والاستحضار المدهش في العلوم الآلية والعالية، وحسن اللقاء في الدرس، وسرعة الادراك ودقة الاستنباط، والعزوفة من السمعة، وحسن الأدب، وجمال الذوق الأدبي، والثبات على الطريق السوي في الأمور الدينية والدنيوية، وكان بعيداً عن التكلف والتصنع ومحبا لللبساطة والسداجة، حافظاً للصدقات وحقوقها، وقوراً في مشيئة ومجلسه وحديثه.

هذه نبذة من أوصافه البارزة ومآثره الجليلة، ذكرتها من غير ترتيب خاص، وهي عناوين حياته التي تحتها جزئيات كثيرة لاتسعتها هذه الأوراق المعدودة.

فأذكر نبذة منها فيما يلي:

كان رحمه الله مولعاً بحب النبي صلى الله عليه وسلم ومكثر الصلوة عليه عند ذكره في دروسه ومجالسه ولذا كان يقول: ان الله سبحانه وتعالى قد منّ علىّ بخدمة علم الحديث النبوي الشريف بكثرة الصلوة على النبي ﷺ وكان يدرس الصحيح للإمام مسلم رحمه الله، وعنده ما كان يقرأ عبارات الحديث الشريف بصوته الجهوري وأسلوبه الخاص تلتذذ به الأسماع وتبتهج به القلوب وتثلج منه الصدور، لاريب أن القلب يميل الى القلب فيتأثر من عواطفه ومشاعره، وهكذا كان ينمي حبّ النبي عليه افضل الصلوات والتسليمات في قلوب تلاميذهم.

ومن أبرز صفاته رحمه الله طلب رضوان الله تعالى بجهوده المباركة ونفوره من الرياء والسمعة، فكان يشجع رفقاءه وتلاميذه على أدنى أعمالهم ويخفي شخصيت واسمه في مآثره، وهذا وصف عظيم نادر في زمننا هذا الذي يحب الناس فيه أن يحمدا بما لم يفعلوا، ويفتخرون بما سعى فيهم غيرهم

ومن صفوة خصائصه: الثقة والائتمان بالسلف الصالح في دراساتهم ومباحثهم، ولاريب أنه الطريق السليم من الأخطار في هذا الزمن زمن الفتنة المتواترة والأفكار الزائغة الشائعة، فكان الشيخ رحمه الله متشبهاً بأذيال السلف ويحب ان يتمسك

تلاميذه بهذه العروة الوثقى، "البركة مع اكابركم" كان هتافه وشعاره، وكان يلفت أنظار الطلاب الى هذا الطريق بتوجيهاته حيناً فحيناً.

ومن أوصافه اللائقة: الاحتفاظ في أمور الجامعة، فكان حذراً اشد الحذر في استخدام أشياء الجامعة لمنفعته الشخصية الا عند الحاجة، ثم يقدّم بدله الى محاسب الجامعة، مع أنه رحمه الله، كان من مجلس شئونها وادارتها، وهكذا كان رحمه الله بعيداً عن تقديم أقربائهم في الجامعة، بل كان ينفر منه أشد النفور، وهذا أصل عظيم من أصول حياته الفذة. وبالجملة كانت حياته مليئة بمثل هذه الأوصاف النادرة وتلك القصص والحكايات المنفردة، وهذا غيض من فيضه، والاحاطة بجميع خصائله الحميدة في هذه الكلمة أمر مستحيل.

وما كل ما فيه من الخير قلته وما كل ما فيه يقول الذي بعدى

الشيخ رحمه الله والدورة التربوية لطلاب المدارس والجامعات العصرية:

كان شيخنا رحمه الله دائماً يتفكر في أمور العامة، ويبدل جهوده في اصلاح أحوالهم، ومن اهم مشاكلهم في هذا العهد العناية بأولادهم أيام الاجازات السنوية، لأن الفراغ يحمل في بطنه كثيراً من المضار، وقد انتهزت بعض المؤسسات والمنظمات المستغربة هذه الفرصة فقاموا بالدوراة الصيفية لاستهداف غاياتهم المنشودة وراء أستار العلم والثقافة، فكانت الحاجة ماسة الى أن يتدارك أهل العلم هذه المضار، وأن يرتبوا الدورات التربوية لاستدارتها، بهذه الفكرة العظيمة قام الشيخ رحمه الله، فبدأ الدورة التدريبية لأربعين يوماً في المسجد الجامع الذي كان يخطب فيها ويعم، وذلك سنة ١٩٩٨ م، ثم رتب لها كتباً تحت رعايته وعنايته وفق المنهج التعليمي وحسب المتعلمين، واليوم تقام هذه الدورات في كثير من البلاد القريبة والبعيدة في باكستان والدول الأخرى، وكل ذلك من علمه الذي ينتفع به الى ما شاء الله تعالى، ويصل أجره الى روحه في أعلى عليين ان شاء الله.

رحلاته:

كان الشيخ رحمه الله محباً أشد الحب للحرمين الشريفين، فكان يسافر اليهما في كل عام مرة أو مرتين من سنين حاجاً أو معتمراً، كما كانت له رحلات دعوية الى البلاد القريبة والبعيدة استجابة لدعوة أرباب المدارس والجامعات الاسلامية، ومن البلاد التي سافر اليها: مصر، وشام، وقطر، وليبيا، ويمن، وبحرين، والامارات المتحدة العربية، وبريطانية، وأفريقية الشمالية، وموريطانية، وكينيا، ومالي، ونائيجر، وموريشس، وزمبيا، وملاوى، وسرى لنكا، وبنغله ديش، والجزر الهندية وغيرها من الدول الاسلامية ودول الأقليات.

الشيخ الى رحمة الله:

استشهد شيخنا رحمه الله مساء يوم الجمعة السابع والعشرين من جمادي الأولى سنة ١٤٣٣ هـ الموافق لعشرين من شهر ابريل ٢٠١٢ م.

وذلك في حادثة جوية أثناء رحلته من كراتشي الى اسلام آباد واستشهدت معه أخته الشقيقة، وتلميذه الوفي المفتي عرفان عبد الحميد خريج الجامعة وعدد كبير من اخواننا المسلمين المواطنين، وكانت جنازته مشهودة بمجموعة كبيرة من العوام والخواص، قد صلى عليه أولاً في المسجد الجامع فاروق اعظم بمدينة اسلام آباد الشيخ فضل الرحمن حفظه الله رئيس منظمة جمعية علماء الاسلام باكستان، ثم انتقل جثمانه الى قرية بابوزئي وصلى عليه هناك الشيخ المحدث الدكتور شير علي شاه حفظه الله شيخ الحديث بدار العلوم الحقانية اكوره ختك ثم دفن في المقبرة الأهلية، وذلك في يوم السبت ٢٨ من جمادي الاولى ١٤٣٣ هـ، فرحمه الله تعالى رحمة واسعة.

هذا ولما بلغ نعيه مشيخة الجامعة وطلابها وخريجها ومحبيها طاروا اليها من قريب وبعيد، حتى غصت ساحتها بالعلماء والعظماء والأعيان والطلاب والعامة، جاؤوا يشاطرون الأسى والحزن وقد ارتسمت على وجوههم آثار الفاجعة ومظاهر الألم،

ثم أقيمت حفلة فى دار الحديث بين فيها شيخنا المحدث عبد الرؤوف خان الغزنوى حفظه الله أستاذ الحديث بالجامعة ومدير المجلة البيئات، فنّبّه على أوصافه ومآثره وقام بواجب الشكر الجزيل لهذا الجمع الذين شاركوا أساتذة الجامعة فى هذه الكارثة، وانتهت الحفلة بدعوات الشيخ التقى شمس الرحمن العباسى حفظه الله خريج الجامعة القديم وتلميذ الشيخ العلامة محمد يوسف البنورى الحسينى رحمه الله.

ترك الشيخ رحمه الله خلفه أباه الحنون الشيخ مشفق الرحمن وأمه، وثلاث اخوة: الشيخ لطف الرحمن، والشيخ حفظ الرحمن، كلاهما من خريج الجامعة، والأخ أحمد الرحمن، ومن ولده: الأخ مسيح الرحمن خريج الجامعة، والأخ فصيح الرحمن الطالب فى قسم التخصص فى الفقه الاسلامى بالجامعة، والأخ جميل الرحمن الطالب فى صف الخامس، والأخ مليح الرحمن الطالب فى الصف الأول، وعددا كثيرا من تلاميذه ومجيه.

ولاشك أن الشيخ رحمه الله ترك فراغا كبيرا فى الجامعة لا يملأه الا الله، وبعد شيوع نباه استشهادة تسارعت الأقلام، فكتبت كلمات كثيرة فى الجرائد والمجلات للتعريف بمقامه علما وعملا، وخلقا وخلقا، وإدارة وخطابة، فرحمه الله تعالى وغفرله ورفع درجته فى أعلى الجنان وأعطى ذويه الصبر والسلوان، آمين وختاما أقول كما قال الشاعر:

عبارتنا شتى وحسنك واحد وكل الى ذاك الجمال يشير



عبرات حزن فى رثاء الشيخ عطاء الرحمن شهيد رحمه الله

الشيخ رزين شاه



تبصر هل ترى لى من دوائى
فيمكن أن يكون هنا شفائى
فاجرى دمعنا مثل الدماء
فزعزع كلنا قبل العشاء
وضوضاء وذاوقت المساء
حرمننا الآن من حبي عطاء
اتاه الموت فى جو السماء
فتلك بلية بعد البلاء
فصار وفائه كل الوفاء
وأدخل كلهم دار البقاء
يصيح الناس طرابا البكاء
وصبر أنت كل الأقرباء
يعزيه جميع الأصدقاء
وقاه الله اهل للثناء
جزاك اللهنا خير الجزاء
هم راضون حقا بالقضاء
وذى الدنيا تصير الى الفناء
حييا كان ازكى الازكياء
فان الله يجزى بالعزاء
تقبل انت ياربى دعائى

أيادكتور أنت طيب دأى
فانك انت مسلاى ملاذى
رمى الحدثان جامعة العلوم
أتى نبأ عظيم شجون
ففى الغبراء والخضراء ضج
فقدنا قبل احبارا كبار
فيا اسفى على شيخ كريم
وماتت اخته ايضا كذاك
ومات وفيه العرفان ايضا
عليهم رحمة الرحمن دوما
فلا ييكى اقاربهم فرادى
فيا انعام لاتجزع عليهم
وان ابا عطاء ذو كروب
وراض بالقضا من الاله
تجلد انت يا امداد! واصبر
فان الله يرضى عن عباد
يذوق الموت حقا كل نفس
فقدنا عالما درأيتيما
فنصبر بعده صبرا جميلا
له يدعو رزين كل حين

الشيخ الدكتور عبدالرزاق اسكندر حفظه الله تعالى

لمسة وفاء مسطرة في قصيدة رثاء

قصيدة وفاء ورثاء لصاحب فضيلة الشيخ مولانا عطاء الرحمن مرداني عميد شؤن التعليم والدراسات بالجامعة وتلميذه الخاص مولانا عرفان تخليد الذكراها وتسطير المآثرها الغراء وأياديهما البيضاء والذين قد وافاها الأجل في حادث تحطم الطائرة الباكستانية التي أقلعت من مطار كراتشي قبل ربوطها بمطار اسلام آباد في ٢٠ / ٤ / ٢٠١٢ م، - نسأل الله أن يتغمدها بواسع رحمته ويسكنها فسيح جناته آمين-

فُجِعَ الْبَيَّانُ بِسَحَرِهِ وَسَنَائِهِ	وهوت بلاغة ساجع بصدائِهِ
وَنَعَى النُّعَادَةَ إِلَى الْعُلُومِ فَهَوْمَهَا	والى المكارم طُهرَهَا بصفائِهِ
لُبَّى قِضَاءَ اللَّهِ فِي وَهَجِ السَّمَاءِ	بَيْنَ الْغَمَامِ مُقَدَّرًا بِجَزَائِهِ
مُسْتَوْفِيًا حُلُومَ الْحَيَاةِ وَمَرَّهَا	وَالْحُزْنَ قَدْ شَقَّ الْفُؤَادَ بِدَائِهِ
فَبَكَتْ مَا قِينَا عَلَى شَيْخِ الْهُدَى	لَمَّا تَحَطَّمَ حَامِلٌ ب(عَطَائِهِ)
هَذَا لَعَمْرُ اللَّهِ - سَاعَةً حَسْرَةً	وَتَوَجَّعَ أَلَمًا عَلَى لَوَائِهِ
فَالدَّمَعُ يُسْكَبُ وَالْجَوَائِعُ تَصْطَلِي	بَلْطَى الْأَسَى مَاذَا جَرَى بِلَائِهِ؟
وَالْكُلُّ يَذْكُرُ صَفْوَةً وَمُحِبُّهُ	(عِرْفَانُهُ) ذَاكَ الصَّغْفَى لَوْفَائِهِ
يَكِي عَلَيْهِ مَشَايخُ وَتَلَامِيذُ	مِنْ جَامِعِ الْعِلْمِ الزَّلَالِ بِمَائِهِ
صَرُحَ الْعُلُومُ وَنَبَّعُهَا فِي مِحْنَةٍ	بِفِرَاقِ الْإِمْنِ (الْعَطَا) وَذَكَائِهِ
يَارَبِّ أَكْرَمِ رُوحَهُ وَرَوَاحَهُ	وَعُدُوَّةً، وَارْفَعَهُ عِنْدَ لِقَائِهِ
وَاسْكُبْ عَلَيْهِ سَحَابَ الرَّحْمَاتِ فِي	دَارِ الْخُلُودِ مَعَ النَّبِيِّ وَلَوَائِهِ
وَالْطِفِ بِنَا يَا ذَا الْجَلَالِ وَذَا الْعُلَا	وَاقْبَلْ (نَعِيمًا) بِالرَّضَا وَدَعَائِهِ

اهداء من المحب الصادق / نعيم الله بن الشيخ عبد السلام خريج جامعة العلوم الاسلاميه بنورى تاؤن بكراتشى، وأحد المنسوبين بوزارة العدل بالمملكة العربية السعودية، وأحد زملاء المرحوم الشيخ عطاء الرحمن في الدراسة، والمقيم حالياً بمكة المكرمة.

سعودی سفارت خانہ کراچی کی طرف سے رئیس الجامعہ کو بھیجا گیا تعزیتی خط

الشیخ محمد فخر الاسلام المدنی

الاستاذ بالجامعہ بنوری ٹاؤن



رئیس الجامعہ الدكتور عبد الرزاق اسکندر حفظہ اللہ تعالیٰ

یتلقى رسالة العزاء من القنصلية العامة للمملكة العربية السعودية كراتشي الى فضيلة الشيخ الدكتور عبد الرزاق اسکندر

(رئیس جامعۃ العلوم الاسلامیہ) حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

بقلوب مؤمنة بقضاء اللہ وقدرہ أتقدم لفضيلتکم ونيابة عن منسوبي القنصلية العامة بكراتشي بأحر التعازي القلبية وعظيم

المواساة بوفاة المغفور لهم بأذن اللہ تعالیٰ کلامن:

۱- فضيلة الشيخ عطاء الرحمن وأخته، ۲- فضيلة الشيخ عرفان-

وذلك في حادث الطائرة وانه لايسعنا بهذا المصاب الجلل الا ان نبتهل الى المولى عزوجل أن يتغمد روح الفقداء الغاليين

بواسع رحمته ويسكنهم فسيح جناته ويلهمكم الصبر والسلوان ”انا لله وانا اليه راجعون ان لله ما أخذ وله ما أعطى وكل شئى

عنده الى أجل مسمى، فلتصبر ولتحتسب، عظم اللہ أجرکم وغفر لميتکم وأحسن عزائکم-

أخوكم القنصل العام فالح بن محمد الرحيلي-

ترجمہ: از مولانا عبد الرحمن فاروق فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن

رئیس الجامعہ الدكتور عبد الرزاق اسکندر (اللہ ان کی حفاظت فرمائے)

یہ تعزیتی خط جو کہ سعودی قونصلیٹ کراچی کی جانب سے فضیلۃ الشیخ الدكتور عبد الرزاق اسکندر (رئیس الجامعۃ العلوم الاسلامیہ) (اللہ ان کی حفاظت

فرمائے) کو بھیجا گیا ہے۔

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ!

اللہ کی قضاء و قدر پر رضاء مندی اور دلی غمگینی کے ساتھ میں آپ کو سعودی قونصلیٹ کراچی کی جانب سے ان کی نیابت کرتے ہوئے تعزیتی خط پیش کر

رہا ہوں اللہ کے حکم سے ایک عظیم حادثے میں فضیلۃ الشیخ عطاء الرحمن، ان کی بہن اور فضیلۃ الشیخ عرفان کی شہادت پر جو کہ جہاز کے حادثے میں فوت

ہو گئے اس عظیم مصیبت میں ہم اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ سے دعاء کرتے ہیں کہ اللہ ان کی روحوں کو اپنی رحمت واسعہ میں جگہ عطاء فرمائے اور

آپ لوگوں کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔

بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جس کو چاہے وہ لے لے اور جس کو چاہے چھوڑ

دے اور ہر چیز کی موت کا ایک وقت مقرر ہے، پس صبر کیجئے اور ثواب کی امید رکھیئے، اللہ آپ کے اجر کو بڑھا دے اور آپ کے شہداء کی مغفرت فرما دے

اور آپ کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔

آپ کا بھائی: قونصلیٹ فالح بن محمد الرحيلي



ملفوظات حضرت شہیدؒ

ملفوظات اکابر، بروایت حضرت شہیدؒ

شعربات وادبیات حضرت شہیدؒ

ملفوظات

مولانا محمد سفیان بلند

مدرس جامعہ عثمانیہ بہادر آباد



کیا عجب حادثہ ہے؟ کیسا دلخراش سانحہ ہے؟ جس استاذ محترم کی زیارت دلوں کو جلا بخشی، ان کی گفتگو روح کو تروتازہ رکھتی، آج ہم ان کی برکات و انوارات سے محروم ہو گئے۔ میرے محبوب استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعہ بعد نماز عصر کراچی سے اسلام آباد جانے والی بھوجا انیئر لائن کے حادثہ میں شہادت کا رتبہ پا کر اس دار فانی سے دار باقی کو روانہ ہو گئے، اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

حضرت استاذ محترمؒ سے مجھے آٹھ سالہ درس نظامی کے زمانے میں شرح ملا جامی ۱۹۹۹ء میں ہدایہ شریف ۲۰۰۰ء میں اور تفسیر بیضاوی شریف ۲۰۰۲ء میں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ طالب علمی کے دور سے ہی آپؒ کی ذات سے جو فائدہ میسر آیا، وہ میرے لئے گرانقدر سرمایہ ہے، فراغت کے بعد بھی برابر آپؒ سے ہر ملاقات میں محبت و دعا اور استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔ الحمد للہ! اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے بندہ کو یہ توفیق بخشی کہ دورانِ تعلیم تمام اساتذہ کے ملفوظات و نصائح کو پابندی سے قلم بند کرتا رہا۔ آپؒ سے مختلف موقعوں پر بہت قیمتی نصائح اور مفید مشورے بھی ملے، سر دست اس مضمون میں زمانہ طالب علمی کے مرتب کردہ چند ملفوظات پیش خدمت ہیں، جن کی تازگی اور حسن آج بھی اسی طرح برقرار ہے، جیسا کہ آپؒ کی زندگی میں تھا۔ علمی و اصلاحی ملفوظات:

۱..... ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس ذات سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں مسلمان بنایا، بہترین مذہب یعنی فقہ حنفی کی نعمت سے نوازا اور بہترین مسلک یعنی مسلک اہل سنت والجماعت دیو بند سے منسلک فرمایا، الحمد للہ! اس کے عقائد و احکام، مسائل و فروعات واضح، روشن، مفید اور سب سے زیادہ صحیح ہیں، بخلاف دوسرے مسالک کے کہ ان کے پاس چند مخصوص مسائل ہیں۔

۲..... آج جو یاد کر لو گے وہ بعد میں کام آئے گا، بعد میں ذمہ داریاں اور مسائل کی کثرت کی وجہ سے کچھ یاد نہیں کر سکتے۔

۳..... انگریزی تعلیم بری چیز نہیں، بلکہ انگریزی تہذیب بری چیز ہے، اگر کسی بزرگ نے جوش میں آ کر کہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ انگریزی تعلیم، انگریزی تہذیب لاتی ہے، اس وجہ سے وہ منع کرتے ہیں۔

۴..... جو بات استاذ سے سنی، وہ ہمیشہ یاد رہتی ہے، اگرچہ جتنی شروحات اور کتب کا مطالعہ کر لیا جائے، کیونکہ اصل تو استاذ کی صحبت کا اثر ہے۔

۵..... عربوں میں سات قبائل تھے، اہل حجاز، اہل یمن، ہوازن، ثقیف، عقیل، طئی، بنو تمیم اور قرآن کریم ان سات کی قرأت پر نازل ہوا ہے۔

۶..... کسی بھی مسئلہ کی بنیاد مثال پر نہیں ہوتی، مثال کے غلط ہونے سے مسئلہ کی صحت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن استشہاد کے غلط ہو جانے سے مسئلہ کی بنیاد خراب ہو جاتی ہے، لہذا صحیح استشہاد کا ہونا لازمی شرط ہے۔

۷..... اللہ تعالیٰ نے آپؐ سب کو اونچا مقام دیا ہے، جو آدمی دین کا کام کرے، اللہ تعالیٰ اس کو اونچا مقام دیتے ہیں، لیکن اگر ہم دین کو اس لئے پڑھ رہے ہیں کہ یہ ہمارا پیشہ ہو، فراغت کے بعد امامت کریں، پڑھائیں اور کچھ نہ ملا تو ناظرہ پڑھا کر کمائیں تو سمجھ لو ہم دین اس وجہ سے نہیں پڑھ رہے۔

۸..... استاذ کو طلبہ سے یہ کبھی نہ کہنا چاہئے کہ فلاں کتاب مشکل ہے، کیونکہ طلبہ کی نفسیات یہ ہے کہ اگر ان کو کہہ دیا جائے کہ فلاں کتاب مشکل ہے تو ان کی ہمت کم ہو جاتی ہے اور جن کی ہمت کم ہوتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس فن اور کتاب کے پڑھنے والے لوگ اور طلبہ الگ ہیں۔ مشکل کچھ نہیں، ذرا سی ہمت کی بات ہے۔

۹..... میں کہا کرتا ہوں کہ بنات کا درس نظامی کورس ۴ سال کی بجائے ۱۶ سال ہونا چاہئے، کیونکہ جب کا ملین فی العقل طلبہ کا کورس ۸ سال کا ہے تو ناقصات فی العقل طالبات کے لئے دو گنا یعنی ۱۶ سال کا ہونا چاہئے، مگر یہاں تو بنات کو ۴ سال میں فارغ کر دیتے ہیں۔

۱۰..... ڈاکخانہ کا نظام حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں رائج ہوا، آپؐ نے مختلف راستوں پر ٹھہرنے کے لئے آرامگاہیں اور اسٹیشن بنوائے جن کو برید کہا جاتا تھا، برید، برد سے ہے بمعنی ٹھنڈا ہونا، یہاں آ کر لوگ آرام کرتے تھے۔

۱۱..... ہجد بمعنی نوم یعنی نیند اور تہجد بمعنی ترک النوم یعنی نیند کا ترک کرنا، راتوں کو نیند کا ترک کرنا اللہ کو بہت پسند ہے، رات کو آپؐ تہجد کا

اہتمام کیا کرو۔

۱۲..... حضرت امام مبردؒ کا تکیہ کلام تھا۔ ”برد اللہ من بردنی“، یعنی جو مجھے ٹھنڈک پہنچائے اللہ اسے ٹھنڈک پہنچا، اس وجہ سے ان کا نام مبرد پڑ گیا، لفظ مبرد کو بکسر الرائ وفتح الرائ دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

۱۳..... علم ٹھوس اور راسخ ہو تو دین کے جس شعبے میں جاؤ گے اللہ تعالیٰ کام لے گا اور اگر ٹھوس نہ ہو تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

۱۴..... فرقہ معتزلہ کی ابتداء تابعین کے دور میں ہوئی، یہ فرقہ شریعت کی ہر بات کو عقل سے پرکھتا تھا، اس کے بانی واصل بن عطاء اور عمر بن عبیدو ساتھی تھے، جو حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد تھے، انہوں نے استاذ سے اختلاف کیا اور ان کو چھوڑ دیا تو اس پر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ”اعتزلنا عنا“، یعنی یہ دونوں ہم سے الگ ہو گئے، اس کے بعد ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

۱۵..... علم بلاغت کی اصطلاحات یاد کرنے کے لئے آسان اور مفید کتاب ”دروس البلاغة“ ہے، اس کا مطالعہ مختصر المعانی پڑھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

۱۶..... آج ہم دین کو اپنے تابع کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ دین کو ہماری ضرورت نہیں، دین تو ساری زندگی کا نام ہے۔ لوگوں نے پردہ کو صرف عدت میں لازم سمجھ لیا ہے، جبکہ عورت کو پردہ ساری زندگی کرنا چاہئے۔

۱۷..... اگر کوئی مرد دعویٰ کرے کہ سامنے سے آنے والی عورت کے متعلق میرے دل میں کچھ نہیں اور عورت بھی دعویٰ کرے تو یہ ”فیما بینہما وبین اللہ“ تو ہوگا، مگر قانون اسلامی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ آپس میں ملیں، بلکہ اس پر مؤاخذہ ہوگا، اپنی نگاہوں کو پست رکھیں، ویلڈنگ والے کو دیکھیں کہ کس طرح اپنے کام میں لگن دوسری طرف نہیں دیکھتا۔

۱۸..... ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں، ہم تو کسی کی دعا سے پار ہو جائیں گے، ہمارے لئے دعا کرو، دعا میں بخل نہ کرو، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ فرماتے تھے کہ: ”اومیاں بخیل! اگر تمہاری جیب سے ایک روپیہ چائے کے لئے نہیں نکلتا تو دعا ہی کر لیا کرو کہ اس میں تو پیسہ بھی نہیں لگتا۔“

۱۹..... نماز سے قبل تحری لازمی ہے، یہ نہیں کہ بغیر تحری کے جہاں چاہا منہ کر کے نماز پڑھ لی، بلکہ تحری کرے، بعض لوگ بس یا اسٹیشن میں بغیر قبلہ معلوم کئے نماز پڑھ لیتے ہیں اور آیت ”فَإَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهَ اللَّهِ“ پڑھتے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔

۲۰..... تکبیر تحریمہ سے مراد یہ ہے کہ جو چیزیں نماز سے باہر حلال تھیں، اب وہ حرام ہو گئیں، اب صرف اللہ کے حضور کھڑے ہیں، یہاں تو ایسا حال ہوتا ہے کہ نماز میں بھی دنیاوی خیالات آتے ہیں۔

۲۱..... ہر ایک کے سوال کا جواب نہ دیا جائے، کیونکہ اس کا فائدہ نہیں، بعض اوقات لوگ ایسے سوالات کرتے ہیں کہ ان کے جواب دیتے ہوئے شرم آتی ہے، کیونکہ ان کا اعتراض براہ راست قرآن و حدیث پر ہوتا ہے، اس کے جواب دینے سے ان کے ایمان کا خطرہ بھی رہتا ہے۔

۲۲..... آج کل لوگوں میں استخارے نکلوانے کی عادت ہے، دور دراز علاقے میں جاتے ہیں کہ فلاں سے استخارہ نکلوانا ہے، بعض علاقوں میں تو اس کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ آپ کے پاس استخارہ کی دعا موجود ہے، جس کو ضرورت ہو بتلائیں اور وہ خود استخارہ کرے، استخارہ میں خواب وغیرہ کا دیکھنا حدیث سے ثابت نہیں، البتہ بزرگوں نے بتلایا ہے، لیکن ہر ایک تعبیر کا ماہر نہیں، استخارہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلبی رجحان پر اشارہ ہوتا ہے۔

۲۳..... لوگوں کو سورہ فاتحہ کے ذریعے شفا مل جانے پر اتنا یقین نہیں، جتنا عام وظائف کا یقین ہے، حالانکہ سورہ فاتحہ میں موت کے سوا تمام بیماریوں سے شفا ہے، کسی کو بتلاؤ تو کہتا کہ کوئی اور وظیفہ بتلاؤ، ایسوں کو وظائف پورے کرنے کا شوق ہوتا ہے، نمازیں قضا کر دیتے ہیں، ایک صاحب قرضوں میں جکڑے ہوئے تھے، میں نے ان کو حضور ﷺ کی دعا سکھائی: ”اللھم اکفنی بحلالک عن حرامک و اغنی بفضلك عن سواک“ تو مجھے بزبان حال یوں دیکھنے لگے کہ یہ تو کوئی وظیفہ نہیں، کوئی اور وظیفہ بتلاؤ، حضور ﷺ سے بڑا پیر اور بزرگ کون ہو سکتا ہے؟ (کوئی بھی نہیں)۔

۲۴..... اللہ کی ذات بڑی، اسی طرح اللہ کا نام بھی بڑا، اللہ تعالیٰ کے نام کو وسیلہ بنا کر دعا کرنا صحیح ہے، لیکن اس طرح نہ کہے کہ: اے اللہ! تو رحمن ہے، رحیم ہے، تو یوں کر دے، بلکہ یوں کہے کہ: یا اللہ! تو رحمن ہے رحم فرما، کرم فرما۔

۲۵..... دنیا میں تحقیق ہو رہی ہے کہ دنیا کی پہلی زبان کنوسی ہے؟ جمہور کا قول عربی زبان کا ہے، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے آئے تو وہاں سے عربی آئی، پھر حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے بعد جس جزیرے پر اترے اس کا نام سریان بھی تھا تو وہاں سے سریانی زبان آئی، آپ اس کو تاریخ میں پڑھ لو، میں نے شیخ ڈاکٹر بشار عواد شامی حفظہ اللہ سے پوچھا کہ پہلی زبان کنوسی تھی؟ فرمانے لگے کہ: ”جنت اور حضور ﷺ کی زبان عربی ہے، ہمارے لئے

یہی دلیل کافی ہے، شیخ صاحب حدیث و تاریخ دونوں میں نمایاں مقام اور مہارت رکھتے ہیں، میں نے پوچھا کہ عربوں کی تقسیم عار بہ، باندہ اور مستعربہ صحیح ہے؟ کہنے لگے کہ جو عرب میں گیا وہ عربی بن گیا اور جو عجم میں گیا وہ عجمی بن گیا، اگرچہ کہیں بھی رہنے والا ہو 'من استعرب صار عربیاً ومن استعجم صار عجمیاً'۔ اسی طرح فرمانے لگے کہ: 'جو لفظ قرآن کریم نے استعمال کیا، وہ عربی ہے، اگرچہ پہلے سے عجمی لفظ ہو،' جمہور فرماتے ہیں کہ: قرآن مجید میں عربی الفاظ اور عجمی الفاظ دونوں ہیں اور آیت مبارکہ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ "للاکثر حکم الکمل" کے تحت بیان کی گئی ہے۔

۲۶..... درجہ رابعہ کے سال میں نے "تفسیر عثمانی" بیس روپے میں خریدی، اچھی تفسیر ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ تھا جس میں دوسری تفاسیر پر تبصرہ تھا، مثلاً مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" کے متعلق مذکور تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات رحمان و رحیم کے مبالغہ کی تشبیہ اردو کے لفظ لمبا ترنگا سے دی ہے، یہ بے ادبی کا جملہ ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کو ایسے جملوں سے تشبیہ دینا خطرناک غلطی ہے، میں نے کتب خانے میں جا کر "تفہیم القرآن" سے مراجعت کی تو یہ عبارت نہ تھی، میرے دل میں خیال آیا کہ کسی کی طرف اس طرح غلط نسبت نہیں کرنی چاہئے، پھر میں حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ کے پاس مجلس دعوت و تحقیق گیا تو انہوں نے "تفہیم القرآن" کا پرانا چھپا ہوا نسخہ نکالا، اس میں یہ عبارت مل گئی، تب معلوم چلا کہ یہ لوگ ہمارے اکابر کی عبارات کو دیکھ کر مودودی صاحب کی عبارات کو ٹھیک کر رہے ہیں۔

۲۷..... یہ دعایا دکر لو اور پڑھا کرو: اللّٰهُمَّ فَارِجَ الْغَمِّ كَاشِفَ الْغَمِّ مُجِيبَ دَعْوَةِ الْمَظْطَرِّ رَحْمَنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَرَحِيمَهُمَا أَنْتَ تَرْحَمُنِي فَارِحَمْنِي رَحْمَةً تَغْنِيْنِي بِهَا عَمَّنْ سِوَاكَ۔

۲۸..... انسان اللہ تعالیٰ کی جتنی عبادت کر لے، وہ اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا، مشہور واقعہ ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک گلاس پانی پینے کے لئے اپنی آدھی حکومت اور اس کو نکالنے کے لئے آدھی حکومت دے دی، کیونکہ پانی کا پینا اور اس کا پیشاب کی صورت میں نکل جانا اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

۲۹..... انسانی بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور ہر جوڑ کا صدقہ دینا چاہئے، ان جوڑوں کے درمیان لزوجت یعنی چکنائی کا مادہ ہے، اگر وہ ختم ہو جائے تو یہ کام کرنا چھوڑ دیں، دو رکعت نماز جوڑوں کا صدقہ ہے، لہذا آپ بھی اس صدقہ کی عادت بنائیں، یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

۳۰..... شکر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ زبان سے ادا کیا جائے، دوسرا طریقہ اعضاء و جوارح سے ادا کرنا ہے کہ کسی نے کوئی کام کیا تو مکافات عمل پر اس کا کام کر دیا جائے، تیسرا طریقہ دل سے ادا کرنا ہے کہ اس کو اچھا سمجھا جائے، ایک شاعر کہتا ہے:

وَمَا كَانَ شُكْرِي وَافِيًا بِنَوَالِكُمْ

وَلَكِنِّي حَاولْتُ فِي الْجَهْدِ مَذْهَبًا

أَفَادَتَكُمْ النِّعْمَاءُ مِنْ ثَلَاثَةِ

يَدَيِّ وَلِسَانِي وَالضَّمِيرِ الْمَحْجَبِ

۳۱..... ایک سادہ لوح شخص سے کس نے پوچھا کہ دینار کی قیمت زیادہ ہے، درہم کی قیمت اس سے کم ہے اور فلس کی قیمت اس سے کم، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کو کوئی جواب نہ آیا، مگر اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے لفظ دینار پانچ حرنی تو اس کی قیمت زیادہ، درہم چار حرنی تو اس کی قیمت اس سے کم اور فلس تین حرنی تو اس کی قیمت اس سے کم ہے، اس واقعہ کو لطائف میں شمار کیا ہے۔ حقیقت ایسی نہیں یا ہو سکتا ہے کہ لفظ کی وضع میں بھی اس کا خیال رکھا گیا ہو۔

۳۲..... اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے، مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو پیدا فرمائے گا جو گناہ کرے گی اور توبہ کرے گی، یہ حدیث گناہ پر ترغیب نہیں، بلکہ توبہ پر ترغیب کے لئے ہے، اس میں اشارہ ہے کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔

۳۳..... قضائے حاجت کے بعد کی دعا میں "غفرانک" پڑھنے کی اچھی توجیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ذکر کی ہے کہ آدمی جب اپنی غلاظتوں کو دیکھتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی غیر مرئی غلاظتوں حسد، کبر، کینہ اور عداوت کا استحضار کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ! میرے اندر سے ان غلاظتوں کو بھی دور فرما تو گویا "غفرانک" سے ان باطنی غلاظتوں پر توبہ و استغفار کرنا ہے۔

۳۴..... اللہ رب العزت کی شان میں ایسا کوئی جملہ جس میں سوئے ادب کا احتمال ہو اور تاویل سے وہ احتمال دور بھی ہو جاتا ہو، بیان کرنا مناسب نہیں، اہل سنت والجماعت کا یہی عقیدہ ہے اور ہم اس جیسے جملوں سے احتراز کرتے ہیں۔

۳۵..... یہ انسان بھی کیسے گاڑی چلاتا ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ کسی اور کے اختیار میں ہے، اس کے اختیار

میں ہوتا سامنے والے کو پکچل دے، اللہ تعالیٰ نے محافظ فرشتے مقرر کئے ہیں جو انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔

۳۶..... لوگ حج و عمرہ کے موقع پر مقامات مقدسہ کی زیارات کو جاتے ہیں، غار حرا اور غار ثور پر جا کر تصویر کھینچواتے ہیں، میرا ایک مقتدی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مولانا صاحب! میں غار ثور گیا تو فوٹو بنانے والوں نے کہا کہ تصویر کھینچو! میں نے منع کیا، مگر انہوں نے زبردستی کی اور تصویر کھینچ لی، میں نے سوچا کہ چلو بچوں کو دکھا دوں گا، میں واپس گروپ کے پاس آیا تو وہ تصویر وہاں گر گئی اور گروپ کے ساتھیوں نے دیکھ لی، امیر گروپ کو شکایت بھی کر دی، میں نے ان سے کہا کہ میں نے تو ایک گناہ کیا اور تم لوگوں نے کئی گناہ کئے، میرا گناہ ظاہر کیا، میری غیبت کی، میری چغل خوری کی، وغیرہ۔ امیر صاحب کہنے لگے کہ تم کسی عالم سے پوچھ لو، کہیں تم پر دم تو نہیں آ گیا؟ میں نے جناب مولانا ملک عبد الحفیظ مکی صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ نہیں! صرف توبہ استغفار کر لو، میں بھی آپ لوگوں کو یہی کہتا ہوں کہ دین کو اچھی طرح سیکھو، کہیں تصویر کھینچوانے پر دم نہ لگو! دینا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ کسی بندے کا رتبہ بڑھانا چاہتے ہیں تو گناہ کروا کر توبہ کی توفیق دیتے ہیں کہ اس پر وہ مقام ملے گا جو نیکی پر نہیں ملتا، گناہ بھی کبھی کبھی رتبہ بڑھانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں، آدمی کو چاہئے کہ اپنے گناہ پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہے۔

۳۷..... انبیاء کرام علیہم السلام کے مراتب میں افضلیت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اور خود حق سبحانہ و تقدس اور حضور ﷺ نے اس کو بیان کیا ہے، مگر امت کو تعلیم دی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام میں ایک دوسرے کو فضیلت نہ دیں، اس میں صرف اللہ و رسول ﷺ کو اختیار ہے، ہم تو حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال میں تاویل کرتے ہیں، لیکن بعض خطباء اس کو جب بیان کرتے ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا، یہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو افسانہ بنا دیتے ہیں، آپ حضرات مستقبل کے خطباء ہیں، اس لئے آپ سے کہہ رہا ہوں، بات دل کو لگ رہی ہے یا نہیں؟

۳۸..... آپ کل فارغ ہو جائیں گے، آٹھ سال پڑھ کر جس چیز کا ذہن نہ بنا، وہ ایک دو مہینے کسی چیز میں لگ کر ذہن میں بیٹھ جائے گی، اس لئے ایک اہم نصیحت کرتا ہوں:

”ہم حنفی ہیں اور لاکھوں مسائل میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کی تقلید کرتے ہیں، ہمارا تعلق مسلک دیوبند سے ہے، ہم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اب اگر آپ میں سے کسی کی کوئی رائے ہو تو وہ اپنی حد تک رکھے، اس کی تحقیق کرے، مگر اپنا مسلک نہ بنائے، بلکہ جمہور علماء دیوبند کے مسلک کو سامنے رکھے، اپنے اکابر اور جمہور علماء کو برا نہ کہے، ان کی طرف شرکی نسبت نہ کرے، اس میں اپنا ہی نقصان ہوگا، اپنی رائے و تحقیق کو اپنی حد تک رکھیں۔

۳۹..... میرے دوستو! یاد رکھو، ہدیہ یک طرفہ نہ ہو کہ یہ رشوت تو نہیں، البتہ اس میں رشوت کی بوضو رہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”تھادوا تحابوا“ ہدیہ دینے سے محبت بڑھتی ہے، ہدیہ مقاماتِ محبت میں سے ہے، ہدیہ پرندے نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت کی تو اس پر یہ شعر کہا گیا ہے:

جاءت سليمان يوم العرض هدهدة

أهدت بجراد كان في فيها

وأنشدت بلسان الحال قائلة

ان الهدايا على مقدار مُهديها

ایک شاعر کا شعر ہے:

لو كان يهدى الى الإنسان قيمته

لكان يهدى لك الدنيا وما فيها

۴۰..... میں نے ایک بزرگ سے سنا کہ عنقریب وحدت ادیان کے نام ایک فتنہ آ رہا ہے اور وہ کہیں گے کہ سارے ادیان سے مقصود اللہ تک پہنچنا ہے، چاہے چرچ سے ہو، معبد سے ہو، مندر سے ہو، مسجد سے ہو، واقعہً یہ ایک فتنہ آ رہا ہے، میں نے اپنے جامعہ کے ایک فاضل سے سنا اور وہ واقعی میں فاضل (یعنی فضلہ سے) تھا، ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگا کہ: اصول معلوم ہونے چاہئیں، قرآنی آیت ”إِنَّ الدِّينَ أَمْسُوْا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى“ سے معلوم چلتا ہے کہ یہود و نصاریٰ بھی حق پر ہیں، اس کی وجہ سے ان کو ساتھ ذکر کیا ہے، یہ مولوی حضرات بلا وجہ ایک دوسرے پر فتویٰ لگاتے ہیں اور ہر ایک کو گمراہ کہتے ہیں۔ میں نے اس کو سمجھایا، مگر وہ اکابر پر اعتراض کرنے لگا، اپنے اکابر پر اعتماد کریں کہ ان پر اعتماد کرنے میں بچاؤ ہے، ورنہ آدمی گمراہ ہو جائے گا۔

۴۱..... حضرت تھانویؒ کے اکثر علوم موہبی ہیں، انہوں نے علم تو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور دوسرے اکابر دیوبند سے حاصل کیا، مگر صحبت اکابر نے ان کے علوم میں چار چاند لگا دیئے۔

۴۲..... ہم پر اس جامعہ اور بانی جامعہ حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کے احسانات ہیں، اگر آج ہم اس جامعہ میں نہ ہوتے، یہاں نہ پڑھا ہوتا، یہ دینی خدمت کا موقع نہ ملتا تو پتہ نہیں کہاں کہاں ٹھوکر کھارہے ہوتے؟ آپ سے کہتا ہوں کہ بانی جامعہ اور اساتذہ جامعہ کو ایصال ثواب کرتے رہا کریں، ان کو دعاؤں میں یاد رکھیں، جامعہ کے لئے دعا کیا کریں، ہم پر جامعہ کے بہت احسانات ہیں، ہمیں یہاں ہر چیز مفت میں فراہم کی جاتی ہے، کسی چیز کا کوئی عوض نہیں لیا جاتا، صرف دعا تو ہم کر سکتے ہیں۔

۴۳..... تقویٰ کیا ہے؟ ہر کام سے پہلے یہ خیال ہو کہ لوگوں کے دیکھنے سے پہلے اللہ دیکھ رہا ہے اور ہر بات سے پہلے یہ سوچے کہ سب سے پہلے میرا اللہ سن رہا ہے اور آدمی دنیاوی خواہشات سے بچ کر اس دنیا سے گزر جائے۔

۴۴..... لوگوں کے بھی عجیب استدلال ہوتے ہیں، ایک صاحب کہنے لگے کہ: میں نے شیعہ عورت سے شادی کر لی ہے، میں سنی ہوں، میرے والدین بھی خوش ہیں، اس سے نہ میرے دین کا نقصان ہے نہ اس کے دین کا، ویسے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ“ یہ ہے لوگوں کا غلط استدلال کہ اپنی طرف سے قرآن کو بیان کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں پتہ کہ یہ آیت ہے، حدیث نہیں۔

۴۵..... ایک استاذ سبق پڑھا رہے تھے تو کہنے لگے کہ: یہ نئی بات ہے اور ہر نئی بات ”کل حدود لذوذ“ کے تحت بیان کی جاتی ہے، ایک شاگرد نے کہا کہ استاذ جی! یہ جملہ تو ”کل جدید لذید“ ہے، کہنے لگے کہ یہ جملہ بھی پرانا ہو گیا ہے، اس میں بھی جدت آنی چاہئے۔

۴۶..... اہل علم کی ذمہ داری بہت بڑی ہے، اگر وہ ہر مجلس میں ہاں ہاں ملائیں تو ان کی پکڑ ہو سکتی ہے، اس سے بچاؤ کی صورت یہی ہے کہ ہر مجلس میں جانے سے بچیں، ورنہ پکڑ ہوگی کہ فلاں مجلس میں یہ غلط بات ہوئی، تم نے صحیح بات کو کیوں نہ واضح کیا؟۔

۴۷..... حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: علم عجیب خزانہ ہے، دوسرے خزانے خرچ کرنے سے ختم ہوتے ہیں اور یہ خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔

۴۸..... میں ڈرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم مولویوں سے سوال فرمائے کہ: لوگوں نے اسلامی نظام لانے کے لئے بہت کچھ کہا اور کیا، لیکن تم لوگوں نے کیا کیا؟۔

۴۹..... انکار حدیث ایک فتنہ ہے، یہ کہتے ہیں کہ صرف قرآن سے دلیل بیان کرو، ایسے لوگوں کا ذکر حدیث میں آتا ہے کہ آئندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو یہ کہیں گے کہ ہم کو صرف قرآن سے دلیل دو، میں نے رسالہ ”طلوع اسلام“ کے ایک مضمون میں پڑھا کہ اس فتنہ کا اصل محرک اور بانی سر سید احمد خان تھا جو بظاہر مسلمان تھا اور اندر سے فتنہ پرور تھا۔ حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکنیؒ کو آخری زمانے میں اس فتنہ کی بڑی فکر تھی کہ کیسے یہ ختم ہوگا؟ بار بار اس فتنہ کے انداد کی بات کرتے تھے، آپ اگر احادیث کو چھوڑ دیں تو نماز کی رکعتوں کی تعداد، زکوٰۃ کے نصاب اور اس کی مقادیر، روزہ کی صحیح صورت اور ترتیب، حج کا مکمل طریقہ اور دیگر احکام قرآنی، صدقات، جہاد اور بیوعات کی تمام صورتیں کہاں سے ملیں گی؟ پھر آپ آیت کریمہ ”لَتُبَيِّنَنَّ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ“ کی تفسیر کیا کریں گے؟ ان تمام چیزوں کا ہمیں حضور ﷺ کے ارشادات ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسا عمل کس طرح کرنا ہے اور حضور ﷺ سے محبت کی علامت آپ ﷺ کی اطاعت ہے، اطاعت میں ہر طریقہ محبوب کا لینا ضروری ہے، ورنہ اطاعت ناقص رہے گی، بلکہ اطاعت ہی نہ ہوگی۔

۵۰..... تقدیر میں انسانی عقل کو روکا گیا ہے کہ آگے نہ بڑھے، جہاں تک جانے کو کہا ہے وہاں تک جائے۔ انسانی عقل میں فرق ہے، اسی اعتبار سے مؤاخذہ میں بھی فرق ہوگا، اسی وجہ سے مجنون سے مؤاخذہ نہ ہوگا کیونکہ اس میں عقل نہیں، اپنی عقلوں کو لگام دیں، حد سے آگے نہ بڑھنے دیں، گزشتہ امتوں کی ہلاکت مسئلہ تقدیر میں غور و فکر کی زیادتی پر ہوئی۔

۵۱..... موت کا وقت مقرر ہے، جب اللہ تعالیٰ نے لکھی ہے آئے گی، ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں کہ اس وجہ سے واقع ہوئی ہے، لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں، اگر یہ ہوتا تو یوں ہو جاتا، آدمی بچ جاتا، لوگوں کا جملہ الٹا ہو گیا ہے کہ یوں ہو گیا تو وہ مر گیا، حالانکہ صحیح جملہ یہ ہے کہ موت آنی تھی، یہ چیز سبب بن گئی۔

۵۲..... انسان میں کمال ہوتا ہے، مگر روحانی امراض مثلاً جہل، بدعتیگی، حسد، لوگوں کے لئے کینہ، برائی سے محبت وغیرہ اس کمال کے لئے مغل بن جاتے ہیں اور انسان فضائل کے حصول سے رہ جاتا ہے، انسانی کمال کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ جہنم سے بچ جائے اور جنت میں چلا جائے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان کو انبیاء علیہ السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین کا درجہ اور ساتھ مل جائے۔

۵۳..... جھوٹ بولنا حرام ہے، سوائے تین جگہوں کے کہ وہاں پر جائز ہے، ایک یہ کہ دو آدمیوں میں صلح کرادی جائے۔ دوسرا جنگ کے دوران، مثلاً

آدمی ایسی بات کہے کہ دشمن پر قابو پالے، اس کو ”الحرب خدعة“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تیسرے میاں بیوی میں اُن بن ہو جائے تو صلح کرادی جائے۔ زوجین میں علیحدگی بچوں کے قتل کے مترادف ہے، اس سے اولاد نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتی ہے، اس موقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے، بہتر یہ ہے کہ توریہ کر لیا جائے۔

۵۴..... یہ جملہ یاد رکھیں کہ ”اسلام دین فطرت ہے“ اب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اسکی عقل کی کمی ہے، کیونکہ قرآن میں ہے کہ ”وَمَا أُوتِيتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا“ آج دنیا کی نگاہ میں عقل مند کوئی اور ہوتا ہے، جبکہ قرآن وحدیث میں عقل مند کسی اور کو کہا گیا ہے۔

۵۵..... فرقہ قدریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کا سب کے ساتھ ساتھ خالق بھی ہے، انسان کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکنی فرماتے تھے کہ آج بھی یہ لوگ موجود ہیں، آؤ! میرے ساتھ آؤ! میں دکھاؤں، کبھی فرماتے کہ یہ جو باہر پتلون والے پھر رہے ہیں، ان میں ایسے لوگ دکھاتا ہوں۔

۵۶..... شریعت مطہرہ ظاہری بات دیکھ کر فیصلہ کرتی ہے، کس کے دل میں کیا ہے؟ اس کا فیصلہ آخرت میں ہوگا، تصدیق قلبی کا علم تو اللہ کے ہے، یہاں تو تصدیق لسانی اور اقرار پر مفتی فتویٰ دے گا:

إِن الْكَلَامَ لَفِي الْفَوَادِ وَإِنَّمَا

جَعَلَ اللِّسَانَ عَلَى الْفَوَادِ دَلِيلًا

۵۷..... جب ہوائیں چلتی ہیں تو اس وقت ہوا کو گالی دینے کے بجائے یہ دعا پڑھو: ”اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ هَذِهِ الرِّيحِ وَخَيْرَ مَا فِيهَا وَخَيْرَ مَا أَمُرْتُ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ هَذِهِ الرِّيحِ وَشَرِّ مَا فِيهَا وَشَرِّ مَا أَمُرْتُ“۔

۵۸..... حضور ﷺ کی شان تو ویسے ہی بہت بلند ہے، لیکن دنیا میں آپ کی زندگی کا ایسا واقعہ جس سے آپ ﷺ کی رفعت شان بیان کی جائے، وہ واقعہ معراج و اسراء ہے اور اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے لئے اعلیٰ صفت عبد کو ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے: ”سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا“ اور ارشاد فرمایا: ”فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ“ آپ بتائیں کہ بندگی سے بڑھ کر اور کیا شان ہو سکتی ہے اصل راز ہی عبدیت اور بندگی میں ہے۔ اسراء اور معراج کی تعریف میں فرق ہے، حضور ﷺ کا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر رات کو ہوا، یہ اسراء کہلاتا ہے، اس کا ذکر سورۃ الاسراء یعنی سورہ بنی اسرائیل میں ہے اور مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی سیر، انبیاء علیہم السلام سے ملاقات، جنت و جہنم کے مختلف مقامات کو دیکھنا اور باری تعالیٰ کا دیدار وغیرہ یہ سب سفر معراج ہے، اس کا ذکر سورۃ النجم میں ہے، اکثر مولویوں کو بھی ان میں فرق پتہ نہیں ہوتا۔

۵۹..... حدیث شریف میں آتا ہے ”بئس العبد عبد يختل الدين بالشبهات“ معنی یہ ہے کہ دین کو شبہات اور غلط تاویلات کے ساتھ بیان کرنے والا بدترین بندہ ہے، ایسا آدمی جو حلال کو حرام، حرام کو حلال، جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز کرنے والا ہو، وہ بدترین بندہ ہے۔

۶۰..... بخاری شریف کی ایک موقوف روایت میں ہے کہ ایمان چابی ہے اور اعمال اس چابی کے دندانے ہیں، بیضاوی شریف میں ص: ۴۸ پر ہے کہ ”الإيمان الذي هو عبارة عن التحقيق والتصديق أسس أى أساس والعمل الصالح كالبناء عليه“ مفہوم یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، جس کی مثال بنیاد کی سی ہے اور اعمال صالحہ اس بنیاد پر عمارت کی مانند ہے۔

۶۱..... ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے بندوں سے محبت کرتا ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جو رات کو اٹھ کر اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھتا ہے اور اس کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔

۶۲..... دنیا والے کہتے ہیں کہ مسلمان متعصب ہیں، ایک عرب شیخ نے بہت اچھا اس کا جواب دیا، کہتے ہیں کہ: تم کہتے ہو کہ: ہم متعصب ہیں؟ جبکہ تم بتاؤ کہ تم میں سے کسی کا نام محمد ہو یا کسی نے اپنا یا اپنے بچوں کا نام محمد رکھا ہو، بچوں کا نام عائشہ وفاطمہ رکھا ہو، جبکہ ہم مسلمان اپنی اولاد کا نام تمہارے انبیاء علیہم السلام خاص کر حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے نام پر رکھتے ہیں، ہم میں تو اس نام کے لوگ بہت ہیں، تم میں کوئی ہے؟ جس کا نام ہمارے آقا اور پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے نام پر ہو، بتاؤ! متعصب کون ہے؟

۶۳..... یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ سمجھنا، اس کو پڑھنا اور اس کو بیان کرنا، جب انسان اس کو سمجھتا ہے تو اس کو مزا آ جاتا ہے، آج اسی وجہ سے اس قرآن کریم سے دور کیا جا رہا ہے۔

۶۴..... مدرسہ میں رہتے ہوئے ہمارے کچھ پہلوؤں میں کمی ہے، یہ باتیں ہم لوگوں سے نہیں کہہ سکتے، لیکن ہم سوچیں کہ ہم جس کام میں لگے ہیں، اس

میں خیر زیادہ ہے یا شر؟ اگر خیر زیادہ ہے تو اس کو مقدم رکھیں، کیونکہ ترک خیر بھی شر کا ذریعہ بنے گا، بیضاوی شریف میں ص: ۵۹ پر عبارت ہے کہ: ”فان ترک الخیر الكثير لاجل الشر القلیل کثیر“۔

۶۵..... انسان کو تین طرح کی قوت دی گئیں ہیں: (۱) قوت شہویہ (۲) قوت غضبیہ (۳) قوت عقلیہ۔ پہلی دو قوتیں انسان کو ہلاتی ہیں اور تیسری قوت انسان کو باندھ کر رکھتی ہے اور اس قوت کو دین کے تابع رکھا گیا ہے، فرشتوں میں انسان کی پہلی دو قوتیں نہیں ہیں، البتہ ان میں عقل موجود ہے، فرشتوں نے انسانوں کی قوتوں کو الگ الگ دیکھا تو اعتراض کیا کہ اگر انسان حقدار خلافت ہے تو ہم تو اس سے زیادہ مستحق ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوت عقلیہ عطا فرمائی کہ اس کی نگرانی میں بقیہ دو صفات اور قوت اچھی ہو کر خلافت کا کام اعلیٰ انداز میں انجام دے سکتی ہیں۔

۶۶..... حضور ﷺ کے اخلاق کے بارے میں آتا ہے کہ ”کان خلقه القرآن“ اب جو حضور ﷺ کی مسند پر بیٹھے گا تو ان اخلاق کے ساتھ ہو، ورنہ کیسے وارث ہوگا؟ اور کیسے اس مسند پر بیٹھے گا؟

۶۷..... رفیق بناؤ، رفیق نہ بناؤ، رفیق اور رفیق کے حروف برابر ہیں، ترتیب بدلنے سے رفیق فریق اور فریق رفیق بن جاتا ہے، جو رفیق سے فریق بن جائے، اس کی توجہ اپنے کام سے ہٹ جاتی ہے، کیونکہ وہ اپنے کام میں لگتا ہے اور دوسرے کے کام کے خلاف سوچتا ہے، ہر ایک کو اپنا رفیق سمجھو، تاکہ اپنے کام سے توجہ نہ ہٹے۔

۶۸..... تعلیم کے آداب میں سے یہ ہے کہ استاذ کے پڑھانے کے لئے جاتے اور آتے وقت راستہ میں سوال نہ کرو، اب تو یہ ادب ختم ہو گیا ہے، بلکہ اب تو یہ حال ہے کہ استاذ کو پرچیاں لکھتے ہیں اور نہ جانے پرچیوں میں کیا کیا لکھ دیتے ہیں، یاد رکھو! تمہاری کسی ایک بے ادبی والی پرچی سے علم کے سلب ہونے کا اندیشہ ہے۔

۶۹..... امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ہر انسان کے تین باپ ہوتے ہیں: (۱) ”من ولد“، یعنی جس نے جنا (۲) ”من زوج“، یعنی جس نے شادی کروائی یعنی سر (۳) ”من علم“، جس نے علم سکھایا، یہ بات حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ بھی بیان کرتے تھے۔

۷۰..... حشویہ اور باطنیہ یہ دو فرقے ہیں جو عصمت انبیاء علیہم السلام کے قائل نہیں، انہوں نے حضرت آدم علیہم السلام کے قصہ سے استدلال کیا ہے۔ اہل حق اہلسنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے نہ صغائر ہوتے ہیں اور نہ کبائر، بلکہ انہوں نے ایک خلاف اولیٰ کام کو اجتہادی طور پر کیا ہے اور آپ کو پتہ ہے: مجتہد کا غلط اجتہاد بھی باعث اجر ہے، لیکن ان کا مرتبہ بہت اعلیٰ ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلاف اولیٰ کام پر سرزنش میں سختی ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور محبوب کو اختیار ہے کہ اپنے محبوب کو جس طرح یاد کرے، دنیا کا قانون اور فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنوں سے بوقت سرزنش سخت انداز میں کلام کیا جاتا ہے۔

۷۱..... انسان تکبر کرتا ہے، اگر وہ اپنا محاسبہ کرے اور اپنی حقیقت پر غور کرے تو تکبر نہ رہے، لوگ اپنے والدین کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں، ان کی نافرمانی کرتے ہیں، منہ پر تھپڑ مارتے ہیں، جبکہ ان کے کتنے احسان ہیں، اس پر غور کریں، ایک لڑکے کا باپ میرے پاس آ کر روتا تھا، مجھے معلوم تھا کہ اس کا لڑکا اپنے باپ کو ستاتا ہے، جب باپ کا انتقال ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک کونے میں کھڑا رو رہا تھا، نہ جنازہ پڑھایا، نہ پڑھا، بلکہ روتا رہا، مجھے تعجب سے ہنسی آرہی تھی کہ اب رو رہا ہے، جب باپ زندہ تھا تو اس وقت کیا کیا؟۔

۷۲..... لوگ بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں، ایک صاحب مجھ سے پوچھنے لگے کہ نماز میں ”تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ“ پڑھنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں تو بددعا ہے اور بددعا تو نہیں کرنی چاہئے، یہ لوگوں کی باتیں بھی بڑی عجیب ہیں۔

۷۳..... حدیث کے لفظ ”قرنی“ میں ایک لطیفہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے خلافت راشدہ کی طرف اشارہ ملتا ہے، چاروں خلفاء راشدینؓ کے اسماء گرامی کے آخر کا حرف اس میں ہے، تو ”ق“ سے ابوبکر صدیقؓ، ”ز“ سے عمرؓ، ”ن“ سے عثمانؓ اور ”ی“ سے علیؓ کی طرف اشارہ ملتا ہے، گویا معلوم چلا کہ حضور ﷺ کا زمانہ اس طرح ختم ہوگا، دوسرا آیت کریمہ: ”مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ“ میں بھی ترتیب خلافت کی طرف اشارہ ہے کہ: ”وَالَّذِينَ مَعَهُ“ میں معیت کی اعلیٰ صفت حضرت ابوبکرؓ ہیں، ”أَشْدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ“ کی اعلیٰ صفت حضرت عمرؓ ہیں، ”رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ“ کی اعلیٰ صفت حضرت عثمانؓ ہیں اور ”تَرَاهُمْ رُكُوعًا سُجَّدًا“ کی اعلیٰ صفت حضرت علیؓ میں ہے۔

۷۴..... ”الصلوة عماد الدين“ اور ”الصلوة نور المؤمن“ حدیث میں مذکور ہے، البتہ ”الصلوة معراج المؤمنین“ حدیث نہیں، بزرگوں کا مقولہ ہے، مطلب اور معنی کے اعتبار سے صحیح ہے کہ نماز میں بندہ اپنے رب سے مناجات کر رہا ہوتا ہے۔

دوزخ اگر وسیع ہے تو رحمت وسیع تر

”لا تقنطوا“ جواب ہے ”ہل من مزید“ کا

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بس امید کرتے رہیں اور گناہ کرتے رہیں، بلکہ دونوں چیزیں ضروری ہیں، امید بھی ہو، خوف بھی ہو، شعر سے مقصود یہ ہے کہ مایوس نہ ہو، رحمت کا امیدوار رہو۔

۷۶..... ہر مسلمان کے دل میں اللہ کا نام ہونا چاہئے، حضور ﷺ نے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد دہانی کی طرف متوجہ کیا، کھانے پر بیٹھے تو ارشاد ہے کہ: ”سم اللہ کل بسمینک وکل مما یلیک“، بیت الخلاء میں جا رہے ہوں تو ارشاد ہے کہ: ”اللہم انی أعوذ بک من الخبث والخبائث“ اور باہر نکل رہے تو ارشاد ہے کہ: ”غفرانک الحمد للہ الخ“، رات کو سوتے وقت کی دعائیں اور احکامات ہیں، ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی ترغیب ہے، کتنا جامع دین ہے جو ہر موقع کی بات بتلاتا ہے اور ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اس کی حفاظت میں لے آتا ہے، یہ دعائیں حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، عام لوگ ماشاء اللہ! بہت اہتمام کر لیتے ہیں جو تبلیغ میں کچھ وقت لگا لیتے ہیں، ہم کو بھی اس کا اہتمام کرنا چاہئے، ہمارے دین نے یہ ہمیں تربیت دی ہے۔

۷۷..... تبلیغی جماعت والے اچھے لوگ ہیں، ماشاء اللہ! لوگوں کی خوب فکر کرتے ہیں، اس راستے میں بھی لوگوں کو شہادت کا رتبہ ملتا ہے، جی ہاں! ہمارے جامعہ میں ایک بہت ذہین لڑکا پڑھتا تھا، مولوی محمد سعید مرحوم نام تھا، اسکی عبارت بھی اچھی تھی، ایک دفعہ میں نے پشتو شعر پڑھا تو اس نے زبانی سنا دیا، وہ فراغت کے بعد تبلیغ میں سال لگانے گیا تو نہر میں گر کر شہید ہو گیا، رحمہ اللہ رحمةً واسعةً۔

۷۸..... اپنے اساتذہ کی قدر کر لیں، یہ چلے جائیں گے تو پھر آپ افسوس کرتے رہیں گے، بڑے بڑے اساتذہ چلے گئے، حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکنی، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن اور حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی۔ جو آج جو موجود ہیں، ان کی قدر کر لیں، ورنہ کل یہ بھی نہ ملیں گے، ہم تو آج تک ان کی باتوں کو یاد کر کے روتے ہیں۔

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)

اکابر جامعہ کے ملفوظات (بروایت حضرت الاستاذ مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)

مولانا محمد سفیان بلند

فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن



استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کو جامعہ اور اکابر جامعہ سے بہت محبت تھی، آپ نے اپنے اساتذہ اور اکابر جامعہ کے علوم کو اپنی ذات میں خوب جذب کیا، ان کے ملفوظات و فرمودات آپ کو ہر موقع کے یاد تھے، اکابر کی بات کو اپنے لئے بھی راہنما سمجھتے اور اپنے طلبہ کو بھی اس کی طرف متوجہ کرتے، خاص کر جب اکابر کی باتیں ان کے مخصوص انداز میں دہراتے تو وجد میں آ جاتے، لہجہ بھی ان کے جیسا بنا لیتے، محبوبیت و مرجعیت کے پیکر بن کر ساری زندگی جامعہ اور اکابر جامعہ کے لئے گزری، اپنی جان، صلاحیتیں اور زندگی کا ہر لمحہ دین متین کی سربلندی کے لئے صرف کرتے ہوئے جان جان آفرین کے سپرد کی، زندگی بھی قابل رشک تھی اور موت بھی شہادت جیسے رتبہ والی، بہت کم یہ دولت کسی کو نصیب ہوتی ہے، اس مضمون میں آپ کے وہ ملفوظات ذکر کئے جا رہے ہیں جو آپ نے اکابر جامعہ کے مختلف موقعوں پر درس گاہ میں بیان کئے، جنہیں بندہ طالب علمی کے زمانے سے نوٹ کرتا رہا، الحمد للہ! رب تعالیٰ کی توفیق سے پورے درس نظامی میں تمام اساتذہ کرام کے ملفوظات و نصائح کا اچھا خاصا مجموعہ جمع ہو گیا، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کو امت تک صحیح طور پر پہنچانے کی سعادت نصیب فرمائے، آمین۔

۱..... میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں افتتاحی تقریب کے موقع پر خود حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ جو طلبہ نئے بڑھنے والے آئے ہیں، وہ تصحیح نیت کر لیں اور جو طلبہ برائے والے ہیں وہ تجدید نیت کر لیں۔

- ۲..... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکیؒ فرماتے تھے کہ طلبہ کی بیماری ”نم خیرا“ (وہاں بہتر ہے) کی ہے، ایک مدرسہ میں گئے، وہاں پڑھا، دوسرے مدرسہ کے بارے میں سنا کہ وہ اچھا ہے تو وہاں چلے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ مدرسہ ہمارے مدرسہ سے اچھا ہے۔
- ۳..... ہمارے ایک استاذ فرماتے تھے کہ: قرآن مجید سب سے زیادہ مظلوم کتاب ہے، ہر ایک اپنی بات کو جس طرح چاہے قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگرچہ اسکو قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کے آداب معلوم نہ ہوں، یہ قرآن کریم کے ساتھ ظلم ہے۔
- ۴..... حضرت مولانا شاہ محمد ابراہیمؒ حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ دین کے ہر کام میں اخلاص رکھو اور جو بھی دین کا کام کر رہا ہو، اس کی مدد کرو، آپس میں رفیق بنو، فریق نہ بنو، ان دونوں لفظوں میں ترتیب بدل گئی تو معنی بدل جائے گا۔
- ۵..... حدیث میں جائیدادیں بنانے کی ممانعت آئی ہے، ارشاد ہے ”لَا تَتَّخِذُوا الضَّيْعَةَ“ حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکیؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے تھے کہ جائیدادیں مت بناؤ۔

- ۶..... حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ فرمایا کرتے تھے کہ: دیکھو! سبق سمجھ لو، میں نے کھول کھول کر سمجھا دیا ہے، اگر اب نہیں سمجھو گے تو میں کہوں گا کہ قصور تو بیل کا ہے۔ بیل کا واقعہ یہ ہے کہ ایک کسان کھیت میں بل چلا رہا تھا، بیل ٹھیک نہیں چل رہا تھا تو کسان کہنے لگا، دیکھو! اگر صحیح نہیں چلو گے تو کھیتی خراب ہو جائے گی تو میں مالک سے کہوں گا کہ قصور تو بیل کا ہے۔
- ۷..... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکیؒ فرماتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے دعا کیجئے، میں ان سے کہتا ہوں کہ تم صالحین بن جاؤ، تمام نمازی تمہارے لئے ہر نماز میں دعا کریں گے۔

- ۸..... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکیؒ فرماتے تھے کہ جو چیز بھی تبرکات نبوی اور تبرکات اکابر میں سے ہے، وہ ہمارے لئے نہایت نہایت قابل قدر ہے اور حضور ﷺ کا جسد اطہر زمین کے جس حصہ سے لگا ہے، وہ حصہ عرش سے زیادہ افضل ہے۔ پھر حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے کہ: اس نام پر لوگوں نے اپنے نام سے بہت چیزیں جمع کی ہیں اور وہ ویسے ہی دکھاتے ہیں، حالانکہ بعض جگہوں پر ایسی چیزیں ہیں، ہر جگہ نہیں، بہر حال! اب میں ایسی چیز بتا رہا ہوں جس کے تبرک نبوی ہونے میں پوری امت کا اختلاف نہیں اور وہ قرآن ہے، قرآن!۔

- ۹..... حضرت مولانا مفتی عبدالسیع شہیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ: کتاب شروع کرتے وقت مصنف کے حالات، کتاب کے متعلق چند باتیں طلبہ کو بتانی چاہئیں، لیکن طلبہ بھی ایسے ہیں کہ ان کو بتاؤ یا نہ بتاؤ، یہ معاف نہیں کرتے، البتہ نہ بتانے میں تو خاص کر معاف نہیں کرتے۔
- ۱۰..... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکیؒ فرماتے تھے کہ: استاذ سبق سمجھو اور طلبہ دھیان سے سنیں اور اس سے زیادہ یوں فرماتے کہ: استاذ سمجھو، طلبہ نہ سمجھیں، یعنی استاذ کو اپنے فن اور کتاب سے بھرپور مناسبت ضروری ہو۔

- ۱۱..... حضرت مولانا محمد بدیع الزمانؒ درود شریف پڑھنے کی بہت ہی تاکید فرماتے، کہتے کہ اس کا ثواب نقد ملتا ہے، سب کو ایک وقت مقرر کر کے درود شریف پڑھنا چاہئے، اس کا بہت فائدہ ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ ہمارے خاندان کو جو کچھ ملا ہے، وہ سب درود شریف کی برکت سے ہے۔

- ۱۲..... حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم کے اعجاز کبھی ختم نہ ہوں گے، سورۃ المجادلہ ایسی سورت ہے جس کی ہر آیت میں لفظ اللہ موجود ہے۔

- ۱۳..... حضرت مفتی ولی حسن ٹوکیؒ فرماتے تھے کہ: لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مختلف فرقے ختم ہو گئے، میں کہتا ہوں کہ یہ آج بھی موجود ہیں، پھر اپنے مخصوص انداز میں فرماتے کہ ہے کوئی؟ میرے ساتھ چلے، میں اس کو دکھاتا ہوں، ایک دفعہ فرمانے لگے کہ: ان پتلونوں والوں میں یہ فرقوں والے ہیں۔

- ۱۴..... حضرت مفتی ولی حسن ٹوکیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مسجد سے نکل رہا تھا تو دیکھا کہ ایک آدمی مانگ رہا ہے، ایک آدمی نے اس کو ایک روپیہ دیا، میں اس کو جانتا ہوں کہ وہ سیٹھ تھا، مگر ایک روپیہ دیا، میں نے دس روپے دیئے، دس روپے دیئے، یہ آپ اپنے مخصوص انداز میں فرماتے۔

- ۱۵..... حضرت مفتی ولی حسن ٹوکیؒ فرماتے تھے کہ حدیث ”أَنْ تَلِدَ الْأُمَةُ رِبْتَهَا“ کا مفہوم یوں بھی سمجھ میں آیا کہ جب بے نظیر بھٹو پہلی بار وزیراعظم بنیں تو ان کی والدہ نصرت بھٹو کو سینئر وزیر کہا گیا، جن کا رتبہ تو نہیں ہوتا مگر نام ہوتا ہے۔

- ۱۶..... حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کے جسم کے عناصر اربعہ، یعنی آگ، ہوا، پانی اور مٹی کی تو فکر کی، مگر روح کے عناصر اربعہ یعنی علم، عمل، اخلاص اور خوفِ آخرت کی فکر نہ کی، اس کو انہوں نے حدیث ”هَذَا النَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُونَ إِلَّا الْعَالَمُونَ“ سے لیا

ہے۔

۱۷..... حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے ملفوظات میں ہے کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا گیارہ مرتبہ پڑھا کرو: ”اللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ عَلٰى طَاعَتِكَ“، انہوں نے حوالہ دیا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اسکو پڑھا کرتے تھے، اہل علم کو چاہئے کہ وہ اسکا اہتمام کریں، کیونکہ ان کو امور دینیہ میں لگنا ہوتا ہے۔

۱۸..... حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ سے ایک صاحب مطالعہ کے لئے کتاب لے گئے، واپس لائے تو اس کے صفحات نکلے ہوئے تھے، بسا اوقات کتابوں کے صفحات نکل جاتے ہیں، حضرتؒ کی عادت سلیقہ سے رکھنے کی تھی تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ تم کو ہدیہ ہے، ہم دوسری کتاب لے لیں گے۔

۱۹..... حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر رہے ہیں، ان کے دورِ صدارت میں صدر پاکستان چیف آف آرمی اسٹاف جناب محمد ضیاء الحق مرحوم نے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ وفاق کے درس نظامی کی سند ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کی سند کے مساوی ہوگی، حضرت مولاناؒ دورہ حدیث میں سبق پڑھانے تشریف لائے، آپ دورانِ درس غیر ضروری باتیں یا سیاسی باتیں نہیں کرتے تھے، کسی طالب علم نے حکومت کے اس حکم نامہ کے متعلق سوال کیا تو اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ: اچھا تجھے معلوم ہو گیا ہے، اچھا اچھا! پھر فرمایا کہ یہ وفاق کی سند کو بڑھانے کا نہیں، بلکہ گھٹانے کا منصوبہ ہے، وفاق کی سند تو ایم اے سے بہت بڑھی ہوئی ہے، ایک مرتبہ حکومت کی طرف سے آپ کے نام خط آیا کہ آپ کے وفاق المدارس کے تحت جو مدارس چل رہے ہیں، ان کا خرچہ کہاں سے آتا ہے؟ آپ نے ناظم وفاق سے فرمایا کہ ان کو جواب میں لکھ دو ”وَفِی السَّمَاءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تَوْعَدُوْنَ“ فقط والسلام۔

۲۰..... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکنیؒ فرماتے تھے کہ ہندوستان میں غیر مقلدین کا طریقہ واردات یہ تھا کہ احناف کی مساجد میں دودو، تین تین کی ٹولیوں کی صورت میں جاتے اور ساتھ کھڑے ہوتے، امام جب سورہ فاتحہ ختم کرتا اور ”وَلَا الضَّالِّیْنَ“ پڑھتا تو یہ لوگ زور سے آمین پڑھتے، یعنی آمین بالجہر پڑھتے، تاکہ لوگ سنیں اور ان سے وجہ پوچھیں تو وہ اپنے مسلک کو بیان کریں، اس طرح کرنے سے مختلف علاقوں کی مساجد میں انہوں نے جھگڑے پیدا کئے تو اہل علاقہ نے عدالت میں ان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا، انہوں نے فیصلہ کروانا چاہا، اس زمانے کا جج انگریز تھا، اس نے دونوں طرف کے لوگوں سے کتابیں منگوائیں اور مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ میں نے مسلمانوں کی کتابیں پڑھیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر حضور ﷺ سے دونوں طریقے ثابت ہیں، یعنی آمین بالسر بھی اور آمین بالجہر بھی، لیکن یہ لوگ یعنی غیر مقلدین جو آمین پڑھتے ہیں، وہ آمین بالشر ہے، لہذا آج سے ان کو اس کی اجازت نہیں کہ ان حنفی حضرات کی مساجد میں جا کر اس طرح آمین کہیں۔ ایک جج بھی قرآن وحدیث کے مطالعہ سے حق تک پہنچ سکتا ہے، مگر یہ غیر مقلدین اگر نیت درست نہ رکھیں تو ان کو حق نہیں مل سکتا، کیونکہ نیت میں شروفساد ہے۔

۲۱..... حضرت مفتی ولی حسن ٹوکنیؒ فرماتے تھے کہ ایک دیہاتی آدمی تھا، قرآن پڑھنا نہ جانتا تھا، مگر قرآن کریم پڑھنے کا شوق تھا، ہر سطر پر انگلی رکھتا اور کہتا کہ اے اللہ! یہ تیرا کلام ہے، یہ حق ہے، یہ بھی حق ہے، اس کو قرآن کریم کے حق ہونے پر یقین تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔

۲۲..... حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ ایک بخیل کا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ: اس کے پاس ایک انجیر آئی، اس نے دیکھا کہ سامنے سے قاری صاحب آرہے ہیں تو اس کو رومال کے نیچے چھپا لیا، کافی دیر قاری صاحب سے باتیں کرتا رہا، پھر قاری صاحب سے تلاوت سنانے کو کہا، اس نے سورہ تین کی تلاوت یوں شروع کی ”الزَّيْتُونُ وَطُورِ سِينِينَ الْح“، بخیل نے کہا کہ ”ابن التین“؟ یعنی شروع میں لفظ ”وَالْتَيْنِ“ کہاں ہے، کیوں نہ پڑھا؟ قاری صاحب نے جواب دیا کہ: ”تحت مندیلك“، یعنی تیرے رومال کے نیچے ہے، حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ: یہ واقعہ کتاب البخلاء میں ہے، یہ اچھی کتاب ہے، تم لوگوں کے پاس ہے؟ میرے پاس یہ کتاب تھی جو ایک بخیل لے گیا اور پھر لے کر نہیں آیا۔

۲۳..... ٹائی کا فلسفہ یہی ہے کہ نعوذ باللہ! حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھا دیئے گئے ہیں، میں نے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کو آخر زمانے میں دیکھا کہ تین باتوں پر زیادہ زور دیا کرتے تھے، ایک عورتوں کے لئے سختی سے پردہ کرنے پر، دوسرا ڈاڑھی رکھنے پر اور تیسرا ٹائی نہ لگانے کی ترغیب دیتے تھے، ڈاڑھی کے سلسلے میں تو آپ آخر زمانے میں بغیر ڈاڑھی والے سے ملنا پسند نہ فرماتے تھے، ہم علماء ہیں، ہمیں بھی اس سلسلے میں سنجیدہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۴..... حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ جلالین کے دوران اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: انسان کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس کو دور راستے دکھائے ہیں: وَنَفْسٌ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا، وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ، اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ اِمَّا شَاكِرًا

وَأَمَّا كُفُورًا“۔ آپ یہ تین آیات بہت پڑھتے تھے، اسی وجہ سے میری بھی ان آیات کو پڑھنے کی بہت عادت ہے۔

۲۵..... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکنی فرمایا کرتے تھے کہ: فجر کی سنتوں میں پہلی رکعت میں سورہ کافرون اور دوسری میں سورہ اخلاص پڑھنا سنت ہے، اس کا فلسفہ اور حکمت یہ ہے کہ پہلی سورت میں تخیلہ اور دوسری سورت میں تخلیہ ہے۔

۲۶..... حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث جس میں شیطان نے ان کو آیۃ الکرسی بتلائی اور حضور ﷺ نے جب یہ سنا تو ارشاد فرمایا کہ ”صدق و هو کذب“، یعنی جھوٹے آدمی نے سچی بات کہی، اس حدیث کی روشنی میں حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکنی فرمایا کرتے تھے کہ: ایک مسئلہ مستنبط کرتا ہوں کہ: اگر کوئی مبتدع پیرا چھا وظیفہ بتا دے تو وہ لینا جائز ہے۔

۲۷..... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکنی فرماتے تھے کہ: لوگ آپ پر جو کچھ خرچ کر رہے ہیں، اس کی وجہ آپ کا دینی علم کو سیکھنا اور پڑھنا ہے، یہ ساری سہولتیں اس دین کی برکت سے مل رہی ہیں، جو یہاں ٹھیکہ بنائے ہوئے رہ رہے ہیں اور کام و مقصد دوسرا ہے تو (جلال میں آتے ہوئے فرمایا کہ) میرا فتویٰ ہے، میرا فتویٰ ہے کہ یہ حرام ہے، یہ حرام ہے، آج آپ جو اساتذہ کی باتیں سن کر اس پر تبصرہ کرتے ہیں اور استاذ کی نصیحت کو مذاق سمجھتے ہیں، وہ طلبہ ذلیل ہوتے ہیں۔

۲۸..... حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ جو تبلیغی جماعت کے اکابرین میں سے ہیں: فرماتے ہیں کہ جس طرح جسم کے نظام کے ٹھیک ہونے کے لئے قلب انسانی کا ٹھیک ہونا ضروری ہے، حدیث میں آتا ہے: **إِن فِي الْجِسْمِ لِمُضْغَةٍ إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهُوَ الْقَلْبُ**، اسی طرح کائنات کے نظام کے ٹھیک ہونے کے لئے انسان کا ٹھیک ہونا ضروری ہے۔

۲۹..... حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: انسان کے نام کا اشتقاق کچھ بھی ہو، اس میں اس کا اثر ضرور ہوتا ہے، جیسے ہمارے حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کے نام کا اشتقاق درس سے ہے، ان کو ہر وقت درس و تدریس میں دیکھا، ایک دفعہ ہم نے ان سے کہا کہ حضرت! امتحان میں دودن باقی ہیں، امتحان بھی قریب ہیں، آپ سبق بند فرمادیں تو مسجد کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے کہ: تم تو وہاں جا کر پڑھو گے اور میں کیا کروں گا، گھر پر پڑا رہوں گا؟۔ ایک دفعہ جناح ہسپتال میں زیر علاج تھے، ہم ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تو ڈاکٹر سے کہنے لگے کہ: بس! اتنا کر دیں کہ میں درس پڑھانے اور نماز پڑھنے کے قابل ہو جاؤں۔

۳۰..... ہم نے مشکوٰۃ اول حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ اور مشکوٰۃ ثانی حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ سے پڑھی، مسئلہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام میں ذکر کیا جاتا ہے کہ ”حسنات الابوار سیئات المقربین“، تو ہمیں سمجھ نہ آتا تھا، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ نے اس کی مثال اس طرح پیش کی کہ لوگ نماز پڑھ کر جا رہے ہوں اور ایک آدمی کو اس کا شیخ ڈانٹ رہا ہو کہ تم نے نوافل کیوں نہ پڑھے؟ حالانکہ نوافل ضروری نہیں ہیں، لیکن تربیت کے لئے انداز یہ اختیار کیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی تربیت فرماتے ہیں۔

۳۱..... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکنی فرماتے تھے کہ: حکماء نے لکھا ہے کہ مولیٰ باضم ہے، لیکن خود ہضم نہیں ہوتی اور مولوی و مولیٰ میں یہ ایک صفت مشترک ہے کہ مولوی پوری دنیا کو ٹھیک کر دیتا ہے، لیکن خود ٹھیک نہیں ہوتا، یہ آپ مزاحاً فرماتے تھے، ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ: مولوی کا معنی ہے اللہ والا، مولانا والا، یہاں یا نسبت کی ہے، اصل مولوی وہی ہے جس کو تعلق مع اللہ حاصل ہو۔

علم مولانا ہو جسے ہے مولوی جیسے حضرت مولوی معنوی

۳۲..... راقم الحروف ابو حازم مدنی عفا اللہ عنہ کے درجہ سابعہ کے اختتام کے موقع پر حضرت استاذ محترم مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نے یہ نصیحت اکابر ارشاد فرمائی:

”آپ اس فتنہ کے دور میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں دین، مدرسہ، اساتذہ اور طلبہ سے جوڑھے رکھا، ورنہ ہم کہاں پھر رہے ہوتے؟ حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ نے اپنے آخری سال ختم بخاری کے موقع پر دو بنیادی باتیں ارشاد فرمائیں: ایک یہ کہ یہ خیال نہ ہو کہ ہم عالم بن گئے ہیں، بلکہ یہ خیال پیدا کریں کہ اب میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایسا بن گیا ہوں کہ علماء والا کام کر سکتا ہوں، یہ صلاحیت اللہ نے مجھ میں رکھ دی ہے، یہ بہت بڑا منصب ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدردانی عطا فرمائیں۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ: یا اللہ! تو نے ہم کو جو پڑھنے پڑھانے کی نعمت عطا فرمائی، اس سے محروم نہ فرما۔ یہ بات آپ کے حق میں تو پوری ہوئی کہ آپ نے اسی سال جامعہ بنوریہ سائٹ میں مشکوٰۃ شریف کا ختم کروایا، گھر تشریف لائے اور سو گئے اور اسی حالت میں انتقال ہو گیا۔

میں نے سارا سال آپ سے جو کچھ کہا ہے وہ اپنے لئے بھی ہے ”وَمَا أُبْرِيْ نَفْسِيْ“ البتہ جو کچھ کہا ہے وہ ”نصحتہ لکم وشفقتہ لکم“ کے تحت کہا ہے، خیر خواہی کے جذبے سے کہا ہے، اساتذہ سے محبت اور ادارہ سے تعلق ہو، یہاں اساتذہ سے ملاقات کے لئے آتے رہیں، ادارہ سے تعلق رکھیں، اس میں بہت فائدہ ہوگا، آپ جب عملی میدان میں قدم رکھیں گے تو آپ کو بہت سی باتیں معلوم ہوں گی، راقم الحروف ابو حازم مدنی کہتا ہے کہ آج یہی بات حضرت استاذ شہیدؒ پر صادق آتی ہے، آج ان کی جدائی سے رونا آتا ہے، ان کی باتیں یاد آتی ہیں، جانا تو سب نے ہے، مگر کچھ لے کر جائیں، تاکہ آگے کی زندگی میں مشکل نہ آئے۔

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)



شعریات و ادبیات

مولانا محمد سفیان بلند

فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن



حضرت الاستاذ مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کو رب تعالیٰ کی عطاؤں میں سے ایک اہم عطاء یہ بھی تھی کہ آپ کو شعری و ادبی ذوق کا وافر حصہ ملا تھا عربی، فارسی، اردو اور پشتو کے بھی بہت سے اشعار زبانی یاد تھے اور ان کو ہر موقع و محل استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، طلباء و علماء کی محفل میں آپ کے اشعار کے مخصوص انداز کو بہت سراہا جاتا، دوران تدریس بھی مختلف استنبہادات کے لیے مناسب اشعار کا ذخیرہ سیل رواں کی طرح جاری رہتا تھا، علماء و طلباء آپ کے اس ذوق شعری کے دل دادہ تھے، آپ کے اس مخصوص طرز بیان کی بدولت طلباء میں شعری و ادبی ذوق بیدار ہوا الحمد للہ راقم الحروف ابو حازم مدنی نے آپ سے سنے ہوئے کافی اشعار زبانی یاد کیے ہوئے ہیں اور اپنی کاپی میں محفوظ ہیں آپ کا بتلایا ہوا شعر آپ کے سامنے دہرایا جاتا یا بتلایا جاتا تو بہت خوش ہوتے، فرماتے تھے کہ طلباء میں اشعار کا ذوق نہیں رہا ورنہ پہلے زمانے میں طلباء کو ایک ایک ہزار اشعار از بر ہوتے بعض موقعوں پر آپ نے اشعار کی مقابلہ بازی بھی کروائی تاکہ طلباء میں اشعار کو یاد کرنے کا شوق اور جذبہ بیدار ہو یہاں آپ کے بیان فرمودہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جس کی چاشنی اور حلاوت آج بھی محسوس ہوتی ہے:

۱..... روضہ اقدس علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جالیوں پر ترکوں کے زمانے سے یہ شعر لکھا ہوا ہے:

فطاب من طيهن القاع والا کم

یا خیر من دفنت فی البقاع اعظم

فیہ العفاف و فیہ الجود والکرم

نفسی الفداء لقبر انت ساکنہ

ترجمہ: زمین میں جتنے بھی جسم مدفون ہیں اُن میں سب سے بہترین جن کے جسم کی پاکیزگی سے سرزمین اور ٹیلے بھی پاکیزہ ہو گئے، میرا نفس اس قبر پر قربان ہو جس میں آپ رہتے ہیں، اس میں تو عفو، درگزر اور سخاوت و کرم مدفون ہے۔

شعر مذکور راقم نے ۲۰۰۸ء میں سفر عمرہ کے موقع پہ روضہ رسول (ﷺ) پہ لکھا ہوا دیکھا تو وہاں سے آپ کو فون پر بتلایا کہ آپ کا یاد کروایا ہوا شعر آج یہاں دیکھ کر آپ کو دعائیں دیں اور سلام بھی پیش کیا تو بہت خوش ہوئے اور بندہ کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

۲..... مدینہ منورہ میں حاضری اور روضہ رسول (ﷺ) میں پیشی کے آداب کے پیش نظر حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا شعر ملحوظ رہے:

آہستہ قدم، نیچی نظر، پست صدا ہو

خواہیدہ یہاں رسول عربی ہیں

۳..... ایک اور شاعر کا شعر ہے:

اے دل سنبھل اب مت مچل

اے زائر درگاہ نبی جائے ادب ہے

تھم تھم کے چل آنکھوں کے بل

آئے نہ تیرے دل کے دھڑکنے کی صدا بھی

۴..... حضرت حسان بن ثابتؓ فرماتے ہیں:

فدو العرش محمود وهذا محمد

وشق له من اسمه لیجله

ترجمہ: (اللہ نے) اپنے نام سے اس ہستی کا نام اخذ کر لیا تاکہ اس کا اکرام ہو جائے، پس عرش والی ذات محمود اور یہ ہستی محمد (ﷺ) ہے۔

۵..... شاعر مثنوی کہتا ہے:

اتنکریا بن اسحاق اخائی وتحسب ماء غیری من انائی
ترجمہ: اے ابن اسحاق کیا تم میری اخوت کا انکار کرتے ہو، اور میرے علاوہ کسی اور کے پانی کو میرے برتن میں سے سمجھتے ہو؟
۶.... حضرت امام شافعیؒ غالباً حضرت امام ابوحنیفہؒ کی شان میں فرماتے ہیں:

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکره هو المسک ما کررتہ یتضرع
ترجمہ: نعمان (ابوحنیفہؒ) کا تذکرہ بار بار ہمارے سامنے کیجیے، کیونکہ ان کا تذکرہ مشک ہے جتنا زیادہ کرو گے اتنا زیادہ مہک ہوگی۔
۷.... شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ دیوان متنبیؒ کے ابتدائی شعر میں معمولی تغیر کے ساتھ فرماتے ہیں:
عذل العواذل حول قلبی التائه وابوحنیفۃ منہ فی سودائه
ترجمہ: ملامت کرنے والیوں کی ملامت میرے حیران دل کے ارد گرد ہے اور ابوحنیفہؒ کی محبت اس دل کے بالکل درمیان میں ہے۔
۸.... شاعر کہتا ہے:

اعدل تکن من صروف الدهر ممتنعا فالصرف ممتنع للعدل من عمر
ترجمہ: عدل کرو تو تم زمانے کے حوادث سے بچ جاؤ گے، اور عمر عدل ہی کی وجہ سے غیر منصرف رہا ہے (زمانے کے حوادث سے بچا رہا ہے)۔
۹....

الانبياء اسمائهم لاتنصرف وستة مستثنیات ماعترف
محمد نوح شعيب وصالح هود ولوط صرف هذا واضح
ترجمہ: حضرات انبیاء علیہم السلام کے نام غیر منصرف ہیں البتہ چھ نام اُن میں سے مستثنیٰ ہیں، محمد، نوح، شعيب، صالح، هود اور لوط ان ناموں کا منصرف ہونا واضح ہے۔

۱۰.... ایک شاعر نے اپنے دوست مالک نامی آدمی کی موت پر یہ شعر پڑھا جس کو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے بھائی حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کے انتقال پر ان کی قبر پر جا کر دہرایا:

وکناکند مانی جزیمۃ حقبة من الدهر حتی قیل لن یتصدعا
فلما تفرقنا کانی ومالکا لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معا
ترجمہ: زمانے کا ایک بہت بڑا عرصہ ہم جزیمہ کے دو ہم نشینوں کی طرح رہے یہاں تک کہ کہا گیا کہ یہ دونوں کبھی الگ نہ ہوں گے، پس جب ہم جدا ہوئے تو ایسا لگا کہ اتنی طویل رفاقت کے باوجود گویا ہم نے ایک رات بھی ساتھ نہیں گزاری (یعنی کچھ وقت بھی ساتھ نہ رہے)۔
۱۱.... حضرت فاطمہ الزہراءؓ نے اپنے والد گرامی حضور ﷺ کے وصال کے موقع پر یہ اشعار پڑھے:

صبت علی مصائب لو انها صبت علی الايام صرن لیالیا
ماذا علی من شم تربة احمد ان لایشم مدى الزمان غوالیا
ترجمہ: مجھ پر ایسے مصائب ٹوٹ پڑے کہ اگر وہ مصائب دنوں پر پڑتے تو وہ شدت تکلیف سے راتیں بن کر رہ جاتیں، جو شخص احمدؓ کی مٹی کو سونگھے گا تو اگر وہ زمانہ بھر کسی خوشبو کو نہ سونگھے تو کوئی پرواہ نہیں۔
۱۲.... حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

ولولا خشية الرحمن عندی جعلت الناس کلهم عبید
ولولا الشعراء بالعلماء یزری لکنت اليوم اشعر من لبید
ترجمہ: اگر مجھے رحمن کا ڈر نہ ہوتا تو لوگوں کو (شعر گوئی) سے میں غلام بنالیتا، اگر علماء کے ساتھ شعر و شاعری بری نہ لگتی تو میں لبید سے بھی بڑا شاعر ہوتا۔
۱۳.... کسی نے کہا ہے:

رویا جو بہت زور سے میرے لاشے سے لپٹ کر لوگوں سے سنا ہے کہ میرا قاتل بھی وہی ہے
دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف کچھ اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوئی

فاعلمی بعلمدی ولا تنظر الی عملی

ترجمہ: میرے علم پر عمل کر کے میرے عمل کو مت دیکھو، کیونکہ میرا علم تجھے نفع دے گا اور میری کوتاہی تجھے کچھ نقصان نہیں دے گی۔

۱۵.... باغبان کہتا ہے:

گرمی حسن سے پھولوں کو پسینہ آیا

باغبان کہتا ہے شبنم ہے مگر شبنم نہیں

۱۶....

لا تقنطوا جواب ہے ہل من مزید کا

دوزخ اگر وسیع ہے تو جنت وسیع تر

۱۷.... حضرت مولانا محمد موسیٰ خان روحانی بازی کی ڈائریوں میں اکثر یہ شعر لکھا ہوتا تھا:

اجل کا اسی لیے میں انتظار کرتا ہوں

سنائے کہ قبر میں دکھلاتے ہیں شبیہ نبی

۱۸.... ایک مسافر نے تھکن سے چور ہو کر یہ کہا:

دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے

۱۹.... ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے اشعار:

کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے مسحاب

پالتا ہے بچ کو مٹی کی تاریکی میں کون

خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نور آفتاب

کون لائے کھینچ کر پچھم سے باد سازگار

موسموں کو کس نے سکھائی ہے خوں انقلاب

کس نے بھردی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب

۲۰.... حضرت مولانا مفتی رضاء الحق مردانی صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

تم بھی خدا کے واسطے کہ دو نہیں نہیں

دو منفیوں کے ضرب سے بنتا ہے یار مثبت

۲۱.... ان تین اشعار میں جہالت کے تین مراتب مذکور ہیں:

واسپ خود از گنبد فیروز جہاند

آں کس کہ بدانند و بدانند کہ ندانند

اوں نیز خرے خویش بمنزل بہ رسانند

آں کس کہ بدانند و بدانند کہ ندانند

در جہل مرکب ابد و دہر بمانند

آں کس کہ ندانند و بدانند کہ ندانند

۲۲....

مجھ کو یہی حکم ہے انہیں آشاں کروں

صیاد نے بچائے ہیں قفس میں چند پھول

۲۳....

دل تو بس عادتاً دھڑکتا ہے

دل تو کب کا ہو گیا خاموش

۲۴....

میں مسجود ملائک ہوں مجھے انساں ہی رہنے دو

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری توہین ہوتی ہے

۲۵....

ورنہ طاعت کے لیے فرشتے کافی تھے رحمان کو

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

۲۶....

لگا جو زخم زبان سے، رہا ہمیشہ ہرا

چھری کا، تیر کا، تلوار کا زخم تو بھرا

۲۷....

کہ ناحق خون پروانہ کا ہوگا

شمع کو باغ میں جانے نہ دینا

۲۸....

مگر نماز ناحق میری قضاء نہ ہوئی

مانا کہ اپنے خون سے کرنا پڑا وضو

۲۹.... حضرت شہیدؒ کا پسندیدہ شعر:

مجھے جینا کبھی عزیز تھا، نہ بجا صحیح مگر اب نہیں

مجھے زندگی کی دعاء نہ دو، مجھے زندگی کی طلب نہیں

توارتخ وفات

حضرت مولانا ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی صاحب
(استاذ حدیث جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ لاہور،
وناظم ادارہ اشرف الجوٹ تحقیق الاسلامی لاہور)

(۱)	آج بروز جمعہ	علامہ مولانا الحاج	عطاء الرحمن	شہید ہو گئے
	۳۳۷	۳۱۷	۲۰۹	۳۷۰
	+	+	+	+
(۲)	بائے مولانا علامہ	عطاء الرحمن	استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن	
	۲۹۰	۲۰۹	۱۳۱۳	
	+	+	+	+
(۳)	بائے عطاء الرحمن	امام و خطیب جامع مسجد صالح	صدر کراچی	
	۲۲۵	۱۰۵۹	۵۲۸	
	+	+	+	+
(۴)	گل زیبا	ناظم تعلیمات		
	۷۰	۱۹۴۲		
	+	+	+	+
(۵)	گل زیبا	رکن امتحانی کمیٹی و وفاق المدارس		
	۷۰	۱۹۴۲		
	+	+	+	+
(۶)	فانما قال اللہ جل علمہ	و جزاهم بما صبرو جنة و حوریرا		
	۵۴۷	۸۸۶		
	+	+	+	+
(۷)	لقد قال اللہ جل وعدہ	ارجعی الی ربک راضیة		
	۴۴۹	۱۵۶۳		
	+	+	+	+
(۸)	لقد قال جل کلامہ	و الی ربک فارغب		
	۴۶۰	۱۵۵۲		
	+	+	+	+
(۹)	إنما قال جل أمرہ	لا یستوی أصحاب النار و أصحاب الجنة اصحاب الجنة هم الفائزون		
	۵۰۲	۱۵۱۰		
	+	+	+	+
(۱۰)	فانما قال اللہ جل کلامہ	من جاء بالحسنة فله عشر أمثالها		
	۴۹۸	۱۵۱۴		
	+	+	+	+
(۱۱)	قد قال اللہ جل کلامہ	فہو فی عیشة راضیة		
	۴۳۰	۱۵۸۲		
	+	+	+	+
(۱۲)	لقد قال اللہ جل کلامہ	حسننت مستقرا مقاما		
	۵۰۵	۱۵۰۷		
	+	+	+	+

(ما ہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ)



منظوم خراج عقیدت

پھر اجڑا ہے آشیانہ
محمد یاسر سلطان

دردِ دل کی داستاں

مولانا محمد عیاض عابد
فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن

کیا کہوں کس کو سناؤں دردِ دل کی داستاں	میرے محسن دے گئے ہیں داغِ فرقت ناگہاں	عطاء رب نے کیے تھے تجھ کو اخلاق کریمانہ	ترا انداز بھی یکتا تھا تری گفتار شہانہ
جب سنی اہل تعلق نے شہادت کی خبر	ہو گئے آنکھوں سے سب کے اشک ہائے خوں رواں	وہ ہوتے جب بھی اہل علم اور طلباء کی مجلس میں	شمع لگتے تھے اور ہر ایک اس شمع کا پروانہ
یاد کرتا ہے تجھے تو آج بھی دارالحدیث	وہ عبارت کی صدائیں پھر سے گونجیں گی کہاں	کبھی مسندِ نظامت پر کبھی مسندِ حدیث پر جلوہ گر	مجالس میں تری شرکت منفرد اور قائدانہ
جامعہ بھی تیرے غم میں ہے سراپا مضطرب	مادرِ علمی کا تھا ہر وقت گویا پاسباں	واہ اثناءِ درس اشعار کا فی البدیہہ پڑھتے جانا	قرائتِ حدیث میں تیرا انداز و افکار مجاہدانہ
صاحبِ عالی بصیرت علم و عرفاں کا بحر	طالبانِ علم پر بے حد شفیق و مہرباں	علامت تھی نبی سے عشق کی یہ والہانہ	فضاء میں گونجتا تھا ہر سو عظمت کا ترانہ
زندگی علم و عمل کی تھی حسینِ اک امتزاج	ہو گیا اللہ کے دربار میں ہے کامراں	مسائل میں الجھ کر خوب تحقیق سے سلجھانا	خدا نے حظ وافر ان کو دیا تھا علم عارفانہ
آپ کو فنِ خطابت میں بھی حاصل تھا کمال	عربی و اردو ادب میں ایک بحر بے کراں	سوالِ حدیث کا ہوتا یا ہوتا علمِ آلی	کا تھا اسلوبِ جواب ان کا حکیمانہ لطیفانہ
شخصیت تھی بطنِ فی العلم والجسم آپ کی	آپ کی رحلت پہ روئے ہیں زمین و آسماں	کیا جامِ شہادت نوش جب تم نے فضاؤں میں	تھے گویا خود نبی ساقی اور تھا کوثر کا میخانہ
تیری قربانی یقیناً رنگ لائے گی کبھی	کیا یہ ممکن ہے کہ ہو خونِ شہیدانِ رائگاں	اچانک یوں ترا ہم سے جدا ہو کر پھچک جانا	ہوئے ہیں ابدیدہ ہم، ہوا سوگ وار زمانہ
ان شاء اللہ! صبر کا دامن نہیں چھوڑیں گے ہم	اہل حق دکھ درد میں کرتے نہیں آہ و فغاں	قلق تو دل میں ہے سب کے مگر اسکندر کے غم میں	کرے اُن کا مداوا کون؟ کہ پھر اجڑا ہے آشیانہ
کون گن سکتا ہے تیری خصلتیں اشعار میں	بس سرِ تسلیم خم کرتی ہے عابد کی زباں	رسول اللہؐ کا دے قرب یارب! اُن کو جنت میں	دعاء کرتا ہے سلطان یہ قبول ہو عرض فقیرانہ

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نمبر)

گلشن بنوری کے اک اور جانباز

مولوی سیدالابرار سعید چترالی

متعلم درجہ سادہ، جامعہ بنوری ٹاؤن

کیسے بھولیں اے عطاء!

مولانا رزین شاہ صاحب

استاذ حدیث مدرسہ تعلیم الاسلام گلشن عمر شاخ جامعہ بنوری ٹاؤن

یاد کرتے ہیں سدا احباب مے خانہ تجھے	مدتوں رویا کریں گے جام و پیانہ تجھے	اس گلشن بنوری کے اک اور جانباز چلے ہیں آج	میرے محسن میرے مشفق میرے استاذ چلے ہیں آج
تم اچانک کس سفر پر ہم سے رخصت ہو گئے	منتظر ہیں سوچتے ہیں ہے یہاں آنا تجھے	کبھی جو ساتھ ہوتے تھے سفر میں بھی حضر میں بھی	میرے حضرت اسکندر کے وہی ہمراز چلے ہیں آج
وہ تبسم وہ علم کی چاشنی محبوبیت	دے دیے تھے رب نے کیا اوصاف جانانہ تجھے	چمن کے گوشے گوشے میں قد کش کی باتیں ہیں	اہل گلشن کی نظر میں جو تھے ممتاز چلے ہیں آج
زینتِ محفل لکھوں یا زینتِ اہل چمن	یا لکھوں بلبل تجھے یا دیں کا پروانہ تجھے	انہیں کا نام بھی ہوگا یقیناً اہل جنت میں	وہ دنیا سے شہادت کا لئے اعزاز چلے ہیں آج
جامعہ شاخص تری فرقت میں ہیں سب سوگوار	پیش کرتے ہیں سب ہی اشکوں کا نذرانہ تجھے	جہاں تشریف رکھتے تھے وہ مسند آج خالی ہے	وہی مفتی نظام الدین وہی انداز چلے ہیں آج
صاحبِ اخلاق تھا علم و ادب کا شہسوار	رب اکرم نے دیئے خلق کریمانہ تجھے	جہاں کو رشک آتا ہے ایسی تھی زندگی ان کی	کیا تھا جس نے الفت کا عجب آغاز چلے ہیں آج
دے تسلی کیسے دل کو تری فرقت میں رزین	کیسے بھولے اے عطاء! یہ قلب دیوانہ تجھے	جب ان کی یاد آتی ہے سینے میں دل دھڑکتا ہے	سعید ہر دم اسی پر تھا جو تم کو ناز چلے ہیں آج

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نمبر)

ایسے رخصت ہو گئے دنیا سے مولانا عطاءؒ

قیمتی انسان

مولانا محمد ہمایوں مغل حسن

غلام اللہ چوہان، کراچی

نائب مدیر ماہنامہ الاحسن کراچی

ایسے رخصت ہو گئے دنیا سے مولانا عطا	باغ دل سے جیسے کوئی ہو جائے دھڑکن جدا	یہ حادثہ جس نے کر دیئے جدا پیارے اور قیمتی انسان	ان میں شامل ہیں خطیب وامام اور محترم استاد عطاء الرحمن
انجمن آرائے بنوری ٹاؤن سنسان کر گئے	با حیا تھے با وفا تھے، وہ بہت ہی با صفا	یہ نقصان ہر اس دین حق کے علم کے شیدائی کا ہے بلاشبہ	مگر جس کے حکم سے ہوا ہے وہ ہے واحد رب رحمان
ہم نواؤں میں وہ عالی مرتبت انسان تھا	مفتی صاحب ☆ سے بھی ان کا تعلق کچھ خاص تھا	عقیدہ ہمارا ہے یہی کہ ہر نفس کے لیے موت کی آمد برحق	صبر ہمارا اثاثہ ہے عاجزی ہتھیار اور بندگی کی شان
پیش کرتا ہے عقیدت کا سلام احسن علوم	ایک عظیم انسان سوئے آخرت ہے پھر چلا	بخش دے مرحومین حادثہ کو عطاء کر مغفرت کا انعام	آپ ہی مالک و خالق ہیں ہمارے اور حمد ہے عالی شان
اے حسن تو دے دعا اس معتبر انسان کو	جنت الفردوس میں مل جائے ان کو مرتبہ		

☆ شیخ الحدیث والفقیر حضرت مولانا مفتی محمد زرولی خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ

مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ

علم کا مہتاب

مولانا رضوان احمد جاذب

شاعر: مولانا محمد اسامہ سرسری، انتخاب: مولوی نعمان عبدالقادر معلم درجہ رابعہ جامعہ بنوری ٹاؤن

وہ علم و فضل کا دریا تھا، رحمت کا خزانہ تھا	اچانک چل بسے گا وہ، تصویر میں ذرا نہ تھا	ڈھونڈتی ہے شام غم اُس علم کے مہتاب کو	یاد کرتا ہے چمن اس غنچے سیراب کو
جدائی کس کو کہتے ہیں ہمیں گویا پتا نہ تھا	کہ جو محبوب تھا وہ اب تلک ہم سے جدا نہ تھا	رواق محفل بھی اور جانِ اہل دل بھی تھا	اس لیے آتا رہے گا یاد سب احباب کو
خدا کو پاس بلوانا تھا، احمدؒ سے ملانا تھا	جہازی حادثہ تو بس دکھاوا اور بہانہ تھا	اب تلک کانوں میں جس کے زمزموں کی گونج ہے	ڈھونڈتی ہے ہر نظر اُس بلبل شاداب کو
تھی بیوی، چار بیٹے، آٹھ تھے یکل بہن بھائی	ابھی تک سایہ بھی ماں باپ کا تھا، گھر سہانا تھا	شخصیت میں رعب تھا اور دل میں شفقت کا ڈھنی	اپنے بچوں کی طرح پیار تھا سب طلب کو
بے چارے منتظر ہیں مسجد صالح صدر والے	جہاں ہر جمعے حضرت کو خطابت کرنے جانا تھا	کل تلک روشن تھیں آنکھیں جس کی جھلمل سے تمام	کیسے کہہ دیں کھو چکے ہم اُس گوہر نایاب کو
پڑھاتے تھے ہمیں مرحوم جب پیارے سے لہجے میں	یقین جانو، بڑا پر کیف و پر لذت زمانہ تھا	فکر عالی تھی تری اور ذہن تعمیری تھا	تیری فرقت کر گئی حیراں اولو الالباب و
شجر چالیس روزہ تربیت کا لہلہائے ہے	زہے قسمت! کہ یہ پودا بھی حضرت کو لگانا تھا	تو سرا پایا دگارِ بزرگانِ دین تھا	خون رُلاتی ہے کہی تیری ترے اصحاب کو
عطاءؒ رحمن کی ہم پر سحر تا شام ہوتی تھی	پر اب لگتا ہے وہ حسنِ نظامت کا فسانہ تھا	نظر ٹوکنی نے صحبت نے حبیب اللہ کی	تجھ کو پرکھا اور نکھارا ترے آداب کو
طبیعت میں نفاست تھی، ذہانت تھی، شجاعت تھی	صفات ایسی تھیں حضرت میں، ہر اک اُن کا دیوانہ تھا	تو رفیقِ احمد الرحمن تھا اُن سے جا ملا	یوں مقدر نے بنایا بحر جوئے آب کو
بہت مخلص رہے دس سال کے دورِ نظامت میں	کبھی کچھ نفع اس منصب سے حضرت نے لیا نہ تھا	تھا مُشاوِر عبد الرزاق و سفر میں ہمرکاب	کون رو کے ان کی آنکھوں سے رواں خونا کو
مسلل چور صدموں سے ہیں حضرت ڈاکٹر صاحب	ابھی تو مندل اک زخم بھی پچھلا ہوا نہ تھا	جامعہ بنوری ٹاؤن تجھ پہ نازاں کیوں نہ ہو	تو نے تعبیری نشان بخشا ہے اس کے خواب کو
شہادت پر شہادت جامعہ میں ہو رہی یتیم	مقدر میں ہی بحرِ اشک ہم سب کا بہانا تھا	مثل اپنے نام کے تو تھا عطاءؒ رحمن کی	تجھ پہ سجنے کے لئے ہے بے کلی القاب کو
نہ روکو ہم کو رونے سے کہ روئے مصطفیٰ بھی ہیں	عزیز از جان چچا کے ہجر پر رونا تو آنا تھا	انجمن سے دفعۃً اوجھل ہوا کچھ اس طرح	انتظار اب بھی تیرا علم کے ارباب کو
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ ہو گئے صابر	جب ان سے چل بسا حسینؓ کا پیارا جونا نا تھا	سایہ رحم خدا ہو خُلد میں تیرا ماکاں	اڑ کے پائے تو عطاءؒ اُس منزلِ بیتاب کو
ہمیں بھی ایک دن جانا ہے، کر لیں اس کی تیاری	جنہیں اب یاد کرتے ہیں انہیں جانا ہی جانا تھا	دعویٰ جاذب ہے بھولیں گے نہ شیدائی ترے	قابلِ تقلید تیری زندگی کے باب کو
نعمان ابنِ قادر نے جو دیکھے جامعہ والے	ہر اک کے ہونٹ پر مرحوم کا غمگیں ترانہ تھا		
انہی کی یاد میں لکھتا ہوں اپنی نظم کا مقطع	پسندیدہ انہیں بھی نظم کا سننا سنانا تھا		

مردِ حُر اک شیخ مولانا عطاء الرحمن گیا

مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی
استاذِ حدیث جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

مردِ حُر اک شیخ مولانا عطاء الرحمن گیا
گل بداماں اس جہاں سے آہ وہ ذیشاں گیا
ایک ہی بس جست میں وہ جنت رضواں گیا
اک طیب درِ دل اور اک مسیح جاں گیا
فقر و درویشی میں مثل بوڑّ و سلماں گیا
ہر کوئی کہتا ہے وہ محبوب وہ جاناں گیا
آسمانِ علم کا وہ نیرِ تاباں گیا
ایک فریقِ باوفا بھی ساتھ وہ ”عرفاں“ گیا
حاملِ علمِ نبوت عاملِ قرآن گیا
وقفِ ماتم بزمِ علمی وہ شہِ خواں گیا
گلشنِ علمی سے فاتیٰ خلد کا مہاں گیا

محفلِ قدسی سے اللہ کیا عظیم انساں گیا
حضرت ٹوکنیؒ کے تھے واہ تلمیذِ رشید
تھا بلند پرواز کتنا صاحبِ بخت و نصیب
قابلِ صد رشک ایسا جامعِ الاوصاف تھا
انکساری و تواضع کی تھے اک کامل تصویر
کس ادائے ناز سے رخصت ہوا وہ ہم سے آج
جامعہ بنوری ٹاؤن کے تھے فردِ معتبر
اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ عالم بالا چلا
خدمتِ دینِ متین میں صرف کی عمرِ عزیز
بذلہ سخی، نکتہ بینی جن کی فطرت میں رہی
لکھ رہا ہوں مرثیہ باچشمِ نمِ خوابِ دل

قلبِ حزیں

مولانا مفتی محمد خالد عباسی

نائب مہتمم مدرسہ عربیہ شہزادہ گارڈن

حضرت استادِ جی کی زندگی اور حیاتِ مستعار پر اہل علم، اساتذہ عظام، مخلص ساتھیوں اور طالب علموں نے بہت کچھ کہا اور بعض نے لکھا بھی، لیکن بندہ عاجز استادِ جی کی زندگی کے جس پہلو پر کچھ کہنا چاہتا ہے وہ آپ کا ادیبانہ اور شاعرانہ ذوقِ رفیع ہے، دوسری کئی صفات اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کی ذات میں اس ذوق کو خوب ودیعت رکھا تھا چنانچہ موقعِ محل کے اعتبار سے فوراً اور برجستہ ایسے اشعار پڑھتے کہ باذوق ساتھی دنگ رہ جاتے اور پھر کمال یہ ہے کہ وزن، قافیہ اور لب و لہجہ کی بھرپور رعایت۔

حضرت کے اس مبارک ذوق کی برکت تھی کہ جب یہ حادثہ رونما ہوا تو بندہ کے ذہن میں بھی کچھ نہ کچھ وارد ہوا اب جو اشعار بندہ پیش کر رہا ہے یہ ہر قسم کے شاعرانہ ذوق و اسلوب، وزن اور الفاظ کی چاشنی سے خالی ہوں گے لیکن بندہ عاجز امانت سمجھ کر نقل کر رہا ہے:

حضرت شہیدؒ کی شہادت کی اطلاع آئی تو دل سے آواز آئی:

جو وہ چلے گئے ہیں تو سب کچھ اجڑ گیا ہے

قلبِ حزیں کو کیسے کہوں شیخ کے سفر کا

اپنے طالب علمی کے زمانے کو سوچا تو آواز آئی:

آج ان کو سوچتا ہوں تو سب کچھ رلا رہا ہے

جو کچھ ملا عطاء کی محبت سے، عنایت سے

آپ کی مسند یاد آئی تو آواز آئی:

پر مسکراہٹِ خلد بریں کو کیا سمجھوں

مانا کہ مسند تدریس رو رہی ہے بہت

جب آپ کی خوبیوں کو سوچا تو آواز آئی:

ہمارے شیخ کا چرچا زمانہ بھر پہ غالب ہے

وفاؤں کی کہانی جب عیاں ہوگی زمانے پر

آپ کے سراپے اور خوبصورتِ اداؤں کو سوچا تو آواز آئی:

جہاں سے جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے
جب آپ کی ہمارے ادارہ مدرسہ عربیہ میں آمد کو یاد کیا تو آواز آئی:
یاد آئی ہے تیری آمد مسعود یہاں
جب آپ کے عظیم صدقہ جاریہ تعلیم و تربیت کورس کی مجلس یاد آئیں تو آواز آئی:
تعلیم و تربیت کا وہ تابندہ نشان تھا
اس سال جو آئیں گی یہ عطیات دوبارہ
پھر سوچا کہ اب جامعہ جائیں گے اور آپ کو نہیں پائیں گے تو آواز آئی:
میں جامعہ میں پہنچا دیوار و در کو دیکھا
بولے ضرور تھا وہ، لیکن نہیں رہا وہ
آپ کے پڑھانے اور سمجھانے کا دل فریب انداز سامنے آیا تو آواز آئی:
آواز میں، الفاظ میں، انداز میں، صورت میں
وہ اب کہاں سے آئے کہ ہم اسکو دیکھ آئیں

مگر جو جا کہ بھی دل سے نہ ہٹے واہ خدا
کیسے بھولیں تجھے ازہار و بستان خطیب
اس کورس کی محنت کا وہ اک زندہ بیاں تھا
سب بول اٹھیں گے کہ وہ اک زندہ زباں تھا

پوچھا یہاں عطاء تھا، اک صاحب وفاء تھا
ہم سب بھی ڈھونڈتے ہیں، اس شان دلربا کو
کچھ ایسا حسیں تھا وہ، کچھ مسک زکی تھا وہ
کچھ ایسا زریں تھا وہ، کچھ خندہ جبین تھا وہ

اخبارات و مجلات کی نظر میں

اخبارات و مجلات کی نظر میں

ترتیب: محمد زین العابدین



روزنامہ جنگ کراچی:

نجی ایئر لائن کے حادثے میں جمعہ کو جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات، استاذ الحدیث، جامع مسجد صالح جہانگیر پارک کے امام و خطیب، معروف عالم دین مولانا عطاء الرحمن بھی شہید ہو گئے۔ وہ اپنی ہمیشہ کے ہمراہ اپنے آبائی گاؤں مردان جا رہے تھے حادثے میں اُن کی ہمیشہ نے بھی جامِ شہادت نوش کیا مولانا عطاء الرحمن نے اپنی دینی تعلیم جامعہ بنوری ٹاؤن ہی سے حاصل کی وہ ۱۹۸۳ء میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد درس و تدریس سے منسلک ہو گئے اور گزشتہ ۲۶ برس سے جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات کے عہدے پر کام کرتے رہے وہ جامعہ بنوری ٹاؤن کے عالم دین مولانا امداد اللہ کے قریبی عزیز تھے، جے یو آئی کراچی کے امیر قاری محمد عثمان، مولانا غیاث، مولانا حماد اللہ شاہ، مفتی ابو ہریرہ، مفتی ابوزر اور مولانا امداد اللہ نے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اسے عظیم سانحہ قرار دیا ہے، استاذ الحدیث مولانا عطاء الرحمن کے ہمراہ جامعہ بنوری ٹاؤن کے فارغ التحصیل مولانا عرفان بھی تھے جو حادثے میں شہید ہو گئے۔ مولانا عطاء الرحمن نے لواحقین میں ایک بیوہ، اور چار بیٹوں کو سوگ وار چھوڑا ہے اُن کی شہادت کی خبر سنتے ہی جامعہ بنوری ٹاؤن میں طلباء دھاڑیں مار مار کر روتے رہے عشاء کی نماز میں اساتذہ اور طلباء نے شہید ہو جانے والوں کے لیے مغفرت کی دعا کی، درس اثناء جے یو آئی کے مرکزی امیر مولانا فضل الرحمن اور جنرل سیکریٹری سینئر مولانا عبدالغفور حیدری نے مولانا عطاء الرحمن کے چچا زاد بھائی اور جامعہ بنوری ٹاؤن کے استاذ الحدیث مولانا امداد اللہ سے فون پر تعزیت کرتے ہوئے رنج و غم کا اظہار کیا۔

(روزنامہ جنگ کراچی ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء بمطابق ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ)

روزنامہ امت کراچی:

جمعہ کا شام بھی حالِ اُترن کے طہار کے حادثے میں معروف عالم دین مولانا عطاء الرحمن، اور اُن کی ہمیشہ بھی شہید ہو گئے۔ مولانا عطاء الرحمن جامعہ

بنوری ٹاؤن میں ناظم تعلیمات تھے انہوں نے ۱۹۷۸ء میں جامعہ بنوری ٹاؤن سے وابستگی اختیار کی ۴ بیٹوں اور اہلیہ کے ساتھ مدرسے ہی میں رہائش پذیر تھے، جامعہ بنوری ٹاؤن کے مولانا محمد اسماعیل نے امت کو بتایا کہ مولانا عطاء الرحمن اس نجی ایئر لائن کے ذریعے اپنی ہمیشہ کو مردان چھوڑنے جا رہے تھے اور واپسی پر انھیں ملتان میں وفاق المدارس کے اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ اگست ۱۹۶۰ء کو وہ پیدا ہوئے انھوں نے ابتدائی تعلیم بھی بنوری ٹاؤن سے حاصل کی یہیں سے عالم و فاضل کی ڈگریاں حاصل کیں اور بطور استاذ اپنے فرائض انجام دینا شروع کیے وہ جہانگیر پارک کے قریب واقع جامع مسجد صالح کے امام و خطیب بھی تھے اُن کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور زیادہ تر آسٹریلیا، ساؤتھ افریقا، آئیر لینڈ اور ملائیشیا میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں انھوں نے سوگواران میں ۴ بیٹے مسیح الرحمن، فصیح الرحمن، جمیل الرحمن، ملیح الرحمن اور ایک بیوہ چھوٹی ہے۔ ان کی نماز جنازہ مردان میں ادا کی جائے گی جس میں جامعہ بنوری ٹاؤن کے ذمہ داران بھی شرکت کریں گے ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد نے مردان جانے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں ان کی شہادت کی اطلاع کے بعد مقامی علماء کرام کی ایک بڑی تعداد جامعہ بنوری ٹاؤن پہنچ گئی۔

(روزنامہ امت کراچی، ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء، بوطابق ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ)

روزنامہ اسلام کراچی:

طیارہ حادثے میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات اور استاذ الحدیث مولانا عطاء الرحمن اور اُن کے عزیز واقارب بھی شہید ہو گئے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سربراہ شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان، جمعیت العلمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمن، جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے مہتمم شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، جامعہ بنوریہ عالمیہ کے مہتمم شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد نعیم اور دیگر علماء، سماجی و سیاسی رہنماؤں نے مولانا عطاء الرحمن کی شہادت کو قومی سانحہ قرار دیتے ہوئے لواحقین اور متعلقین سے اظہارِ تعزیت کیا۔

بھوجا ایئر لائن کے طیارے میں سفر کرنے والوں میں مولانا عطاء الرحمن، اُن کی ہمیشہ اور معاون خاص مولانا عرفان میمن بھی سوار تھے جو حادثے میں شہید ہو گئے، ۵۳ سالہ مولانا عطاء الرحمن ضلع مردان کے علاقے بابوزئی میں پیدا ہوئے انہوں نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم شیرگڑھ مردان میں حاصل کی اس کے ساتھ میٹرک کرنے کے بعد جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں داخل ہوئے اور ۱۹۸۳ء میں فراغت حاصل کی ۱۹۸۵ء میں تخصص فی الافاء کے بعد جامعہ میں ہی استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینا شروع کیں گزشتہ ۱۰ سال سے وہ جامعہ کے ناظم تعلیمات تھے اُن کا شمار جامعہ کے سینئر ترین اساتذہ میں ہوتا تھا۔ مولانا عطاء الرحمن اپنے مخصوص تدریسی انداز کے باعث شاگردوں میں بے حد مقبول تھے وہ حدیث، فقہ، صرف و نحو اور عربی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے بھی خصوصی شغف رکھتے تھے اُن کو ہزاروں عربی اور اردو اشعار از بر تھے جن کا دوران گفتگو بر موقع اور برجستہ استعمال ان کا امتیازی وصف شمار کیا جاتا تھا وہ ایک عرصے سے دورہ حدیث کے نصاب میں شامل بخاری شریف اور مسلم شریف کے استاد تھے مسلم شریف کے درس کے دوران عبارت خوانی کا اُن کا مخصوص مترنم اور پر جوش لہجہ ان کے شاگردوں میں بے حد مقبول تھا وہ عشق رسول ﷺ کے جذبے سے سرشار تھے جس کا اظہار بطور خاص مسلم شریف میں مروی طویل قصیدہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی عبارت خوانی کے دوران سینکڑوں طلباء کے اجتماع پر عجیب روحانی کیفیت طاری کر دیتا تھا اُن کی حدیث کی عبارت خوانی الگ سی ڈیز اور کلپس میں بھی دستیاب ہے۔ مولانا عطاء الرحمن جہانگیر پارک صدر کراچی کی جامع مسجد صالح کے امام و خطیب اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نصاب کمیٹی کے رکن بھی تھے انہوں نے عصری تعلیمی اداروں کے طلباء کی تعلیم و تربیت کے لیے ۴۰ روزہ کورس کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا جس کو عالمی سطح پر سراہا گیا مولانا نے دنیا بھر کے مختلف ممالک کے کئی اسفار بھی کیے اُن کے دنیا بھر میں ہزاروں شاگرد اور لاکھوں عقیدت مند موجود ہیں مولانا نے سوگواروں میں بیوہ ۴ بیٹے، ہزاروں شاگرد اور لاکھوں عقیدت مند چھوڑے ہیں۔

آخری ہوائی سفر میں اُن کے ہمراہ اُن کی ہمیشہ بھی تھیں جب کہ اُن کے معاون خاص ۲۸ سالہ مولانا عرفان میمن ولد عبدالحمید میمن بھی شہید ہونے والوں میں شامل ہیں مولانا عرفان میمن نے ابتدائی تعلیم جامعہ فتحیہ گارڈن سے حاصل کی اور بعد ازاں جامعہ بنوری ٹاؤن میں دینی تعلیم حاصل کی انہوں نے سوگواروں میں بیوہ ۲ بیٹے جن میں ایک کی عمر ۳ سال اور دوسرے کی ۵ سال ہے، کے علاوہ دیگر عزیز واقارب کو چھوڑا ہے۔

مولانا عطاء الرحمن کی شہادت کی اطلاع ملتے ہی درجنوں علماء کرام سینکڑوں طلباء اور اُن کے چاہنے والے بڑی تعداد میں جامعہ بنوری ٹاؤن پہنچ گئے رات گئے تک بنوری ٹاؤن میں ہر طرف سوگ کا عالم تھا دارالحدیث میں جامعہ کے مہتمم مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، نائب مہتمم مولانا سید سلیمان بنوری، نائب ناظم مولانا امداد اللہ (جو کہ مولانا عطاء الرحمن کے قریبی عزیز بھی ہیں) استاذ حدیث مولانا محمد انور بدخشانی، مولانا محمد زبیر منجور، مولانا فضل محمد یوسف زئی، مولانا مفتی عبدالرؤف خان غزنوی، صاحبزادہ مولانا مفتی فصیح الرحمن کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ اور طلباء کی بڑی تعداد جمع تھی واقعے کی اطلاع ملتے ہی ہزاروں شاگرد اور لاکھوں عقیدت مند چھوڑے ہیں۔

ز رولی خان، جامعہ بنوریہ عالمیہ کے مہتمم مولانا مفتی محمد نعیم، مولانا عزیز الرحمن رحمانی، اقرار ووضۃ الاطفال کے نائب مہتمم مولانا مفتی خالد محمود، مدرسہ امام محمد کے مہتمم مولانا قاری فیض اللہ چترالی اور دیگر علماء کی بڑی تعداد جمع ہو گئی علماء کا اجتماع رات گئے تک جاری رہا، جامعہ سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق جمعیت علمائے اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمن سمیت دیگر قائدین و علماء نے جامعہ کے مہتمم و اساتذہ سے تعزیت کی مولانا عطاء الرحمن اور دیگر رفقاء کے جسدِ خاکی کو وصول کرنے کے لیے جامعہ کے استاذ الحدیث مولانا امداد اللہ، مولانا مفتی محمد عاصم زکی و دیگر کی روانگی رات گئے اور آج صبح ہفتہ کو متوقع ہے اطلاعات کے مطابق مولانا عطاء الرحمن، اُن کی ہمیشہ اور مولانا عرفان میمن کی تدفین مردان بابوزئی میں ہوگی۔

مولانا عطاء الرحمن کی شہادت پر وفاق المدارس کے صدر مولانا سلیم اللہ خان، جمعیت العلمائے اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمن، جماعت اسلامی کے امیر سید منور حسن، جماعت الدعوة کے امیر پروفیسر حافظ محمد سعید، دفاع پاکستان کونسل کے سربراہ مولانا سمیع الحق، اہل سنت والجماعت پاکستان کے امیر مولانا محمد احمد لدھیانوی، اہل سنت والجماعت گلگت بلتستان کے امیر مولانا قاضی ثناء احمد، جامعہ بنوریہ عالمیہ کے مہتمم مولانا مفتی محمد نعیم اور دیگر نے لواحقین سے تعزیت کرتے ہوئے دعائے مغفرت کی اور کہا کہ ہم لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں اس قومی سانحہ پر پوری قوم لواحقین کے غم میں برابر کی شریک ہے۔

(روزنامہ اسلام کراچی، ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء، بمطابق ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ)

روزنامہ اسلام کراچی:

طیارہ حادثہ میں شہید ہونے والے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن کی نماز جنازہ ہفتہ کو صبح اسلام آباد میں جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمن اور شام کو مولانا امداد اللہ کے قائم کردہ جامعہ خلفائے راشدین بابوزئی میں شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ کی اقتداء میں ادا کی گئی، دونوں مقامات پر نماز جنازہ میں ہزاروں افراد نے شرکت کی، مولانا عطاء الرحمن کے اہل خانہ کراچی میں موجود تھے جو ہفتہ کی صبح شہید کے جسدِ خاکی کی وصولی کے لیے اسلام آباد پہنچے، اسلام آباد میں نماز جنازہ کے بعد جسدِ خاکی کو تدفین کے لیے اُن کے آبائی علاقے بابوزئی ضلع مردان پہنچایا گیا، جب کہ مولانا عرفان میمن کا جسدِ خاکی بھی تدفین کے لیے شام کو مردان بابوزئی پہنچایا گیا بعد ازاں اُن کی ہمیشہ کا جسدِ خاکی بھی بابوزئی پہنچایا گیا تینوں کی تدفین بابوزئی میں ہوئی مولانا عطاء الرحمن کے خادم خاص اور شاگرد مولانا عرفان میمن کا تعلق ناظم آباد کراچی سے تھا، تاہم مولانا عطاء الرحمن سے اُن کی عقیدت کی وجہ سے مولانا عرفان میمن کے اہل خانہ نے مولانا عطاء الرحمن کے پہلو میں ضلع مردان بابوزئی میں ان کی تدفین کی اجازت دے دی۔ مولانا عرفان میمن کے بھائی میت وصول کرنے کے بعد شام کو بابوزئی پہنچے جس کے بعد نماز جنازہ اور تدفین ہوئی، ۲۸ رسالہ مولانا عرفان میمن نے عالم فاضل کا کورس کرنے کے بعد مولانا عطاء الرحمن کے ساتھ دینی کاموں کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا تھا مولانا عرفان میمن نے لواحقین میں بیوہ کے علاوہ ۳ چھوٹے بچے چھوڑے، جن میں سے ایک کی عمر ۳ سال اور دوسرے کی ۵ سال بتائی جاتی ہے، دریں اثناء مولانا عطاء الرحمن اُن کی ہمیشہ اور مفتی عرفان حمید میمن کی تعزیت کے حوالے سے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں تعزیت کا سلسلہ ہفتہ کو بھی جاری رہا۔

(روزنامہ اسلام ۲۲ اپریل ۲۰۱۲ء بمطابق ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ)

روزنامہ جرأت کراچی:

جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن سمیت ۴ علماء بھی جاں بحق ہو گئے، جاں بحق افراد کے لواحقین کراچی ایئر پورٹ پہنچ گئے، رقت آمیز مناظر۔

تفصیلات کے مطابق بھوجا ایئر لائن کے حادثے میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن کے ہمراہ مولانا عرفان بھی طیارہ میں سوار تھے وہ بھی اسلام آباد کے قریب پیش آنے والے حادثہ میں جاں بحق ہونے والوں میں شامل ہیں۔ طیارہ کے حادثہ کی اطلاع کے فوری بعد بد قسمت طیارہ سے سفر کرنے والے مولانا عطاء الرحمن اور مولانا عرفان کے لواحقین کراچی ایئر پورٹ پہنچ گئے اور اپنے پیاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے اس موقع پر ایئر پورٹ پر انتہائی رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ مولانا عطاء الرحمن کے لواحقین و دیگر افراد زار و قطار رو رہے تھے جن کو ان کے عزیز واقارب دلا سے دے رہے تھے، ایئر پورٹ پر ہنگامی صورتحال پیدا ہو گئی تھی دیگر طیاروں سے جانے والے ہزاروں افراد کی موجودگی سے بھی صورتحال قابو سے باہر نظر آتی رہی ایئر پورٹ پر بد نظمی کی کیفیت کو انتظامیہ قابو کرنے میں ناکام تھی، کراچی ایئر پورٹ پر جمعہ کی رات شدید افراد تفری کا عالم رہا، مرحومین کے لواحقین شدید اشتعال میں نظر آ رہے تھے، بعض افراد نے موقع پر موجود بھوجا ایئر لائن کے عملے کو انتہائی سخت کلامی کے ساتھ ساتھ گالم گلوچ

(روزنامہ جرأت کراچی ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء بمطابق ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ)

روزنامہ جناح اسلام آباد:

طیارہ حادثہ میں جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن بھی شہید ہوئے۔ بھوجا ایئر لائن کے حادثے میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن سمیت چار علماء بھی شہید ہو گئے، مختلف ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن کے ہمراہ اُن کے خادم خاص مولانا عرفان بھی طیارے میں سوار تھے اور مذکورہ دونوں علماء بھی شہید ہونے والوں میں شامل ہیں اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی شہر کے مختلف علاقوں سے علماء اور طلباء کی ایک بڑی تعداد جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن پہنچ گئی۔

(روزنامہ جناح اسلام آباد ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء، بمطابق ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ)

روزنامہ نوائے وقت لاہور:

بھوجا ایئر لائن کے بدقسمت حادثے کے شکار طیارے میں ۲ علماء کرام مولانا عطاء الرحمن، مولانا عرفان اور مقدم الذکر کی ہمشیرہ بھی سوار تھیں، جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن کراچی سے اپنے گھر مردان جا رہے تھے، مذکورہ تینوں افراد بھی بھوجا ایئر لائن کے طیارہ حادثہ میں شہید ہو گئے۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء، بمطابق ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ)

روزنامہ ایکسپریس لاہور:

کراچی کا معروف دینی ادارہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ناظم تعلیمات، استاذ الحدیث مولانا عطاء الرحمن بھی بھوجا ایئر لائن کی پرواز کے ذریعے اسلام آباد جانے کے لیے سوار ہوئے تھے وہ بھی بھوجا ایئر طیارہ حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔

(روزنامہ ایکسپریس لاہور، ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء، بمطابق ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ)

روزنامہ نئی بات کراچی:

بھوجا ایئر لائن کے طیارہ حادثے میں کراچی کی معروف دینی درس گاہ جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن بھی جاں بحق ہو گئے۔

(روزنامہ نئی بات کراچی، ۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء، بمطابق ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ)

ہفت روزہ القلم پشاور:

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن اسلامی دنیا کی عظیم درس گاہ ہے اور اس درس گاہ علم کے جبال علم اساتذہ اور دینی قائدین کوشہادت کا عظیم رتبہ نصیب ہو چکا ہے، حالیہ بھوجا ایئر لائن کے حادثہ میں اسی جامعہ کے استاذ اور ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن صاحب بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، مولانا شہیدؒ کی ۱۹۶۰ء میں صوبہ خیبر پختونخوا کے مشہور شہر مردان کے گاؤں بابوزئی میں اسکول ہیڈ ماسٹر، مذہبی شخصیت جناب مشفق الرحمن کے ہاں ولادت ہوئی، مولانا کے دادا محترم ہندوستان سے فاضل، جید عالم دین اور علاقے کی معروف شخصیت تھے، ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کرنے کے بعد متوسطات اور اعلیٰ تعلیم کے تمام مراحل مکمل کر کے بطور استاذ اُن کا تقرر جامعہ میں ہوا جو اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں اور علمی استعداد کا بھرپور اعتراف تھا، آپ وفاق المدارس العربیہ کی نصاب کمیٹی کے رکن بھی تھے، جامعہ میں تدریس کے ساتھ ساتھ جامع مسجد صالح صدر کراچی میں عرصہ سے امامت و خطابت کے فرائض نبھاتے رہے، مولانا مرحوم کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ ہے جو اندرون و بیرون ملک تک پھیلا ہوا ہے، مولانا مرحوم کی نماز جنازہ اسلام آباد میں قائد جمعیت مولانا فضل الرحمن اور آبائی گاؤں میں مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ نے پڑھائی ہر دو مقام پر کثیر تعداد میں اہل مدارس اور عوام الناس نے شرکت کی اور مولانا کو آبائی گاؤں میں ہی دفن دیا گیا۔

(ہفت روزہ القلم پشاور ۱۲ اپریل ۲۰۱۲ء، بمطابق ۲ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ تا ۱۱ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ)

ہفت روزہ الایثار کراچی:

اہل سنت والجماعت کے رہنماؤں مولانا محمد احمد لدھیانوی، ڈاکٹر خادم حسین ڈھلوں، مولانا مسعود الرحمن عثمانی، مولانا اورنگزیب فاروقی اور ملک محمد اسحاق سمیت دیگر نے بھوجا ایئر لائن کے طیارہ حادثے میں کراچی کی معروف دینی درس گاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کے استاذ الحدیث و ناظم تعلیمات اور وفاق کی امتحان و نصاب کمیٹی کے رکن اور جامع مسجد صالح جہانگیر پارک صدر کراچی کے امام و خطیب حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ، اُن کی ہمشیرہ اور اُن کے شاگرد و معاون خاص اور خادم حضرت مولانا محمد عرفان حمید مینؒ کی المناک شہادت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے

ملک و قوم کے لیے عظیم سانحہ قرار دیا ہے انہوں نے حادثے کا شکار ہونے والے تمام افراد کی بخشش و مغفرت اور بلندی درجات کے لیے دعاء کی ہے۔
(ہفت روزہ الایثار کراچی، جمعہ، ۱۹ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ، بمطابق ۱۱ مئی ۲۰۱۲ء، جلد ۲، شمارہ ۳۳)

ماہنامہ الفاروق کراچی:

۲۸ جمادی الاولیٰ کو شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان زید مجدہم جامعہ بنوری ٹاؤن تشریف لے گئے اور ارباب جامعہ سے جامعہ کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب قدس اللہ سرہ کی شہادت پر تعزیت اور اُن کے لیے دعائے مغفرت کی اس موقع پر حضرت کے ساتھ مولانا محمد انور صاحب، مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا عمار خالد صاحب بھی موجود تھے یاد رہے کہ حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب ۲۷ جمادی الاولیٰ بروز جمعہ بھوجا ایئر لائن کے افسوس ناک حادثے میں شہید ہو گئے تھے اس حادثے کا شکار ہونے والے ۱۲ افراد میں حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب اُن کی ہمشیرہ اور معاون خاص مولانا عرفان مین بھی شامل تھے۔ ۵۳ سالہ حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب کا آبائی علاقہ مردان تھا دارالعلوم شیرگڑھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی بقیہ تعلیم جامعہ بنوری ٹاؤن میں مکمل کی فراغت اور تخصص کے بعد جامعہ ہی میں تدریس شروع کی اور گزشتہ ۱۰ سال سے ناظم تعلیمات کے عہدے پر بھی فائز رہے اس کے علاوہ صدر کی جامع مسجد صالح جہانگیر پارک میں مولانا امام و خطیب بھی تھے اور وفاق المدارس کی نصاب کمیٹی کے رکن بھی تھے اللہ پاک حضرت مولانا سمیت تمام مرحومین کی مغفرت کاملہ فرمائے، آمین۔

(ماہنامہ الفاروق کراچی، رجب المرجب ۱۴۳۳ھ، بمطابق جون ۲۰۱۲ء، جلد ۲۸، شمارہ ۷)

ماہنامہ الاحسن کراچی:

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات اور استاذ الحدیث حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمہ اللہ اور اُن کے ہمراہ مولانا محمد عرفان مین ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں شہادت پا کر خالق حقیقی سے جا ملے۔
جیسے ہی خبر حضرت الشیخ مولانا محمد زرولی خان مدظلہ کو پہنچی تو وہ بہت زیادہ غمگین ہوئے کیونکہ حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ حضرت الشیخ کا خاص تعلق اور محبت تھی اور مولانا مرحوم اکثر ملاقات کے لیے احسن العلوم قدم رنجہ فرماتے تھے اسی طرح صوبہ خیبر پختونخوا کے سفر پر کئی بار اُن کے آبائی گاؤں اُن کے گھر پر بھی حضرت الشیخ تشریف لے گئے اور اُن کے ساتھ مجلس بہت یادگار رہی اور اُن کی مسجد میں حضرت الشیخ نے خطاب بھی فرمایا خبر سنتے ہی اسی وقت حضرت الشیخ جامعہ بنوری ٹاؤن تشریف لے گئے اور وہاں کے احباب سے تعزیت فرمائی اور اسی رات حضرت مولانا مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے جامعہ کے طلباء اور دیگر احباب سے قرآن کریم کا ختم کروایا اور اُن کے حق میں دعائیں فرمائیں اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور اُن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور اُن کے پس ماندگان کو صبر و اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ الاحسن کراچی رجب، شعبان ۱۴۳۳ھ)

ماہنامہ وفاق ملتان:

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس شوریٰ کا ایک اہم ترین اجلاس مؤرخہ ۴ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ، بمطابق ۲۶ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعرات صبح دس بجے جامعہ خیر المدارس ملتان میں منعقد ہوا اجلاس میں مسئولین امتحانات خصوصی دعوت پر شریک ہوئے، اجلاس کی صدارت شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے فرمائی، نظامت کے فرائض ناظم اعلیٰ وفاق حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب مدظلہم نے سرانجام دیئے اجلاس کا آغاز حضرت قاری محمود احمد صاحب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا تلاوت کلام پاک کے بعد حال ہی میں بھوجا ایئر لائن کے طیارہ حادثہ میں شہید ہونے والے تمام مسافروں بالخصوص جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ناظم تعلیمات اور وفاق کی امتحان و نصاب کمیٹی کے رکن حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اور مولانا مفتی محمد عرفان شہیدؒ کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور ورثاء سے اظہار تعزیت کیا گیا نیز مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی وفاق کے لیے بے لوث خدمات پر انہیں خراج تحسین بھی پیش کیا گیا۔

(ماہنامہ وفاق ملتان رجب المرجب ۱۴۳۳ھ، بمطابق جون ۲۰۱۲ء، جلد ۹، شمارہ ۷)

ماہنامہ العصر پشاور:

۲۰ اپریل کا سورج ایک ناقابل فراموش واقعہ کو دیکھ کر غروب ہوا چھ بج کر چالیس منٹ پر جب بھوجا ایئر لائنز کا طیارہ چکلا لہ ایئر پورٹ کے قریب حادثے کا شکار ہوا تو اس واقعہ نے جہاں پوری قوم کو غمزدہ و افسردہ کیا وہاں اہل علم کو بھی ایک متحرک، فعال، اور جید عالم دین کی داغ برفت دے گیا۔

حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے استاذ حدیث، ناظم تعلیمات اور روح رواں تھے رسول

سے اس عظیم ادارہ کی خدمت پوری تندہی، اخلاص، مہارت اور تجربہ کاری سے سرانجام دے رہے تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جام شہادت نوش فرمانا نصیب کیا تھا چنانچہ طیارے کے اس حادثے میں آپ بھی اپنی ہمشیرہ کے ساتھ شہید ہوئے اسلام آباد میں جنازہ کے بعد آپ کے جسدِ خاکی کو آپ کے آبائی گاؤں بابوزئی کا ٹلنگ مردان لے جایا گیا جہاں دوبارہ آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی نماز جنازہ میں جامعہ عثمانیہ پشاور کے استاذِ حدیث حضرت مولانا مفتی ذاکر حسن نعمانی صاحب، حضرت مولانا مفتی نجم الرحمن صاحب، حضرت مولانا مفتی تحمید اللہ جان صاحب اور مولانا محمود رشید صاحب نے شرکت کی جب کہ حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم (مفتی غلام الرحمن صاحب) نوشہرہ میں ایک دینی مدرسہ کے سالانہ پروگرام میں پہلے سے دیے گئے وقت کی وجہ سے مشغول ہو کر جنازہ میں حاضر نہ ہو سکے البتہ دوسرے دن تعزیت کے لیے آپ اور ناظم تعلیمات حضرت مولانا حسین احمد صاحب دامت برکاتہم مرحوم کے گاؤں بابوزئی تشریف لے گئے ادارہ العصر آپ کے رفع درجات کے لیے بارگاہِ الہی میں دست بدعاء ہے اور پس ماندگان و جامعہ بنوری ٹاؤن کے ساتھ غم میں برابر کا شریک ہے۔

(ماہنامہ العصر پشاور، جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ بمطابق مئی ۲۰۱۲ء، جلد ۱۷، شمارہ ۵)

ماہنامہ السعید اویگی:

پاکستانی قوم ابھی سیاچن گیارہ سیکٹر میں اپنے ۱۳۹ سپوتوں کے برفانی تودے اور چٹانوں کے کوہِ گراں کے نیچے زندہ درگور ہو کر دب جانے والوں کے غم میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ایک دوسرا الم ناک حادثہ طیارے کی تباہی کی شکل میں نمودار ہو کر ۱۲/۱۲/۱۲ قیچی جانیں آناً فاناً موت کی وادی میں جانے سے اس غزدہ قوم کو مزید رنج و الم میں مبتلا کر گیا قوم کے آنسو سوکھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا۔

ابھی سیاچن کا گھاؤ تازہ تھا کہ طیارہ اسلام آباد میں گر گیا اس افسوس ناک حادثے میں جہاں زندگی کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد جام شہادت سے سرفراز ہوئے وہیں ۶ علماء کرام بھی شہید ہوئے جن میں جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات و مدرس مولانا عطاء الرحمن (بابوزئی کا ٹلنگ مردان) مع اپنی ہمشیرہ اور معاون خاص مولانا عرفان میمن بھی شامل ہیں۔ مولانا عطاء الرحمن جہانگیر پارک صدر کراچی کی جامع مسجد صالح کے امام و خطیب اور وفاق کی امتحان کمیٹی کے رکن بھی تھے بلاشبہ یہ ایک بڑا قومی سانحہ ہے جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ۱۲/۱۲ قیچی شہری شہید ہو گئے اللہ پاک اس حادثے میں شہید ہونے والے جملہ افراد کی مغفرت فرما کر درجاتِ عالیہ سے نوازیں اور تمام پس ماندگان کو اس عظیم سانحہ و غم کو برداشت کرنے کی توفیق مرحمت فرما کر صبر جمیل کی دولت سے مالا مال فرمائیں۔ آمین۔

(ماہنامہ السعید اویگی، جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ، بمطابق مئی ۲۰۱۲ء، جلد ۱۳، شمارہ ۵)

ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی:

۲۰/اپریل بروز جمعۃ المبارک شام غروب آفتاب کے قریب بارانی موسم میں بھوجا فضا سیہ کا طیارہ بوننگ ۷۳۷/اسلام آباد ہوائی اڈہ کے قریب حسین آباد نزد لوئی بھیر کے علاقے میں گر کر تباہ ہو گیا جس میں تقریباً ۱۲/۱۲ افراد جام شہادت نوش کر گئے ان میں فضائی عملہ کے ۹/ارکان کے علاوہ ۵۳/مرد، ۵۸/خواتین اور ۶/بچے شامل تھے۔

اسی فضائی حادثے میں شہید ہونے والوں میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمن رحمہ اللہ، اُن کے تلمیذ و خادم خاص حضرت مولانا محمد عرفان میمنؒ بھی شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و رحمت سے سب مرحومین کی مغفرت فرمائے اور اُن کے جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

نماز جنازہ و تدفین: حضرت مولانا عطاء الرحمن رحمہ اللہ اُن کے تلمیذ عزیز و خادم خاص اور اُن کی ہمشیرہ کی نماز جنازہ بروز ہفتہ صبح فاروق اعظم جامع مسجد اسلام آباد میں قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب نے پڑھائی نماز جنازہ میں ہزاروں علمائے کرام و طلبائے عظام و عامۃ المسلمین شریک تھے دارالعلوم تعلیم القرآن کے مہتمم، جانشین شیخ القرآن جناب صاحبزادہ اشرف علی صاحب بھی اپنے رفقاء و احباب کے ہمراہ شریک جنازہ تھے، اسلام آباد سے تینوں مرحومین کی میتوں کو بابوزئی مردان پہنچایا گیا جہاں مرحوم مولانا عطاء الرحمنؒ کے قائم کردہ جامعہ خلفائے راشدین میں شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ زید مجدہ نے تینوں میتوں کی نماز جنازہ پڑھائی یہاں بھی علماء، طلباء و عامۃ المسلمین ہزاروں کی تعداد میں شریک جنازہ تھے تینوں مرحومین کی تدفین عمل میں لائی گئی۔ اللہم اغفرہم وارحمہم واعف عنہم۔

(ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی، جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ، بمطابق مئی ۲۰۱۲ء، جلد ۵۱، شمارہ ۵)

ماہنامہ صدائے فاروق شجاع آباد:

اسلام آباد میں بھوجا نیر لائن کے جانکاہ طیارہ حادثے میں عورتوں اور بچوں کی ایک کثیر تعداد سمیت ۱۲۷ افراد جاں بحق ہو گئے جاں بحق ہونے والوں میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی کے استاذ الحدیث و ناظم تعلیمات، وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نصاب کمیٹی کے رکن اور جامع مسجد صالح جھانگیر پارک صدر کراچی کے امام و خطیب حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ ان کی ہمیشہ اور ان کے تلمیذ، خادم و معاون خاص مولانا محمد عرفان حمید مبینؒ بھی شامل ہیں ادارہ صدائے فاروقیہ مرحومین کے پس ماندگان سے اظہار تعزیت کے ساتھ قارئین سے ان کے حق میں دعاؤں کا خواستگار ہے۔

(ماہنامہ صدائے فاروقیہ شجاع آباد جمادی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ، بمطابق مئی ۲۰۱۲ء، جلد ۱۳، شمارہ ۶)

عالمگیر خراج عقیدت

ترتیب: محمد زین العابدین



مولانا سلیم اللہ خان:

مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی کی شہادت کے بعد جامعہ بنوری ٹاؤن میں مفتی صاحبؒ کا خلا پر ہونا تو یقیناً مشکل تھا لیکن وہاں مولانا عطاء الرحمن صاحب جیسے لائق و فائق حضرات جب تک موجود تھے فکر کی ضرورت نہیں تھی، مولانا عطاء الرحمن صاحب بخاری ترمذی سمیت درس نظامی کے ہر فن مولیٰ مدرس تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور بنوری ٹاؤن کو یہ صدمہ سہارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا فضل الرحمن:

مولانا عطاء الرحمن کی شہادت پر آج پوری قوم سوگ وار ہے اور پاکستان کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے، ان کی شہادت قومی سانحہ ہے ایسے حادثات بھلائے نہیں جاسکتے، ان کے پس ماندگان کے غم میں پوری قوم برابر کی شریک ہے، ان کی دینی ملی اور قومی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، انہوں نے اپنی زندگی علوم قرآن اور علوم نبوۃ کی اشاعت کے لئے وقف کر رکھی تھی، اللہ تعالیٰ ان کے تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مولانا کے درجات بلند فرمائے۔

مولانا سمیع الحق:

مولانا عطاء الرحمن کی شہادت بہت بڑا سانحہ ہے، ملک بھر کے دینی حلقے اس سانحہ پر رنجیدہ ہیں، میں خود انتہائی مغموم ہوں مولانا کی جس وقت شہادت ہوئی فوراً ہی ہم نے جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ صوبہ خیبر پختونخوا میں ان کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کروائی اور جھنگ و دیگر جگہوں میں دفاع پاکستان کونسل کے اجلاسوں میں ان کی بلندی درجات کے لئے دعائیں کروائیں، ان کے پس ماندگان اور جامعہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ و طلباء سے تعزیت کی، بلکہ میں خود تعزیت کا مستحق ہوں۔

مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ:

مولانا عطاء الرحمن ایک عظیم انسان تھے، ان کی برکات سے تمام مسلمان محروم ہو گئے۔

مولانا محمد اسفندیار خان:

مولانا عطاء الرحمن کی شہادت پوری قوم کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ اور آزمائش کی گھڑی ہے، ان کی شہادت پر جامعہ دارالخیر گلستان جوہر کراچی میں تعزیتی اجلاس ہوا جس میں ان کے ایصال ثواب کے لئے قرآن اور آیت کریمہ کا ختم کیا گیا اور ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کرائی گئیں ہم ان کے لواحقین سے تعزیت کرتے ہیں۔

مولانا محمد مسعود ازہر:

ہم بھوجا نیر لائن کے الم ناک حادثے پر حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (استاذ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن) کے اہل خاندان، تلامذہ و متعلقین سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے دعا گو ہیں، کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور اس حادثے کے تمام مسلمان مرحومین کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مولانا مفتی محمد عثمان یار خان:

مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت پر مجھے دلی افسوس ہے، وہ اس ملک کا ایک قیمتی اثاثہ اور عالم باعمل تھے۔
مولانا محمد یوسف کشمیری:

میرے بڑے بھائی حضرت مولانا محمد یونس کشمیریؒ کی طیارہ حادثہ میں شہادت پر مجھے بے حد افسوس ہے لیکن اس سے کہیں بڑھ کر افسوس مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت کا ہے۔

مولانا ضیاء الحق مردانی (مقیم عالمی تبلیغی مرکز رائے ونڈ):

وہ میرے ساتھی تھے ان سے جب بھی ملاقات کی علمی وقار اور متانت و سنجیدگی کو پایا، اللہ نے جنازہ میں شرکت کی توفیق عطاء فرمائی، ان کی اچانک شہادت بہت بڑا سانحہ ہے مگر اللہ کے حکم کے آگے کسی کی نہیں چلتی اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

جناب الحاج محمد یامین (رکن شوریٰ عالمی تبلیغی جماعت کراچی):

وہ ایک باصلاحیت عالم دین تھے ان کو متعدد مرتبہ میں نے اپنے ادارہ جامعہ عثمانیہ بہادر آباد کی تقریبات میں بلایا وہ بلا خوف و خطر حق بات کہا کرتے تھے۔

مولانا رب نواز حنفی، ڈاکٹر محمد فیاض:

مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی علمی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ان کی شہادت پر ہر پاکستانی کا دل غمزہ ہے، وہ ایک علمی شخصیت تھے انہوں نے اپنی پوری زندگی علمی خدمات میں گزاری اور سینکڑوں علماء و طلباء ان سے فیضیاب ہوئے، ان کی شہادت سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کو پر کرنا آسان نہیں۔

مولانا علی سید (رئیس و شیخ الحدیث جامعہ عمر مکہ مسجد):

جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمنؒ کا سانحہ ارتحال امت مسلمہ کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مولانا قاری خیر الحق ابرار (رئیس جامعہ انوار القرآن صدیقیہ):

جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمنؒ اور ان کے معاون خاص مولانا عرفان میمن کا حادثہ پوری ملت کے لیے جانکاہ ہے۔

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت برطانیہ و جمعیت علمائے برطانیہ:

جمعیت علمائے برطانیہ کے قائدین، مولانا عبدالرشید ربانی، مفتی محمد اسلم، مولانا اسلم زاہد، مولانا امداد اللہ القاسمی، مولانا محمد حسین، مولانا اسلام علی شاہ، مولانا رشید راجا، مولانا خالد محمود، مولانا عبدالرشید رحمانی، مفتی عبدالقادر، مفتی طارق علی شاہ، مفتی حسین احمد، مفتی محمد عثمان، مولانا ابراہیم، مولانا خورشید، مولانا عزیز الحق، مولانا نصیب الرحمن، مولانا حافظ اکرام الحق ربانی، مفتی عاصم علی شاہ، مولانا شاہ رفیع الدین، قاری محمد اسماعیل، حافظ محمد اکرام، قاری ممتاز، قاری حفیظ الرحمن، حافظ محمد انور، قاری غلام نبی، قاری محمد نیاز، قاری حضرت علی، قاری انعام الحق، چودھری بابو مشتاق، فیض الحسن، رفیق احمد شاہ، ختم نبوت کے مولانا حافظ نگین، مفتی محمود الحسن اور طحہ قریشی و دیگر نے کہا کہ جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمنؒ اور ان کی ہمیشہ کی شہادت جامعہ اور ان کے شاگردوں کے لیے بڑا حادثہ اور المناک خبر ہے اللہ تعالیٰ تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مولانا کی مغفرت فرمائے۔

علماء رابطہ کونسل برطانیہ و انٹرنیشنل ختم نبوت اکیڈمی لندن:

انٹرنیشنل ختم نبوت اکیڈمی لندن کے امیر مرکزیہ عبدالرحمنؒ باوا، نائب امیر مرکزیہ مولانا سہیل باوا، علماء رابطہ کونسل برطانیہ کے رہنماؤں مفتی عبد الوہاب، مفتی تقی، مفتی عبدالمنعم، مفتی یوسف، علامہ فرحان صدیقی، مولانا عیسیٰ منصوری، مولانا گل محمد، مولانا بلال پٹیل، مولانا مسعود پٹیل، مولانا ہارون پٹیل، مولانا فرید پٹیل، مولانا محمد یوسف کوٹھی، مولانا رضاء الحق، مولانا محمد تھاوا، مولانا نیچی، مولانا عبدالوہاب، مولانا سیف اللہ، مولانا محمد عرباض، مولانا فضل الاسلام، حافظ سفیان، حاجی رفیق اور دیگر نے کہا کہ جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمنؒ کی شہادت قومی سانحہ ہے، ان کے پس ماندگان تنہا نہیں ۱۸ کروڑ عوام ان کے غم میں برابر کی شریک ہے، ہم نے ان کے ایصال ثواب کے لیے انٹرنیشنل سیکریٹریٹ ختم نبوت اکیڈمی لندن میں تعزیتی مجلس و دعاء کا اہتمام کیا اللہ تعالیٰ مولانا عطاء الرحمنؒ کی مغفرت فرما کر ان کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جمعیت علمائے اسلام کراچی:

جمعیت علمائے اسلام علاقہ ساٹ ٹاؤن کے امیر مولانا عبدالرحمنؒ، کورنگی ٹاؤن، بلال کالونی اور گلشن غازی کے رہنماؤں علامہ نیاز حیدری، مولانا علی

الرحمن، مولانا اختر، قاری ظہیر مسرور، قاری زاہد احمد، قاری بشیر شاہوانی، امین بنگش، لیاری ٹاؤن کے امیر مولانا سید حسین احمد، ناظم عمومی مولانا عبد اللہ، مفتی بشیر احمد، مولانا محمد اشرف مینگل، مولانا نور الحق، مولانا عبد الحلق، مولانا عزیز اللہ، حافظ در محمد بلوچ، عثمان غنی پراچہ، عبد الرؤوف خاران، سالار خاستہ گل ودیگر نے کہا کہ مولانا عطاء الرحمن کی شہادت پر ہمیں بے حد افسوس ہے ہم ان کے لواحقین سے تعزیت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ دین اسلام کے لیے ان کی خدمات قبول فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطاء فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔

مدرسہ امام ابو یوسف شادمان ٹاؤن نارتھ کراچی:

ناظم مدرسہ مولانا محمد اشفاق جلاپوری، مولانا منور حسین، مولانا سید محمد عرفان رفیق، مولانا محمد طیب امین، مولانا مفتاح الدین، مولانا محمد انس، مولانا محمد عماد رشید، مولانا رفیع الدین شامزئی، مولانا محمد یونس، مولانا صابر حسین، قاری فضل الرؤوف، قاری اکرام الدین اور قاری محمد ہاشم نے کہا کہ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی موت قابل رشک موت ہے اللہ نے ان کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا، ان کے سانحہ شہادت سے پچھلے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔

جامعہ دارالعلوم رحمانیہ بفرزون:

رئیس الجامعہ مولانا عبید الرحمن رحمانی، شیخ الحدیث مولانا محبوب شاہ، استاذ الحدیث مولانا عبد المجید مسلم یار، استاذ الحدیث مولانا محمد زبیر، مولانا فضل ربانی، مفتی طفیل احمد ہزاروی، قاری خلیل الرحمن رحمانی ودیگر نے کہا کہ جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے سانحہ ارتحال پر ہمیں بہت غم و دکھ ہے، مولانا عطاء الرحمن مرحوم جامعہ بنوری ٹاؤن کا قیمتی سرمایہ اور باعث صدا افتخار شخصیت تھے۔ جامعہ دارالعلوم رحمانیہ بفرزون پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے، ان کی شہادت پر جامعہ میں تعزیتی اجلاس ہوا جس میں ان کو ان کی دینی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا گیا۔

دارالعلوم ضیاء الاسلام:

دارالعلوم کے اساتذہ کرام مولانا شاہنواز، قاری ایاز، قاری عبد المنان ودیگر نے کہا کہ جامعہ بنوری ٹاؤن کے ناظم مولانا عطاء الرحمن کی شہادت قومی سانحہ ہے، ہم لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرما کر ان کے درجات بلند فرمائے۔



وہ جن کے دم سے جنس وفا تھی گراں بہا

وہ لوگ بزم دہر سے نایاب ہو گئے

شہید راہ وفا

حضرت مولانا مفتی عرفان حمید میمن شہیدؒ

مولانا مفتی عرفان حمید میمن شہیدؒ، حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتے تھے، وہ مخلص با وفار رفیق کار اور جاں نثار شاگرد تھے، جنہوں نے ہر قدم اور ہر گام پر حضرت شہیدؒ کا ساتھ دیا، اور زندگی کے اکثر اسفار میں ساتھ دینے والے اس با وفار رفیق نے سفر شہادت میں بھی حضرت شہیدؒ کا ساتھ نہیں چھوڑا، چنانچہ آخری منزل میں بھی یہ دونوں ساتھ ہی پہنچے، آئندہ صفحات میں ان پر لکھے گئے دو مضامین اور ایک نظم کو پیش کیا جا رہا ہے۔

مولانا مفتی عرفان حمید میمن شہیدؒ ۱۵ اگست ۱۹۸۱ء بمطابق ۱۴۰۱ھ میں کراچی میں جناب عبد الحمید میمنؒ کے گھر پیدا ہوئے۔ حفظ قرآن اقرآء سے مکمل کرنے کے بعد جامعہ بنوری ٹاؤن سے سند فراغت حاصل کی، اور شہادت تک فانی زندگی کے بقیہ ایام حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کی صحبت و رفاقت میں گزار دیئے، ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ بمطابق ۲۰/۱۲ اپریل ۲۰۱۲ء کو شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ جامعہ خلفائے راشدین بابوزئی مردان کے احاطے میں حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے پہلو میں مدفون ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را



مجسم وفا مولانا مفتی عرفان حمید شہیدؒ



مولانا سہیل یوسف میمن

فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن

زندگی اور موت کا فلسفہ بھی کتنا عجیب ہے، ہنستی محفلوں کو اجاڑتا اور کھلی بہاروں کو خزاؤں میں بدل دیتا ہے، ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء کو ہونے والے طیارہ کے حادثے کی خبر کو لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں نے معمول کی ایک حادثاتی خبر کی طرح سنا ہوگا، درد دل رکھنے والوں نے دعائے مغفرت پر ہی اکتفاء کر لیا ہوگا، لیکن اس دن مجھ پر کیا گزری یہ میں ہی جانتا ہوں اور میرا رب۔

میرے شیخ و مربی اور محسن حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمہ اللہ اپنی ہمیشہ اور با وفاء شاگرد مفتی عرفان حمید رحمہ اللہ کے ساتھ راہی ملک عدم ہوئے، اور تاقیامت اپنی حسین یادیں دل میں چھوڑ گئے، حضرت شیخ رحمہ اللہ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور ان شاء اللہ لکھا جاتا رہے گا ان کی یاد کے ساتھ ان کے اس رفیق دنیوی و اخروی کا ذکر بھی ہوتا رہے گا۔

میرے مخلص دوست مولانا مفتی عرفان حمید رحمہ اللہ نے ۱۵/ اگست ۱۹۸۱ء کو اسی شہر کراچی میں آنکھ کھولی اور اقراء میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ فتحیہ گارڈن میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی پھر اسی میں درجہ اولیٰ سے درس نظامی کا آغاز کیا، ۱۹۹۵ء میں جامعہ بنوری ٹاؤن میں درجہ ثانیہ میں داخلہ لیا اور ۲۰۰۱ء میں جامعہ سے ہی درس نظامی کی تکمیل کے بعد درجہ تخصص فی الفقہ الاسلامی میں داخلہ لے لیا، ۲۰۰۳ء میں تخصص سے فراغت ہوئی، تخصص کے بعد ایک سال تک تو کچھ دنیوی مشاغل میں وقت گزارا لیکن پھر ۲۰۰۵ء میں حضرت مولانا ارشاد اللہ عباسی شہید رحمہ اللہ کے زیر اہتمام ”جامعۃ الحراء للبنین والبنات گارڈن“ میں تدریسی سلسلے سے وابستہ ہو گئے اور تاحیات اس ادارے سے وابستہ رہے، اس دوران میٹرک اور انٹر کے امتحانات بھی دیئے اور اپنی صلاحیتوں کی بناء پر کم عمری میں درس نظامی کی بڑی کتابیں پڑھانے لگے، ہدایہ اور ترمذی شریف جیسی اہم کتابیں مولانا عباسی شہید رحمہ اللہ کی زندگی میں پڑھاتے تھے ۲۰۱۱ء میں مولانا کی شہادت کے بعد صحیح بخاری شریف پڑھانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔ بلاشبہ مولانا عباسی شہید رحمہ اللہ کا سانحہ مذکورہ مدرسہ کی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ تھا جس سے جامعہ بنوری ٹاؤن کی طرح اس مدرسہ میں بھی بہت بڑا خلا پیدا ہوا لیکن مولانا عرفان شہید رحمہ اللہ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے مدرسہ کا انتظام بحسن و خوبی سنبھالا۔

جامع مسجد صالح صدر میں ہونے والے تعلیم و تربیت ”چالیس روزہ دینی و اخلاقی تربیتی کورس“ کا آغاز تو ۱۹۹۸ء سے ہو چکا تھا، لیکن اس کا باقاعدہ کوئی نصاب کتابی صورت میں مرتب نہ تھا بلکہ اساتذہ خود ہی حضرت استاد جی رحمہ اللہ کی رہنمائی میں اسباق مرتب کر کے ان کو فوٹو کاپی کروا کر طلبہ میں تقسیم کر دیتے تھے، ۲۰۰۶ء میں حضرت استاد جی رحمہ اللہ نے بندہ سے کہا کہ تم عرفان صاحب سے معلوم کرو اگر وہ کورس میں پڑھانے کی خواہش رکھتے ہوں تو کہہ دو میں خود اس لیے نہیں کہتا کہ وہ بادل ناخواستہ بھی حکم سمجھ کر مجبور ہوگا، یہ حضرت استاد جی رحمہ اللہ کا ایک منفرد انداز تھا جس کے ذریعے وہ ہر ایک کی دلی خواہش کا پاس رکھ کر اس کے مطابق کام لیا کرتے تھے بندہ نے مفتی عرفان حمید رحمہ اللہ سے بات کی تو وہ فوراً تیار ہو گئے پھر وہ آئے کیا! چھانگئے سب سے پہلے انہوں نے کورس کے اسباق کمپوز کیے پھر کتابی صورت میں لانے میں وہ پیش پیش رہے ہر سال جامع مسجد صالح صدر کے ساتھ جامعہ میں بھی کورس کی تدریسی خدمت سرانجام دیتے رہے، شہادت سے قبل آخری دنوں میں بھی اس سلسلے کی ایک ابتدائی کتاب کا مسودہ (جواب تک فوٹو کاپی ہی کی صورت میں ہے) تکمیل کے آخری مراحل میں تھا اور حضرت استاد جی سفر پر روانگی کے وقت آخری بار نظر ڈالنے کے لیے ساتھ لے کر گئے تھے لیکن:

ما کل ما یتمنی المرأ یدرکہ تجری الریاح بما لا تشتہی بہ السفن

میرے محسن اور دوست بہت سی خوبیوں کے حامل انسان تھے کم عمری میں اپنی صلاحیتوں اور بہترین اخلاق کی بناء پر اپنے اساتذہ، خاندان، متعلقین اور شاگردوں میں مقبول تھے خاندان کے بڑے بھی اہم امور میں اُن سے مشورہ لیتے تھے اور وہ بھی ہر ایک کے ساتھ اس کے مرتبے کے موافق پیش آتے، ہر ایک کے کام آنا اور اس کی ضرورت پوری کرنے میں اپنا وقت صرف کرنا ان کا ایک خصوصی وصف تھا، چھوٹا بڑا کوئی بھی کسی کام کا کہہ دیتا تو وہ اس کو پورا کرنے میں جُت جاتے اور معمولی کام کو بھی اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ صلاحیتیں دے رکھی تھیں، جو اپنے اساتذہ کی مسلسل صحبت سے ان میں منتقل ہوئی تھیں، معاملات میں بے حد صاف تھے جو زندگی کا ایک مشکل کام ہوتا ہے، میں مولانا کو اس سلسلے میں اتنا ذمہ دار شخص نہیں سمجھتا تھا اُن کی شہادت کے بعد جب اُن کی ذاتی ڈائری دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کرتے تھے، چنانچہ ان کا تمام حساب کتاب مکمل طور پر اس ڈائری میں محفوظ تھا میں ان کی اس صفائی معاملات پر حیران بھی ہوں اور اپنی بدگمانی پر شرم سار بھی۔

قدرت نے انہیں باذوق بنایا تھا، زندگی کے ہر پہلو میں اس کا ظہور ہوتا تھا، رہن، سہن، لباس و پوشاک بلکہ ہر چیز میں وہ ذوق رکھتے تھے اور ہم جیسے بے ذوقوں کو اس طرف متوجہ کرتے رہتے تھے، نیز حضرت استاد جی رحمہ اللہ کے ساتھ بھی ان کا انتہائی اور بے تکلف تعلق تھا وہ استاد جی پر جان چھڑکتے تھے تو استاذ محترم بھی ان کو اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے، اپنے والد صاحب کے انتقال کے بعد تو حضرت استاد جی ہی ان کا سب کچھ تھے ہر ہر مرحلے پر وہ

انہیں سے پوچھ پوچھ کر قدم اٹھاتے تھے، حضرت استاد جی رحمہ اللہ کو خدا تعالیٰ نے جو رعب و وجاہت عطا فرمایا تھا اس کی بنا پر ہم جیسوں کو باوجود قرب و تعلق کے ان کے سامنے ہر بات کرنے کی جرأت اور ہمت نہیں ہوتی تھی، ایسے میں مولانا عرفان شہیدؒ جیسا مزاج شناس ہی تھا جو ہمارے کام آتا اور استاد جی سے بات کر کے ہمارا مسئلہ حل کرتا تھا، نہ وہ ہستیاں رہیں اور نہ ان کے ساتھ بیٹے لمحے، بس ان کی یادیں اور باتیں ہی ہماری متاعِ گراں مایہ ہیں۔

مولانا عرفان شہید رحمہ اللہ کا نکاح ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہید رحمہ اللہ نے پڑھایا، اللہ نے انہیں دو پیارے سے بچوں اور ایک بچی سے نوازا تھا بچی اس وقت چار ماہ کی ہے، ایک بچہ پیدائشی نابینا ہے اور نمائش چورنگی پر واقع بصارت سے محروم بچوں کے ایک اسکول میں زیرِ تعلیم ہے، اللہ تعالیٰ ان بچوں کی کفالت اور ان کی تربیت فرمائے، آمین۔

ان کے والد کا تو انتقال ہو چکا تھا، البتہ والدہ حیات ہیں، بڑھاپے کی اس عمر میں جواں سالہ بیٹے کی شہادت کا صدمہ جس طرح انہوں نے برداشت کیا یہ انہیں کا حوصلہ ہے اور اہلیہ کا صبر و ہمت بھی قابلِ صد ستائش ہے، مولانا کے دو بھائی ہیں، ایک ان سے بڑا اور ایک ان سے چھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کا حامی و ناصر ہو، آمین۔

۲۰/۱۲/۲۰۱۲ء بمطابق ۲۷/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ کو وہ ہم سے کراچی ایئر پورٹ پر رخصت ہو کر اسلام آباد اور وہاں سے مردان کے لیے روانہ ہوئے تھے لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ اب دوبارہ اس فانی دنیا میں ہماری ملاقات نہیں ہوگی، روانگی سے دو دن قبل ہی مجھے علم ہوا کہ وہ استاد جی رحمہ اللہ کے ساتھ سفر پر جا رہے ہیں میں نے کہا مجھے بھی بتلادیا ہوتا تو میں بھی ساتھ چلا جاتا تو وہ کہنے لگے کہ تم بھی چلو بھوجا کا ٹکٹ تول ہی جائے گا، لیکن پھر میرا نظم نہ بن سکا، کاش کہ میں بھی ان کے ساتھ ہی روانہ ہو جاتا لیکن جدائی کا یہ صدمہ میرے نصیب میں لکھا جا چکا تھا اور قدرت خداوندی نے مجھ ناتواں سے ایک اور امتحان لینا منظور کر لیا تھا۔

مفتی عرفان شہیدؒ کی نماز جنازہ حضرت مولانا سید سلیمان بنوری صاحب (نائب مہتمم علامہ بنوری ٹاؤن) نے پڑھائی اور دنیا کی طرح استاد جی کے پہلو میں سپردِ خاک کیے گئے۔

فانا راض بقدر اللہ وقضاء

اب اللہ ہی ہماری دستگیری فرمائے اور ہمیں صبر دے، استاد جی رحمہ اللہ اور مولانا عرفان شہید رحمہ اللہ اور تمام شہداء کی قبور کو باغِ جنت بنائے اور ہمیں بھی ان کے مشن کی تکمیل کا حصہ بنا کر جنت میں اکٹھا فرمائیں، آمین۔

(ماہنامہ بینات مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نمبر)



مولانا مفتی عرفان حمید میمن شہیدؒ

محمد زین العابدین



۲۶/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰/اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعہ شام کے وقت تقریباً چھ بج کر چالیس منٹ پر امام المجاہدین حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر نظام الدین شامزئی شہیدؒ، کے شاگردِ رشید، حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے معاون خاص، جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے فاضل و متخصص، جامعۃ الحراء للبنات گارڈن کے شیخ الحدیث، فاضل نوجوان اور باکمال انسان مولانا مفتی عرفان حمید میمنؒ طیارہ حادثے میں حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے ہمراہ شہید ہو گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون، ان للہ ما أخذ ولہ ما أعطی وکل شئی عندہ بأجل مسمی۔

بلاشبہ موت و حیات اس عالم کون و فساد کا خاصہ ہے یہاں جو آیا وہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ جانے کے لیے ہی آیا، آنا اور جانا سنت بنی آدم ہے اور ”کل نفس ذائقة الموت“ حق تعالیٰ کا نکتہ بنی امر ہے، اس سے کسی کو مفر نہیں، یہاں صبر و ضبط، تسلیم و انقیاد اور رضاء بالقضاء کے بغیر چارہ کار نہیں اور موت کوئی اچھا چیز نہیں کہ اس پر حیرت و تعجب کا اظہار کیا جائے، موت کے قانون سے نہ کوئی نبی مستثنیٰ ہے، نہ ولی، نہ عالم، نہ جاہل، نہ نیک، نہ بد، نہ مؤمن، نہ کافر، نہ شاہ، نہ گدا، اپنے اپنے وقت پر سب ہی گئے اور سب ہی کو جانا ہے، مگر بعض جانے والوں کے جانے اور جدائی کا ایسا صدمہ ہوتا ہے کہ پس ماندگان کی دنیا اندھیر ہو جاتی ہے، کچھ یہی حالت ہماری بھی اس وقت ہوئی کہ جب برادرِ مولوی وسیم نے حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ اور مولانا مفتی عرفان حمید میمنؒ کی وفات حسرتِ آیات کی خبر وحشت اثر سنائی تو دل و دماغ یک دم حیران و پریشان ہو گیا اور آنکھوں کے گرد اندھیرا اچھانے لگا، کلیجہ منہ کو آنے لگا، ذہن

مولانا مفتی عرفان حمید مبین شہیدؒ ۱۵ اگست ۱۹۸۱ء بمطابق ۱۴۰۱ھ کراچی میں جناب عبدالحمید مبینؒ کے گھر میں پیدا ہوئے، اقراء ووضۃ الاطفال میں ابتدائی تعلیم حاصل کی بعد ازاں مدرسہ فتحیہ گارڈن میں داخلہ لے کر حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی، درجہ اولیٰ بھی وہیں پڑھا ۱۹۹۵ء میں درجہ ثانیہ میں جامعہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا اور ۲۰۰۰ء میں دورہ سے فراغت حاصل کی۔

آپ کے اساتذہ حدیث میں امام المجاہدین حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ، حضرت مولانا محمد سوائیؒ، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، حضرت مولانا مفتی محمد عبدالسلام چانگامی، حضرت مولانا محمد انور بدخشان اور حضرت مولانا محمد زبیر منجور دامت برکاتہم شامل ہیں۔ جب کہ دیگر اساتذہ میں مولانا عبدالقیوم چترائیؒ، مفتی محمد عبدالجید دین پوری، مولانا قاری مفتاح اللہ، مولانا فضل محمد یوسف زئی، مفتی عبدالرؤف خان غزنوی، مولانا امداد اللہ مدظلہم اور مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ شامل ہیں۔

بعد ازاں جامعہ ہی میں تخصص فی الفقہ میں داخلہ لیا اور امام المجاہدین حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد عبدالسلام چانگامی صاحب دامت برکاتہم کی زیر نگرانی تخصص کی تکمیل کی، اور ۲۰۰۳ء میں فارغ ہوئے۔

تخصص سے فراغت کے موقع پر ختم بخاری کی تقریب میں آپ کا نکاح ہوا جو کہ حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ نے پڑھایا بعد ازاں آپ نے میٹرک اور انٹر کے امتحانات پاس کیے اور اسی دوران حضرت مولانا ارشاد اللہ عباسی شہیدؒ کا قائم کردہ ادارہ جامعۃ الحراء للبنات میں درس نظامی کی کتابیں پڑھاتے رہے جب کہ مولانا عباسی شہیدؒ کی شہادت کے بعد آپ جامعۃ الحراء کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہو گئے تھے اور بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے آپ زمانہ طالب علمی سے ہی اپنے محبوب استاذ حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے دامن سے وابستہ ہو گئے تھے اور سفر و حضر میں ہر موقع پر آپ حضرت شہیدؒ کے ساتھ ہوتے دونوں کی خوب جوڑی بنی، دونوں بہادر، دونوں زبردست عالم دین، دونوں حق گو، دونوں دل کے بادشاہ اور آنکھ کے غنی، دونوں اسلام کی سربلندی کے لیے سربکف، اب حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ جہاں مفتی عرفان حمید مبین شہیدؒ وہاں، مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نے جہاز سے مردان جانے کا ارادہ کیا تو مفتی عرفان حمید مبین شہیدؒ بھی ساتھ ہیں جہاز کا حادثہ ہوا حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ سفر آخرت پر روانہ ہوئے تو مفتی عرفان حمید مبین شہیدؒ بھی ساتھ ہی چل دیئے۔

مفتی صاحبؒ نے پس ماندگان میں دو بیٹے، ایک بیٹی، اہلیہ، والدہ محترمہ اور دو بھائی سوگ وار چھوڑے ہیں۔ آپ کی نماز جنازہ جامعہ خلفائے راشدین مردان میں صاحبزادہ حضرت مولانا سید سلیمان بنوری صاحب دامت برکاتہم نے پڑھائی بعد ازاں حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کے پہلو میں جامعہ خلفائے راشدین میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔



وفادار طالب علم

مولانا مفتی محمد خالد عباسی

نائب مہتمم مدرسہ عربیہ شہزادہ گارڈن



طالب علم تو بہت ہوتے ہیں لیکن ایسا وفادار طالب علم جو کبھی اپنے استاذ کا دامن نہ چھوڑے ایسے کم ہی ملتے ہیں حضرت استاد جی کو اللہ تعالیٰ نے ایسا با وفا ساتھی اور شاگرد دیا جو بالآخر ہر وقت ساتھ دیتے دیتے حضرتؒ کے ساتھ پہلو میں ابدی نیند سو گیا جب اس با وفا کی یاد آئی تو دل سے آواز آئی:

پل بھر کے لیے بھی نہ جدا ہو سکا تجھ سے کچھ ایسی محبت رہی عرفان کو تجھ سے
جب تو نے کہا آج تو جانا ہے بہت دور حاضر ہے یہ خادم کہا عرفان نے تجھ سے
جب تو نے کہا میں تو چلا غلہ بریں سے آجائے یہ عاجز؟ کہا عرفان نے تجھ سے
اب سوئیں گے ہم جنت باری میں خوشی سے کیا آنے گیا ہوں کہا عرفان نے تجھ سے

جب حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ اور مولانا مفتی عرفان حمید مبین شہیدؒ کے مرقد مبارک کی یادیں دل میں آئیں تو خود بخود یہ کلمات دل سے نکلے:

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے تیری لحد اس لحد پر بھی مہربانی کرے
یہ لحد ہے شیخ کی اور خادم عرفان کی تیری عالی شان ہی اسکی قدردانی کرے



